ناصر زیدی

میری لائبریری

میری لائبریری میں 4.00

مجلد سفید کاغذ 8.00

۱۹۶۸ء

کے

منتخب افسانے

ناصر زیدی

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

میری لائبریری میں پہلی مرتبہ : ۱۹۶۹ء

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر
مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

طابع : پاکستان ٹائمز پریس لاہور

ترتیب

عرضِ ناشر

اردو ادب کی جو خدمت "مکتبہ میری لائبریری" سرانجام دے رہا ہے۔
اس کے تذکرے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ـــــــ علم دوست اور
روشناس حضرات برابر اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

میری لائبریری، نے افسانوی ادب اور خالص ادب کے انتخابات کے جو
سلسلے شروع کئے تھے وہ اگرچہ پوری طرح مکمل نہیں ہو سکے تاہم ان کی قدر و قیمت
اب پوری طرح عیاں ہونے لگی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ملک کے اکثر دوسرے
ناشرین اور مصنفین نے بھی اُسی ڈگر پہ کام کی نقل شروع کر دی ہے اور کسی بھی پیشوائی
کرنے والے کے لئے یہ بات بڑی ہی حوصلہ افزا ہے۔

میری لائبریری کے کارپردازان آپکے لئے وہ سب کچھ کرنے کے لئے کمربستہ ہیں۔
جو علم اور ادب کی شمع کو فروزاں رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

ادارہ آپ کے تعاون کا دل سے شکر گزار ہے۔

۲ر اپریل ۶۹ء
لاہور

آپکا
بشیر احمد چودھری

سیدھی بات

سال بھر کے چُنے ہوئے افسانوں کو کتابی شکل دینے کا رِواج کچھ ایسا نیا نہیں۔ پھر بھی ایسے کسی بھی مجموعے کے مرتّب کو اکثر اس سوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ آخر اس انتخاب کی ضرورت کیا تھی؟ اب اگر اسے محض تجارت کہا جائے تو مرتب اور ناشر دونوں ایسی ادبی بددیانتی کے مجرم قرار دیئے جائیں گے جسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

زندگی ہمیشہ سے رنج و راحت اور اسی قسم کی دوسری کیفیتوں سے عبارت رہی ہے اور رہے گی چنانچہ حیاتِ انسانی کا واضح مطمحِ نظر سکون کی تلاش ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ فنونِ لطیفہ کی طرف توجّہ کا باعث بھی یہی سرگردانی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہانی یا مختصر افسانہ کو اس لحاظ سے فنونِ لطیفہ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسان کی۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کہانی کا آغاز اسی وقت ہوا جب انسان نے اپنے ذاتی تجربات اور واردات کو پہلے پہل لفظوں کا روپ دیا، پھر یہ ذاتی تجربات اور واردات آہستہ آہستہ ذات کے خول سے نکل کر کائنات کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے اور اس طرح کہانی صرف ایک فرد کی نہیں، پورے انسانی معاشرے کی ترجمان بن گئی۔ اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو دراصل ہم سب لوگ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی لمحے میں ایک کہانی لکھتے یا کہتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کہانی کار کے ہاں واقعات اور احساسات کا بہاؤ اپنے اندر ایک تجِیلی چاشنی اور فنّی رچاؤ رکھتا ہے جس کی کارن اس کی ذاتی واردات ایک پورے ماحول اور ایک پورے معاشرے کی واردات بن جاتی ہے۔

کہانی چھپے ہوئے صفحوں پر تکمیل نہیں پاتی بلکہ جب بھی کوئی قاری کوئی کہانی پڑھتا ہے
تو اس کہانی کے رگ و پے میں زندگی کا ایک نیا خون رواں رواں ہو جاتا ہے اس طرح کہانی
ہر سمے تکمیل ہوتی رہتی ہے اور تکمیل کا یہ عمل کئی زمانوں پر محیط ہو جاتا ہے لہذا ۱۹۶۸ء کے
افسانوں کا انتخاب پیش کرتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنے
زمانے کے ذہنی میلانات و رجحانات کی مختصر تاریخ مرتب کر دی گئی ہے تو مبالغہ ہوگا۔

میں نے پاک و ہند کے ان پندرہ افسانوں کے انتخاب کے سلسلے میں کسی تعصب کے
بغیر اور پوری دیانتداری سے گزشتہ برس کے تقریباً تمام ممکن الحصول ادبی و نیم ادبی
رسائل کی چھان پھٹک کی ہے چنانچہ جہاں آپ ان میں کئی ایسے افسانہ نگاروں سے
ملیں گے جو ادب میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں وہاں چند ایک ایسے کہانی کاروں سے
سے بھی متعارف ہوں گے جو ابھی مقام کی تلاش میں ہیں میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ
اس مجموعے میں کوئی ایسا افسانہ شامل نہ ہو جو آپ کے ذوقِ سلیم پر گراں گزرے یا ادبی
معیار سے گرا ہوا ہو۔ پھر بھی کیونکہ یہ میرا انتخاب ہے اس لئے اختلاف کی بہرحال گنجائش ہے۔

آخر میں مجھے اپنی اور مکتبہ میری لائبریری کی طرف سے ان فنکاروں کا شکریہ
ادا کرنا ہے۔ جن کے فن پاروں کی بدولت یہ مجموعہ مرتب ہو سکا۔ اس کے علاوہ میں
اپنے معاصر مدیرانِ جرائد کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جن کے معیاری
ادبی و نیم ادبی رسائل میں سے ان افسانوں کا انتخاب عمل میں آسکا۔

مدیر ماہنامہ "ادبِ لطیف"

(ناصر زیدی)

۱۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

راجندر سنگھ بیدی

مِتھُن[۱]

بازار ہی ملبا ہو گیا تھا اور رہا پھر کاروبار چھوٹا۔۔ معلوم ہوتا تھا پچھم کی طرف جہاں سڑک تھوڑا اُٹھتی، آسمان سے لپٹتی اور آخر ایک دم نیچے گر جاتی ہے، وہیں دنیا کا کنارہ ہے جہاں سے ایک جست کر لیں گے، اس جینے کے ہاتھوں مر لیں گے۔

دن بھر سر دُھننے کے بعد مگن ٹھکلے — کباڑیئے کو دو ہی چیزیں ہاتھ لگی تھیں۔ ایک فلورنٹین اور دوسری جیمنی رائے۔ فلورنٹین کو تو شاید کوئی سر پھرا فلم پروڈیوسر کرائے پر لے بھی جاتا، مگر جیمنی رائے؟ کوئی بات نہیں۔ آج وہ اسے چھپا کر رکھے گا تو کل اس کے پوتے پڑپوتے اس سے کروڑوں کمائیں گے، جیسے آج بھی پچھم میں کسی کے ہاں سے لیونارڈو کے اسکیچ نکل آئیں تو آرٹ کے بازار میں ان کی بولی لاکھوں تک جاتی ہے۔ ان لاکھوں کروڑوں کے خیال ہی سے مگن لال کی آنکھوں میں بجلیاں کوندنے لگیں اور وہ یہ بھول ہی گیا کہ وہ چالیس بیالیس سال کا اور ٹھلاٹ۔ گنجا ہونے کے باوجود کنوارہ ہے، اِس لیے پوتوں پڑپوتوں کی بات ہی نہیں۔ مگن کرتا بھی کیا؟ وہ ایک عام ہندو تھا، اتنے بڑے فلسفے کا مالک ہونے کے باوجود جس کے اندر کا بنیا پن نہیں جاتا۔ وہ باتوں میں مایا اِت آدِ کہہ کر اُسے پرے دھکیل دیتا ہے لیکن بھیتر سے اسے جی جان سے لگاتا ہے۔ دنیا

---

۱ مواصلت

بھر میں پیسے کی اگر کوئی پُوجا کرتا ہے تو ہندو۔ آج بھی اس کے ہاں دیوالی کے روز رات کے نیچے، جیوتی کے ساتھ، دودھ پانی میں نہایا، سیندور میں لگایا ہوا روپیہ ملے گا۔ دسہرے کے دن اس کی گاڑی پہ صد رنگ کے ہار ہوں گے اور سب نر ناری مل کر لکشمی کے مندر کو جائیں گے۔ پُوجا کے لیے، پیسے کے لیے تو وہ یوسف سا برادر، پدمنی ایسی پتنی کو بھی بیچنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اور سامنے تھا سراجا — ایوز بیٹری کا ایجنٹ۔ اس کی دکان تھوڑا پیپل کے گھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی، لجلجے ہندو جس پہ صبح کے وقت آکر پانی میں ملے دُودھ کے لوٹے ڈال جاتے تھے اور دکان اور سڑک کے بیچ کی جگہ کیچ سے اَٹ جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے سراجو کو لجلجے ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا۔ البتہ نہیں کرتے تھے تو وہ غلیے کتے جو دن بھر ٹانگ اٹھا اٹھا کر اس پیڑ پہ پیشاب کرتے رہتے تھے، جس کے بارے میں بھگوان نے کہا تھا — اور درکشوں میں میں پیپل ہوں۔ ضرور وہ پچھلے جنم میں مسلمان ہوں گے جو سینتالیس کے فسادوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔

سراجا ہمیشہ پیپل کی گولریں کھاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجہ بازار کا مندہ ہونا یا بھوک نہ تھی۔ سراجا ہر اس چیز کو کھاتا تھا جو اس کی وصالو پشٹ کو مغلظ کر دے۔ ہاں، مسلمان لِنگ کٹوں کا یہی ہے نا — کھانا، پینا اور بھوگ کرنا۔ وہ دماغی طور پہ کوئی ہو تو کوئی خانہ بدوش ہیں، جو ہندوستان میں رہیں تو پاکستان کی باتیں کریں گے۔ پاکستان میں ہوں گے تو — میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔ انہیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں، مگر ٹکلے نے کئی بار اس بارے میں سوچا بھی — ان کا اللہ خوب عیش کرتا ہے۔ ایک اپنا بھگوان ہے۔ جو نیچے گی بجائے اوپر رِدِّی کے آس پاس ہی منزل ہونا رہتا ہے۔ شاید سراجا جانے بوجھے

بنا ایک تانترک تھا جو بندرِ رکھشا کے لیے گُند ملنی کو جگاتے اور اوپر کا راستہ بناتے تھے، وہ عورت کے اندر اکڑے پڑے رہتے، لیکن کسی طرح اپنے جوہرِ حیات کو نہ جانے دیتے۔ نجات کو اس خود غرضانہ طریقے سے پانے والوں، عورت کو صرف ایک ذریعہ بنانے والوں نے کبھی یہ سوچا کہ اس بیچاری کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ اسے بھوکا، پیاسا، روتا، تڑپتا رکھ کر کیسے مُکتی کو پہنچ سکتا ہے کوئی؟ کس پرماتما کو پاسکتا ہے؟ پھر جو نجات بِندو سے چھٹکارہ پالینے میں ہے۔ پُرش کے لیے استری کے لیے؟ سواتی بوند تو موتی نہیں، نہ سیپی موتی ہے، موتی تو بوند کے گرنے اور سیپی کے اُسے اپنے اندر لے کر مُنہ بند کر لینے میں ہے۔

رات لپک آئی تھی۔ باہر وہ دنیا کا کنارہ اندھیرے کے ساتھ کچھ اور بھی پاس رینگ آیا تھا۔ ریشم والے ولایتی رام، کشمیری بڈشاہ، حتیٰ کہ اڈپی کے چکرپانی کی دکان بھی بند ہوگئی تھی۔ ہو سکتا ہے جینے کا دوسرا اسٹیج ہونے کی وجہ سے اس کے سب اِدلی دوسے سانبر دو اکسیری بک گئے ہوں۔ صرف سراج کی دکان کھلی تھی۔ نہ جانے وہ کس ملہ پہ تھا؟ شاید اس لیے کہ بیڑی کی ضرورت رات ہی کو پڑتی ہے، مگر وہ صبح، صبح کا ذب ہی کو دکان کھول لیتا تھا، جو رات ہی کا حصہ ہوتی ہے، اس کا آخری حصہ۔ ورنہ صبح کہاں کسی کی ہوئی، وہ تو کمیونسٹوں کی ہوئی۔ شاید سراج ٹورسٹ ایجنٹ مائیکل کی انتظار میں تھا تاکہ وہ دونوں مِل کر اگلے روز کہیں آگرے کھجوراہو کا پروگرام بنالیں، تھوڑے پیسے کمالیں۔ نہیں، سراج پیسے کے پیچھے تھوڑے جاتا تھا، وہ تو جاتا تھا ان کچھی عورتوں کے پیچھے جو کثیر الازدواجی کی وجہ سے بھوکی پیاسی آتی تھیں اور یہاں آکر ممتاز کی محبت کو اِدھر کے کسی بھی شاہجہاں طبیعت والے مرد پہ آزماتیں اور کھجوراہو کے مہتھن کو زندہ

کرتی تھیں۔

جبھی سراج کی آواز نے مگن لال کو چونکا دیا۔

"ہیلو، سویٹی پائی . . . "

سراج تقریباً اَن پڑھ تھا، مگر ٹورسٹوں کے ساتھ رہنے سے اتنی انگریزی سیکھ گیا تھا۔ اس کی آواز سے مگن سمجھ گیا۔ کبرتی آئی ہے۔

وہ سچ مچ کبرتی ہی تھی، جو چھوٹے قد، گٹھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی ایک اداس لڑکی تھی۔ اس کا رنگ پکا تھا۔ پھر اوپر سے جامنی رنگ کی دھسّی پہن رکھی تھی۔ جب وہ آئی تو یوں لگا جیسے اندھیرے کا کوئی ٹکڑا متشکل ہو کر سامنے آگیا۔ وہ ہمیشہ رات ہی کو آتی تھی، جیسے اسے اپنا آپ چھپانا ہے اور شاید اسی لیے سراج کی دوکان کھلی تھی، وہ ہمیشہ کی طرح سے اس کی طرف دیکھے، اس سے بات کیے بغیر نکل آئی تھی۔ اس کے باوجود سراج سیٹیاں بجا رہا تھا۔

مگر کبرتی بات ہی کہاں کرتی تھی اِس سے، اُس سے، کسی سے بھی نہیں۔ اس سے بات کرنے کے لیے سوال کچھ یوں وضع کرنے پڑتے تھے کہ ان کا جواب ہاں ہو یا نہ۔ صرف اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں سر ہلانے سے بات بن سکے۔ سراج کا اسے چھیڑنا مگن کو بہت ناپسند تھا۔ اس نے کئی بار مگن سے کہا بھی تھا۔ تو کہیں عشق کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا؟ جوان لڑکی ہے۔ کیپچ ٹال۔ بہت اِدھر اُدھر رہا، تو کبوتر کی طرح سے تو وہ اُڑ جائے گی۔ لیکن مگن نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

درحقیقت مگن ٹکلے کا دھندہ سدباب ہوتا تھا۔ کبرتی کوئی لکڑی کا کام یا شلیپ بناکر بیچنے کی غرض سے اس کے پاس لاتی تو وہ اس میں بہت کیڑے نکالتا۔ کبھی کہتا

ایسی چیزوں کی آج مانگ ہی نہیں اور کبھی یہ کہ وہ فن کے معیار و محک پر پوری نہیں اترتیں۔ کیرتی اور بھی منہ لٹکا لیتی حالانکہ ان سب باتوں سے مگن لال کا ایک ہی مقصد ہوتا کہ وہ ستو کی چیز پانچ دس میں دے جائے اور پھر یہ اسے پیتل کر کے سینکڑوں میں بیچے۔

کیرتی نے یہ کام کسی آرٹ سکول میں نہ سیکھا تھا۔ اس کا باپ نارائن ایک شلپی تھا جو بھاؤ راجی اور جیمز برگس وغیرہ کے ساتھ نیپال اور جانے کہاں کہاں ہندوستان کی وراثت کو ڈھونڈتا پھرا تھا جو کہ دراصل لندن کے میوزیم، نیویارک اور شکاگو کی اینٹیک کی دوکانوں میں اتر رہی تھی۔ ہر سال ہمارے مندروں اور صنم خانوں سے سینکڑوں مورتیاں غائب ہوتیں اور ہزاروں میل دور کیوریو وغیرہ کی دوکانوں میں جگہ پاتیں۔ نارائن مسلسل سفر سے تنگ آ کر اپنے آبائی گھر لوٹ آیا تھا۔ اور گھر ہی میں شلپ بنانے شروع کر دیئے تھے جنہیں کیرتی بڑے انہماک سے دیکھتی رہتی تھی اور بیچ میں اوزار پکڑانے اور رگڑنے اور رنگ کرنے میں باپ کی مدد بھی کرتی تھی۔ یوں گھر بیٹھے بانٹنے میں نارائن اس بات کو بھول ہی گیا کہ کھویا ہوا دھن پائے ہوئے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس کے دو گنے چوگنے ہی نہیں سو گنا دام ملتے ہیں۔ شاید وہ جانتا بھی تھا لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو پیسے کی ماہیت کو سمجھ جاتے ہیں اور زندگی کو پھیلاؤ میں نہیں دیکھتے۔ وہ شلپ بناتا اور مشکل سے روٹی کماتا تھا۔ آخر ایک دن دو دیویوں کے درمیان اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ جگدمبا کا بت بنا رہا تھا جبکہ اس کا اپنا ہی چھینی اس کے ہاتھ میں لگ گیا جس سے اسے ٹیٹانس ہو گیا اور قریب کے چھاؤنی کے اسپتال میں مر گیا۔ کہتے ہیں وہ کتے کی موت مرا۔ کیوں نہ ایسی موت مرتا؟ جب وہ دیوی کا بت بناتا تھا تو دنوں، مہینوں اس کی چھاتیوں، اس کے کولہوں اور رانوں پہ ٹھہرا رہتا۔ چھوٹے شلپوں میں تو چھاتیاں خلاف

میں گھومتے ہوئے لٹو معلوم ہوتی تھیں، لیکن بڑوں میں ٹانگیں اور ٹار سوا ایک طرح کی گھڑ ودنجی تھے۔ اصل بات وہ دودھ کے بڑے بڑے مٹکے تھے جو اس پہ رکھے ہوتے تھے اور کولہے متھنی کے ماتھے کی طرح سے جس کے نیچے سے ایک کی بجائے دو سونڈیں نکلتی تھیں۔ اس نے دُرگا کا شلپ بھی بنایا تھا جو بڑی جبر جنگ دیوی ہے۔ ایسی دیویوں کے بدن بناتے ہوئے نارائن کہتے کہ نہیں تو کیا ہماری آپ کی مرت بنتا؟

"کیا لائی ہو؟" مگن ٹیکلے نے کیرتی سے پوچھا۔

کیرتی نے اپنے دھوتی کے پلو سے لکڑی کا کام نکالا اور دھیرے سے اسے مگن کے سامنے رول ٹاپ کی میز پہ رکھ دیا۔ کیونکہ اوپر کے لیمپ کی روشنی وہیں مرکوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے مگن نے ایک بیروق کرسی کیرتی کے سامنے سرکادی۔ مگر وہ بدستور کھڑی رہی۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟"

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بار پیچھے اس طرف دیکھا جہاں سڑک نیچے گرتی تھی اور جب چہرہ مگن کی طرف کیا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

کیرتی کی ماں وہیں چھاؤنی کے اسپتال میں پڑی تھی، جہاں اس کے باپ نارائن نے دم توڑا تھا۔ بڑھیا کو معقد کا سرطان تھا۔ اس کے پیٹ میں سوراخ کر کے ایک نلی لگا دی گئی تھی اور اس کے اوپر ایک بوتل باندھ دی تھی تاکہ بول و براز نیچے جانے کی بجائے اوپر بوتل میں چلے جائیں۔ پہلی بوتل کسی وجہ سے خراب ہو گئی تھی اور اب دوسری کے لیے پیسے چاہئیں تھے۔ اگر وہ مگن کو بتا دیتی تو وہ شاید دوسرے طریقے سے بات کرتا، لیکن اس ڈرڈرک کو دیکھ کر وہ ویسے ہی بھڑک گیا تھا۔

"پھر وہی" اس نے کہا "میں نے تم سے کئے بار کہا ہے۔ آج کل ان چیزوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ لیٹے ہوئے وشنو، اور شیش ناگ۔ لکشمی پاؤں داب رہی ہے...."
کیرتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے گن کی طرف دیکھا، جن میں سوال تھا ــــ اور کیا بناؤں؟

"وہی ۔ جو آج کل ہوتا ہے۔"

"آج کل ۔ .. کیا ہوتا ہے؟" کیرتی نے آخر منہ کھولا۔ مشکل سے اس کی آواز سنائی دی، جیسے کینری (CANARY) کی چونچ ہلتی دکھائی دیتی ہے، مگر آواز سنائی نہیں دیتی۔

گن نے کچھ نہ کہتے، کچھ راستہ پاتے ہوئے کہا "اور کچھ نہیں ہوتا تو گاندھی ہی بناؤ، نہرو بناؤ۔" اور پھر جیسے اسے کوئی غلطی لگی اور وہ اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے بولا "کوئی نیوڈ.. ۔"

"نیوڈ؟"

"ہاں ۔ آجکل لوگ نیوڈ پسند کرتے ہیں۔"

کیرتی چپ ہو گئی۔ کنواری ہونے کے ناطے وہ شرما سکتی تھی، لجا سکتی تھی مگر یہ سب باتیں اس لڑکی کے لیے تعیش تھیں، اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ گن اس کے ورک کو خریدتا، پیسے دیتا ہے یا نہیں؟ کچھ سوچتے، رکتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے نہیں آتا۔"

"کیا بات کرتی ہو؟ تمہارے باپ نے بیسیوں بنائے۔"

"وہ تو ــــ دیوی ماں کے تھے۔"

"فرق کیا ہے؟" مگن ٹکلے نے کہا "دیوی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ تم وہی بناؤ مگر بھگوان کے لیے کوئی دیوبالا اس کے ساتھ سختی مت کرو۔ انہی حرکتوں سے ہی تو تمہارے پتا ایسی موت مرا۔ سُرگباش ہوئے۔"

کیرتی نے اپنے جیون کے پچھواڑے میں جھانکا۔ اب جیسے وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ کسی اور خطرے سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، جیسے وہی جانتی تھی، کوئی دوسرا نہیں۔ پھر بھی وہ بیروق کرسی پہ بیٹھی نہیں، اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس طرف سے اس کے بدن کے حسین مگر جارحانہ خط دکھائی دے رہے تھے۔ کیا شلپ تھا، جیسے اوپر کے نہیں، نیچے کے نارائن نے بنایا تھا۔ مگن لال کے دماغ میں اختیار اور بے اختیاری آپس میں نبرد آزما ہو رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ برابر والی لڑکی کے اندر بھی وہی چارہ اور لاچاری آپس میں سر ٹکرا رہے ہیں۔ اس کا مُنہ سوکھ گیا تھا۔ کوئی گھونٹ سا بھرنے کی کوشش میں وہ بولی۔

"نہیں — میرے پاس موڈل نہیں۔"

"موڈل؟" مگن نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا "سینکڑوں ملتے ہیں آج تو کسی بھی جوان، خوبصورت لڑکی کو پیسے کی جھلک دکھاؤ تو وہ ایک دم سے"

کیرتی نے کچھ کہا نہیں۔ مگر مگن نے صاف سُن لیا۔ "پیسے؟" اور خود ہی کہنے لگا "آدمی پیسہ خرچ کرے، تبھی پیسہ بنا سکتا ہے نا۔"

اس بات نے کیرتی کو اور بھی اداس کر دیا۔ اس کی روح زندگی کے اس جبر کے نیچے پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ عورت کا یہی عالم تو ہوتا ہے، جو مرد کے اندر باپ اور شوہر کو جگا دیتا ہے۔ چنانچہ مگن نے اپنا ہاتھ بڑھایا تا کہ اسے

بازوؤں میں لے لے اور چھاتی سے لگا کر کہے۔ "میری جان! تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں جو ہوں۔" لیکن کیرتی نے اسے جھٹک دیا۔ مگن کٹ گیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تڑپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ رول ٹاپ پر سے اس نے مُڑ مُڑ کر اٹھایا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے اِس کی ضرورت نہیں۔"

جب تک کیرتی نے بھی کچھ سوچ لیا تھا۔ اس نے پہلے نیچے دیکھا اور پھر ایکا ایکی سر اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "اگلی بار تھوڑی ہی لادوں گی۔ ابھی تم اسے ہی لے لو۔"

"شرط؟" مگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیرتی نے سر ہلا دیا۔ مگن کو ٹھکلے کا خیال تھا۔ کیرتی ساتھ ہنس پڑے گی مگر وہ تو کچھ اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے رول ٹاپ کو اٹھایا اور میز کے اندر سے دس روپے کا چُرامُرا سا نوٹ نکالا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھا دیا۔ "لو"

"دس روپے؟" کیرتی نے کہا۔

"ہاں تمہیں بتایا نا، میرے لیے یہ سب بیکار ہے۔ میں اور نہیں دے سکتا۔"

"ان سے تو۔" اور کیرتی نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔ اس کے اندر گویائی، الفاظ سب تھک گئے تھے۔ پر مطلب صاف تھا۔ مگن سمجھ گیا۔ "اس سے تو بوتل بھی نہ آئے گی" "دوا کا خرچ بھی پورا نہ ہو گا" "روٹی بھی نہ چلے گی" قسم کے فقرے ہوں گے، سب مجبور اور نادار جن کی قسمت کیا کرتے ہیں۔ اس نے کیرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے بس وہ، لا دو تو میں اچھے پیسے دوں گا۔"

اور ایسا کہنے میں اس نے ہاتھ کی دو انگلیوں کا چھلا بنایا، تھوڑی آنکھ ماری جیسی ڈُدم، سازندے نائیکہ کو داد دیتے ہوئے مارتے ہیں۔

کیرتی باہر نکلی تو اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، وہ تھوڑا ہانپ رہی تھی۔ لوٹتے
یہ کیرتی ہمیشہ الٹی طرف سے جاتی تھی، حالانکہ اس میں اسے میل ڈیڑھ میل کا چکر پڑتا تھا۔
وہ نہ چاہتی تھی سراج سے اس کی ٹکر ہو لیکن آج وہ اسی طرف سے گئی جیسے اس میں کوئی
مدافعت ابھر آئی تھی۔ مائیکل چلا آیا تھا اور سراج کے ساتھ مل کر کچھ کھا رہا تھا، جبکہ
کیرتی منہ اوپر اٹھائے، ناک پھلائے ہوئے پاس سے گزر گئی۔ سراج نے کچھ کہا جو
مگن کو سنائی نہ دیا۔ کیرتی میں وہ بغاوت ہی کا جذبہ تھا اور یا پھر وہ ان مصیبت زدہ
لوگوں میں سے تھی جو دشمن کے ساتھ بھی بنا کر رکھنے کی سوچتے ہیں۔ مبادا انہی سے
کوئی کام آ پڑے۔ شاید یہ عورت کی فطرت کا خاصہ تھا جو اس مرد کو بھی اپنے پیچھے
لگائے رکھتی ہے۔ جس سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ صرف اس لیے کہ اسے دیکھ کر
ایک بار اس نے سیٹی بجائی یا اپنی چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھری تھی۔

سراج ضرور کوئی 'الفریڈ ڈبریاک' کھا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے پائے ہوں جو مائیکل
اس کے لیے لایا تھا۔ شاید وہ دونوں مل کر مگن ٹھیلے کے پاس آتے اور اسے کچھ داؤگھات
بتاتے، لیکن مگن نے دوکان ہی بڑھا لی تھی۔ دروازوں کو اندر سے بند کرتے ہوئے
اس نے کیرتی کے 'وڈ ورک' کو دیکھا جو بہت عمدہ تھا۔ شیش ناگ کا نچلا حصہ تو خوبصورت
تھا ہی لیکن اوپر اس کی چنگیری کھال میں اس نے صرف گردنوں سے رنگ بھر دیئے
تھے۔ دشنو میں وہی تھا جو کوئی بھی عقیدت مند عورت کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔
البتہ لکشمی ڈھیر سی پڑی تھی اور اس کے بدن کے خط واضح نہ تھے۔ شاید کیرتی لکشمی
کو اس کے کسی بھی معنی میں نہ جانتی تھی۔ حالانکہ اسے روچک بنانا کتنا آسان تھا جب
عورت پاؤں دبانے کے لیے جھکتی ہے تو ظاہر ہے اس کے ہاتھ بازو بدن سے

الگ ہوتے ہیں اور مخصوص عورت صاف اور سامنے دکھائی دیتی ہے۔ پھر پہلو پہ بیٹھی ہوئی اوپر کی عورت نیچے والی سے کتنی کٹ جاتی ہے اور مرد کی نظروں کو کیا کیا اونچ نیچ سمجھاتی ہے۔ اگر یہ کہیں کیرتی خود عورت تھی اس لیے اسے عورت کی بہ نسبت مرد میں زیادہ دلچسپی تھی تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ عورت اپنے حسن کے سلسلے میں اوّل اور آخر تک خود پرست ہوتی ہے اور جب اس کی یہ خود پرستی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو کسی بھی مرد کی مدد سے اسے جھٹک دیتی ہے۔

گمّو نے کیرتی کے وُڈورک کو ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرے میں جا فوسے کر اس پہ 'سدہم بمہ' کے الفاظ کندہ کر دیے اور پھر پچھلے کمرے میں پہنچ گیا جہاں کچی زمین تھی، جسے کھود کر اس نے وُڈورک کو نیچے رکھا، ایک اور مورتی کو نکالا جو کیرتی ہی کی بنائی ہوئی تھی اور پھر گڑھے پہ مٹی ڈال کر اس پہ گھڑے کا پانی چھڑک دیا۔ پرانے بُت کی مٹی جھاڑ کر اسے دیکھا تو بڑی بڑی دراڑیں اس میں چلی آئی تھیں اور وہ صدیوں پرانا معلوم ہو رہا تھا۔ اگلے دن وہ جب اسے لے کر ٹورسٹوں کے پاس گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ گمّو نے انہیں بتایا کہ اس کا ذکر کالی داس کے رگھوونش میں آتا ہے۔ رگھوجی نے کوکن کے علاقے میں ہر کٹ نام کا ایک شہر بسایا تھا، جہاں سے یہ بُت برآمد ہوئے۔ کچھ میسور کے مہاراجہ وڈیار کے پاس ہیں اور کچھ اپنے پاس۔ چنانچہ اس بت کو گمّو ٹھگلے نے ساڑھے پانسو روپے میں بیچ دیا۔ جس کے لیے اُس نے کیرتی کو پانچ روپے دیے تھے۔

اس ملاقات کے ایک ہفتے کے اندر کیرتی نیوڈ لے آئی۔ وہ بدستور بدحواس

تھی، اس کی ماں تو بیمار تھی ہی، وہ بھی بیمار ہو گئی تھی، اسے قریب قریب نمونیہ ہو رہا تھا۔ وہ کھانس رہی تھی اور بار بار اپنا گلا پکڑ رہی تھی، جس پہ اس نے روئی کا لوگڑا ایک پھٹے پرانے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

کیرتی نے معمول کی طرح سے شلپ کو مگن ٹکلے کے سامنے رکھا۔ اب کے اُس نے اُسے لکڑی میں نہیں، پتھر میں بنایا تھا۔ اب وہ پھر اُمید و بیم کے ساتھ مگن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگن اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو بہت بڑا جھوٹ ہوتا۔ اس لیے اس نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ جی بھر کر داد دی۔ اعتراض کیا تو صرف اتنا کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ کاش وہ اُسے قدِ آدم میں بناتی تو نہ صرف اسے بلکہ خود مگن کو بھی بہت فائدہ ہوتا۔

اس نے شلپ کِشتی کو ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھا۔ کیرتی پھر بھی سچ مچ کا نیوڈ نہ بنا سکی تھی۔ بت کے بدن پہ کپڑا تھا جو گیلا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اس کپڑے سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کہیں تو بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کہیں علیحدہ۔ بظاہر چھپانے کے عمل میں وہ عورت کے جسم کو اور بھی عیاں کر رہا تھا۔

شلپ پر سے نظریں ہٹا کر مگن ٹکلے نے کیرتی کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "واہ"! کیرتی جھینپ گئی اور اپنی جامنی ساری کو [illegible] پیچھے سے ڈھانپنے لگی لیکن مگن سب جان گیا تھا کہ وہ برہنہ ہو کر خود کو آئینے میں دیکھتی اور اُسے بناتی رہی ہے کے بار اس نے کپڑا بھگو کر اپنے بدن پہ رکھا ہو گا، جس سے اسے سردی ہو گئی اور اب وہ کھانس رہی ہے۔ یہ صرف پیسے ہی کی بات نہیں۔ عورت میں نمائش اور خود سپردگی کا جذبہ بھی تو ہے۔ مگن سب سمجھ گیا

تھا مگر تجاہل برتتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "ماں کیسی ہے؟"
کیرتی جیسے ایک دم برافروختہ ہو گئی، اسے کھانسی کا فٹ سا پڑا اور خود کو سنبھالنے میں خاصی دیر لگی۔ مگن گھبرا گیا تھا اور شرمندہ بھی تھا۔ اس کے بعد سرہلاتے ہوئے جو اس نے سوال کیا، وہ بہت غیر ضروری تھا۔ "تو موڈل مل گیا تمہیں؟"
کیرتی نے پہلے تو نظریں گرا دیں اور پھر دکان سے باہر اس طرف دیکھنے لگی جہاں سڑک آسمان کو چھوتی ہوئی ایکا ایکی نیچے گرتی تھی۔ مگن نے چاہا کہ اسے اس کمزوری کے عالم میں پکڑ لے اور وہ داد دے جس کی وہ مستحق تھی اور جو شاید وہ چاہتی بھی تھی مگر اس نے سوچا، ایسے میں دام بڑھ جائیں گے۔ اس نے اپنے دل میں اب کے کیرتی کو سو روپے دینے کا فیصلہ کیا۔ بوتل اور پانی کی چیزیں شاید سو کی نہ ہوں، مگر وہ سو ہی دے گا۔ اندر ہی اندر وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں کیرتی زیادہ کا مطالبہ نہ پیش کر دے۔
"کیا دام دوں اس کے؟" اس نے یونہی سرسری طریقے سے پوچھا۔
کیرتی نے اچٹتی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "اب کے میں پچاس روپے لوں گی۔"
"پچاس؟"
"ہاں۔ پائی کم نہیں۔"
مگن نے تسکین کے جذبے سے دل ٹٹولا اور چالیس روپے نکال کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے اور بولا۔ "جو تم کہو۔ مگر ابھی چالیس ہی ہیں میرے پاس۔ دس پھر لے جانا۔"
کیرتی نے روپے ہاتھ میں لے لیے اور کہا "اچھا"

وہ جانے ہی والی تھی کہ مگن نے اسے روک لیا۔ "سنو"
کیرتی گیت کے بیچ تھم کر اس کی طرف مجھے تھام لو کے انداز میں دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پہ اُداسیاں چھٹ جانے کی بجائے کچھ اور گھنڈ گئی تھیں جبکہ مگن ٹھکے نے پوچھا "اتنے پیسوں سے تمہارا کام چل جائے گا؟"
کیرتی نے سر ہلا دیا اور پھر ہاتھ پھیلائے جس کا مطلب تھا۔ "اور کیا کرنا؟"
پھر اس نے بتایا۔ ماں کا آپریشن آرہا ہے، جس کے لیے سینکڑوں روپے چاہئیں۔
"میں تو کہتی ہوں" اس نے کہا اور پھر کچھ رک کر بولی "ماں جتنی جلدی مر جائے اتنا ہی اچھا ہے۔" اور پھر وہ کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ آخر وہ خود ہی بول اٹھی۔ "ایسے ایڑیاں رگڑنے سے موت اچھی۔"
جب مگن نے اس سے آنکھ نہ ملائی تو کیرتی اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس برس کی بھرپور عورت نظر آنے لگی جو زندگی کا ہر وار اپنے اوپر لیتی اور اسے بیکار کر کے پھینک دیتی ہے۔
"ایک بات کہوں" مگن ٹھکے نے پاس آتے ہوئے کہا "تم مِشن بنا دو آپریشن کا سب خرچا میں دوں گا۔"
"مِشن؟" کیرتی نے کہا اور لرز اٹھی۔
"ہاں" مگن بولا "اس کی بہت مانگ ہے۔ ٹورسٹ اس کے لیے دیوانے ہوتے ہیں۔"
"لیکن۔"
"میں سمجھتا ہوں" مگن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتیں تو ایک بار

کھجوراہو چلی جاؤ، اور دیکھ لو۔ میں اس کے لیے تمہیں پیشگی دینے کو تیار ہوں۔"

"تم؟" کیرتی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولی

"تم تو کہہ رہے تھے تمہارے پاس اور پیسے نہیں ہیں؟"

مگن نے فوراً جھوٹ تراش لیا۔

"میرے پاس سچ مچ پیسے نہیں" وہ بولا "میں نے دوکان کا کرایہ دینے کے لیے کچھ الگ رکھے تھے۔۔"

پھر اس نے پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر کیرتی نے اپنے زعم میں نہ لیے اور وہاں سے چلی گئی۔ مگن ٹھکلے نے لوٹ کر "یکشنی" کو دیکھا اور پھر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی لے کر اس کی ناک توڑی، پھر ایک بازو توڑا پھر ٹانگ توڑی اور اس کے سر کے سنگار پہ ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں جس سے کچھ کرچیں گریں پھر اندر جا کر اس نے اسے رسی میں باندھا اور نمک کے تیزاب میں ڈبو دیا۔ دھوئیں کے بادل سے اٹھے۔ مگن نے رسی کو کھینچا اور یکشنی کو نکال کر پانی میں ڈال دیا۔ اب جو اُسے نکالا تو "یکشنی" کے خدوخال دھندلے ہو گئے تھے اور کہیں کہیں بیچ میں سوراخ چٹاخ سے پڑ گئے تھے۔ اب وہ ہزار ایک روپے میں بکنے کے لیے تیار تھی۔

اب کے کیرتی جو شلپ لائی وہ مٹھن ہی تھا۔ اور قدِ آدم۔ وہ ایک بوری میں بندھا ہوا تھا اور ٹھیلے پر آیا تھا۔ کچھ مزدوروں نے اٹھا کر اسے مگن ٹھکلے کی دکان پہ رکھا۔ پھر اپنی مزدوری لے کر وہ لوگ چلے گئے۔

کیرتی اور خود کو تنہا پا کر، تیز سانسوں کے بیچ مگن ٹھکلے نے بوری کی رسیاں کاٹیں،

اور کچھ دارفتگی سے ٹاٹ کو شلیپ پر سے ہٹایا۔ اب شلیپ سامنے تھا۔ پرفیکٹ۔۔
مگن نے اسے دیکھا تو اس کے گلے میں لعاب سوکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیرتی اس
کے سامنے اس شلیپ کو نہ دیکھے گی مگر وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے، کسی
بھی ہیجان سے عاری۔ شلیپ میں کی عورت تکمیل کو پہنچ رہی تھی جبکہ مرد خود رفتگی
کے عالم میں اسے دونوں کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھا، جسے مگن ٹکلے نے توجہ
سے نہ دیکھا۔ وہ شاید اسے فرصت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

"کتنے پیسے چاہئیں، آپریشن کے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"آپریشن کے لیے نہیں۔ اپنے لیے۔"

"اپنے لیے؟ ماں۔۔۔"

"مر گئی۔ کوئی ہفتہ ہوا۔"

مگن نے اپنے چہرے پہ دکھ اور افسوس کے جذبے لانے کی کوشش کی،
مگر شاید کیرتی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ ویسے ہی بھنچے ہوئے تھے۔ وہ ویسے ہی
اداس تھی جبکہ اس نے کہا۔ "میں اس کا ہزار روپیہ لوں گی۔"

مگن بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی، جب اس نے کہا "اس
کے ہزار روپے بھی کوئی دے سکتا ہے؟"

"ہاں" کیرتی نے جواب دیا۔ "میں بات کر کے آئی ہوں۔۔۔ شاید مجھے
زیادہ بھی مل جائیں، لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔"

"میں تو۔۔۔ میں تو پانسو دے سکتا ہوں۔"

"نہیں" اور کیرتی نے مزدوروں کے لیے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

مگن مِتھُن نے اسے روکا ۔ " سو دو سو اور لے لو "

" ہزار سے کم نہیں "

مگن نے حیران ہو کر کیرتی کی طرف دیکھا جس کے آج تیور ہی دوسرے تھے ۔ کیا وہ کھجوراہو گئی تھی ؟ ٹورسٹوں سے ملی تھی ؟ کسی بھی قیمت پہ کلاکار کو اس کی مارکیٹ سے جدا رکھنا چاہیے .. مگر خیر .. اس نے رول ٹاپ اٹھایا اور آٹھ سو کے نوٹ گن کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے ۔ کیرتی نے جلدی سے گنے اور اس کے منہ پہ پھینک دیئے ۔

میں نے کہا نا ۔ " میں ہزار سے کم نہ لوں گی "

" اچھا ۔ نو سو لے لو "

" نہیں "

" ساڑھے نو سو ۔ نو سو پچہتر .. " اور پھر کیرتی کی نگاہوں میں کوئی عزم دیکھ کر اس نے سو سو کے دس نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور نشے کی حالت میں مِتھُن کی طرف لپک گیا ۔ کیرتی کھڑی تھی ۔ جیسے وہ اپنے فن کی داد لینے کے لیے ٹھٹک گئی تھی ۔ مگن نے مِتھُن میں کی عورت کی طرف دیکھا جو پھر کیرتی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے ؟ کیا وہ لذت کی گراں باری تھی یا کسی جبر کا احساس ؟ کیا وہ دکھ اور سکھ ، درد اور راحت کا رشتہ تھا جو کہ پوری کائنات ہے ؟ پھر اس نے مرد کی طرف دیکھا جو اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بے حد کثیف ۔ کیوں ، کیرتی نے کیوں مرد ۔ انسان کی " حماریت " پہ زور دیا تھا ؟ ... یہ مِتھُن ہے .. مگر وہ مِتھُن تو نہیں ، جو پُرش اور پرکرتی میں ہوتا ہے .. ؟

ٹھیک ہے۔ آٹھ زیادہ پیسے ملیں گے ۔۔

مگن ٹکلے نے اُوپر کی بتی کو کھینچ کر پھر مرد کی طرف دیکھا اور بول اُٹھا "یہ۔ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے "

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم ۔" مگن نے جیسے پتہ پاتے ہوئے کہا "تم سراج کے ساتھ باہر گئی تھیں ؟"

کیرتی نے آگے بڑھ کر زور سے ایک تھپڑ مگن ٹکلے کے منہ پہ لگا دیا اور نوٹ ہاتھ میں تھامے دوکان سے نکل گئی ۔

ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ

خواجہ احمد عباس

ایک دو ہاتھ

دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تو سکھا رام کی آنکھ کھل گئی۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کتے کچھ ایسے انداز میں بھونک رہے تھے، جیسے رو رہے ہوں۔ اندھیرا تو جب وہ سویا تھا تب بھی تھا، مگر اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ اماوس کی رات تھی، چاندنی کا تو سوال ہی نہیں تھا لیکن تارے بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ برسات کا موسم نہیں۔ شام کو اس نے دیکھا تھا کہ آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی کہیں نہیں ہے۔ شاید جاڑے کی دھند تھی، جس نے ستاروں کو اپنی کالی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ دھند تھی یا دھواں یا دھول کا بادل تھا اس میں سکھا رام کو گلا گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

شاید یہ اُس کا وہم ہی ہو۔ بھلا اندھیرے سے بھی کسی کا گلا گھٹتا ہے؟ شاید جیسے جیسے وقت قریب آ رہا ہے۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکنے والی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ چار بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔ بازار کے چوکیدار ساڑھے چار بجے اپنا پہرہ ختم کر کے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، پو پھٹے گی ساڑھے پانچ بجے۔ اُس کو دو کانوں کا صفایا کرنے میں بس یہی ایک گھنٹہ لگے گا۔

چوری اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھلے تین برس میں کئی بار اُس نے جیل کی ہوا کھائی تھی۔ دو بار بمبئی کی پولیس نے اسے تڑی پار کیا تھا۔ اس بار تو تھانیدار نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بمبئی میں اس کی شکل بھی نظر آئی تو سیدھا اس کا چالان کر دیں گے، چاہے اس نے کوئی جرم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

سونگھارام پونا چلا آیا تھا، مگر یہاں کا موسم چوری کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ رات کو سردی کے مارے سب دروازے کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے۔ پولیس والے کم بخت بھی ہر وقت چکر لگاتے رہتے تھے۔ دو چار حوالدار اس کو پہچانتے بھی تھے۔ "کیوں سکھارام! بمبئی پولیس نے کر دیا نہ تجھے تڑی پار؟ یاد رکھنا کہ ہم تڑی پار نہیں کرتے۔ ذرا سا شبہ بھی ہو تو سیدھا جیل خانے میں بند کر دیتے ہیں۔" ان حالات میں کوئی شریف آدمی۔ یا شریف چور۔ کرے تو کیا کرے؟ دو چار ہی دن میں جیب میں جو جمع پونجی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ سکھارام نے سوچا اپنے گاؤں واپس چلا جائے۔ پونا سے سو سوا سو میل پر ہی تو تھا۔ مگر جائے تو کیسے۔ تین برس کے بعد اپنی بیوی کو کیا منہ دکھائے گا؟ گاؤں چھوڑتے وقت اس نے وٹھوبا کے مندر میں جا کر اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اب وہ اُس وقت ہی واپس آئے گا، جب اُس کے ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے تاکہ ساہوکار سے اپنی زمین چھڑا لیں، اپنے جھونپڑے کی مرمت کرا لیں اور ہل جوتنے کے لیے ایک جوڑی کو ٹھا پوری بیلوں کی خرید لیں۔ بس اتنی سی دنیا تھی ان کی۔ دو بیگھہ زمین۔ ایک جوڑی بیل۔ ایک ہل۔ جھونپڑے کی چار دیواریں اور پھونس کی چھت۔ اور ساوتری!

ہر بار جب اسے اپنی بیوی ساوتری کی یاد آتی تھی تو سکھارام کے دل میں درد کی ایک میٹھی میٹھی سی ٹیس اٹھتی تھی۔ گاؤں بھر میں ایک چھوکری بھی تو ساوتری جیسی نہیں تھی۔ آم کی کیریوں جیسی آنکھیں۔ یہ لمبے لمبے ریشم جیسے ملائم بال جن کا جوڑا بنا کر اس میں ایک جنگلی پھول لگا لیتی تھی تو سکھارام کے من میں کنول کھِل اُٹھتے تھے۔ دُبلی پتلی مگر سڈول جسم جو تو گز کی ساڑھی اور پھٹی ہوئی چولی میں اور بھی غضب ڈھاتا تھا۔ ہنس مکھ ایسی کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو پھر بھی ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی کوئی سہیلی ہمدردی جتاتی تو کہتی "مجھے کیا فکر ہے؟ میرے گھر والے کے محنت کرنے والے دو ہاتھ سلامت چاہئیں۔ سب دلدّر دور ہو جائیں گے۔"

ساوتری کا خیال آتے ہی سکھارام اندھیرے میں مسکرا دیا، اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھو کر محسوس کر سکتا تھا مگر وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان دو ہاتھوں نے جو محنت سے کھردرے اور سخت ہو گئے تھے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ ہل چلایا تھا۔ بیج بویا تھا۔ سینچائی کی تھی۔ نلائی اور کٹائی کی تھی۔ اناج کو چھاج کر بوریوں میں بھرا تھا، بوریوں کو اٹھا کر بیل گاڑی میں رکھا تھا۔ پھر وہ سب بوریاں ساہوکار کے ہاں پہنچا آیا تھا۔ اور ساہوکار نے بہی کھاتہ کھول کر حساب بتایا کہ اناج سے قرضہ پورا نہیں ہوا، اس کو اپنا بیل بھی بیاج میں دینا ہوگا۔ ایک بیل تو پہلے ہی بوڑھا اور بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ دوسرا ساہوکار کے حوالے کیا۔ اور گاڑی کو ان ہی دو ہاتھوں سے گھسیٹتا ہوا گھر واپس لے آیا۔ اُس دن سکھارام نے بمبئی آنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے سُنا تھا کہ شہر میں کام بہت ہے۔ محنت مزدوری کرنے والے

دو ہاتھ ہونے چاہئیں۔ ملوں میں تو ان دو ہاتھوں کا کوئی خریدار نہ نکلا۔ سو اس نے ان ہاتھوں سے بوجھا ڈھویا تھا۔ اناج کی بوریاں مال گاڑی سے اتار کر ٹرکوں میں بھری تھیں اور ٹرکوں سے اُتار کر گوداموں میں رکھی تھیں، اور ان بوریوں میں سے اس کو گیہوں کی ایسی جانی پہچانی سوندھی سوندھی خوشبو آئی کہ اس نے سوچا ممکن ہے میرے کھیت سے پیدا ہوا اناج بھی ان بوریوں میں بھر کر آگیا ہے۔ بعض گوداموں میں خفیہ طریقے سے مال رات کو اتارا جاتا تھا۔ سکھا رام جانتا تھا یہ کالا بازار ہے۔ مگر وہاں مزدوری دُگنی ملتی تھی۔ چار روپیہ کے بجائے آٹھ روپے روز۔ شام کو چار آنے کی اوسل پاؤ کھا کر وہ اوپر سے ٹھنڈا پانی پی لیتا اور بس! سینما کی رنگ برنگی روشنیاں آنکھیں جھپکا کر اس کو بلاتیں، اُن کے رنگین پوسٹروں پر اُدھ ننگی میمیں اس کو لبھاتیں، مگر سکھا رام سوچتا میری ساوتری ان سب سے خوب صورت ہے۔ میں ان کو دیکھنے کے لیے کیوں اپنی محنت کی کمائی خرچ کر دوں؟ اُس کی انٹی میں پانچ سے دس، دس سے بیس، بیس سے پچاس، سو روپے، دو سو روپے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے اور اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کھیت، اس کے بیل، اُس کا گاؤں، اُس کی ساوتری، اُس کے قریب آتے جا رہے ہیں، اور دن بھر محنت کرنے کے بعد جب وہ ان ہی ہاتھوں کا تکیہ بنا کر فٹ پاتھ پر سو جاتا تو اس کے خواب میں ساوتری کے پیروں کی چھاگل سنائی دیتی، اور وہ اپنے مچھلی جیسے سڈول جسم کو نو گز کی ساڑھی میں لپیٹے اُس کے لیے بھاکری اور ساگ اور پیاز کی گٹھیاں لاتی اور کھیت کی منڈیر پر ہی بیٹھ کر وہ کھانا کھاتے۔ اور کبھی کبھی بچوں کی طرح ساوتری نوالہ بنا کر سکھا رام کو دیتی اور کبھی وہ شرارت سے ساوتری کی اُنگلی کاٹ لیتا اور جب وہ

اس پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی تو پھر وہ نوالہ بنا کر ساوتری کے منہ میں دیتا اور اس کے ننھے سفید دانت سکھا رام کی مضبوط کھردری انگلی کو نرمی سے اپنی پکڑ میں لے لیتے اور پھر دانتوں کی جگہ ہونٹ لے لیتے۔ ساوتری کے انگوروں جیسے اُودے اور رس بھرے ہونٹ۔ اور سکھا رام کو محسوس ہوتا کہ وہ نرمی اور پیار کی ایک لہر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ ڈوبتا جا رہا ہے، اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے ڈوبنے سے بچائے۔

ایک دن سکھا رام صبح کو دیر سے اُٹھا، انگڑائی لے کر رات بھر کی نیند کا نشہ دور کیا، پھر رام کا نام لے کر کھڑا ہو گیا تو اُسے اپنی انٹی جہاں وہ سب روپیہ رکھا کرتا تھا ہلکی لگی۔ گھبرا کر جلدی سے کھول کر دیکھا تو سب روپیہ غائب تھا۔ چھ مہینے کی محنت پر پانی پھر گیا تھا۔

"کہاں ہے وہ بدمعاش؟" وہ بے تحاشا چلایا۔

"کون بدمعاش؟" کسی نے پوچھا۔

"جو میرے قریب یہاں فٹ پاتھ پر سو رہا تھا۔ رات کو بڑی دیر تک مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُس کو بتایا۔ ہاں میں نے ہی اُس کو بتایا تھا کہ میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو چکے ہیں۔۔۔ مگر وہ ہے کہاں؟"

ایک بوڑھا بھکاری جو ایک کونے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا تھا اور اُس فٹ پاتھ کی سب خبریں رکھتا تھا بولا۔ "ارے بھیکو تمہیں اب نہیں ملے گا۔ وہ تو کہیں بیٹھا تمہارے روپے سے دارو پی رہا ہو گا۔"

پورے تین دن اس نے شہر کی خاک چھانی سب دارو بنانے اور دارو بیچنے

کے غیر قانونی اڈے پر ہو آیا۔ بڑے بڑے عجیب آدمیوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اُن میں سے کئی چاہتے تھے کہ وہ بھی دارو سپلائی کرنے کے دھندے میں لگ جائے۔ ایک ہی مہینے میں اُس کا سارا نقصان پورا ہو جائے گا۔ مگر سکھارام کو کام نہیں چاہیے تھا اس کو بھیکو سے بدلہ لینا تھا، جس نے اُس کی تین مہینے کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ آخر کار چھ دن دھراوی کے ایک جھونپڑے میں وہ بھیکو کو پکڑ پایا۔ وہ ایک میز پر بوتل اور گلاس اور بھنے ہوئے چنوں کی ایک پلیٹ رکھے ہوئے دارو پی رہا تھا۔

سکھارام نے اُس کو گلے سے پکڑ لیا اور چلّایا "نکال میرے روپے۔"

بھیکو نشے میں تھا پھر بھی اُس نے انکار نہیں کیا، صرف اتنا کہا:۔

"گلا تو چھوڑو، دیتا ہوں، دیتا ہوں۔"

سکھارام نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ بھیکو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مٹھی بھر سکّے نکال کر میز پر ڈال دیئے۔ سکھارام نے جھپٹا مار کر ان کو تو اپنے قبضے میں کیا۔ پھر گن کر بولا "مگر تو نے تو ساڑھے تین سو روپے چرائے تھے۔ یہ تو صرف تین روپے اسّی پیسے ہیں۔ باقی کہاں ہیں۔؟"

"یہاں" بھیکو نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر بولا:۔

"سب پی گیا۔ بھئی بڑا مزہ آیا۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ دھنیہ واد"

"دھنیہ واد کے بچے!" سکھارام نے پھر اُس کا گلا پکڑ لیا۔ اس پر دارو بیچنے والا اور اس کے دو چار ساتھی وہاں آ گئے اور سکھارام کا ہاتھ چھڑا کر اُلٹا اس کو مارنے لگے۔

"نہیں چھوڑ دو اسے۔" بھیکو نے حکم دیا اور اُن لوگوں نے سکھارام کو چھوڑ دیا۔
"یہ میرا دوست ہے ذرا غصے میں آگیا تھا۔" اور پھر سکھارام کی طرف دیکھ کر۔
"بیٹھو، بیٹھو۔ تم بھی پیو۔ ابھی ہم دو بوتلیں اور منگا سکتے ہیں۔"
"میں نہیں پیتا۔" سکھارام نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے کہ تم پیتے نہیں ہو تب ہی تو انٹی میں اتنے روپے لیے پھرتے ہو اور پھر بھی فٹ پاتھ پر سوتے ہو۔ پیو میرے بھائی۔ دارو تمہارے ہی پیسے سے آئی ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے گلاس میں دارو انڈیل دی اور گلاس سکھارام کی طرف بڑھایا۔

سکھارام نے سوچا۔ "یہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔ میرے پیسے ہی کی تو دارو پی رہا ہے۔" اُس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ ایک بار تو بڑی بو آئی۔ پھر دل کڑا کرکے وہ پی گیا۔ اُس کو پہلے تو ایسا لگا کہ کسی نے چاقو سے اُس کا گلا اندر سے چیر دیا ہے، مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ احساس جاتا رہا۔ اور اس کی جگہ ایک نرم نرم گرمی نے لے لی جو اس کے بدن میں دوڑتی جا رہی تھی۔

بھیکو نے اس کا گلاس پھر بھر دیا تھا۔ "اور پیو میرے یار۔"
سکھارام نے دوسرا گلاس بھی پی لیا۔

اب اُس نے گلاس واپس میز پہ رکھا ہی تھا اور بھیکو اس میں تیسرا پیگ انڈیلنے کے لیے دارو کی بوتل اٹھا ہی رہا تھا کہ اُس کی نظر اس کی کلائی پہ پڑی جہاں ایک سنہری پٹے کی گھڑی جگمگا رہی تھی۔

"یہ بھی میرے پیسے سے لی ہے؟" وہ چلّایا۔

بھیکو نے کلائی سے گھڑی اُتار کر سکھارام کو دے دی۔ "یہ لو میرے یار آج ہی ایک سمگلر سے پچاس روپے میں لی ہے۔ خالص ولایتی گھڑی ہے، اندھیرے میں بھی وقت بتاتی ہے۔"

ڈھائی برس کے بعد آج بھی وہ گھڑی سکھارام کی کلائی پہ لگی ہوئی اندھیرے میں وقت بتا رہی تھی۔ چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ سکھارام نے سوچا وقت بھی کتنے دھیرے دھیرے گزرتا ہے، ساڑھے چار بجیں تو میں اپنا کام چالو کر دوں گا، اور پھر اُس کو گھڑی سے بھیکو کی یاد آئی، بھیکو جو اب بھی جیل کی ہوا کھا رہا تھا مگر جس نے سکھارام کے روپے چرا کر اس کو چوری کا راستہ دکھایا تھا۔

پہلے چھوٹی موٹی چوریاں۔ پھر بڑی چوریاں، مگر کبھی سکھارام کے پاس اتنے روپے نہ ہوئے کہ وہ گاؤں واپس جا کر اپنی زمین چھڑا لیتا۔ دو بیل خرید لیتا، ساوتری کے لیے دو چار بڑھیا ساڑھیاں اور کچھ زیور خرید لیتا۔ اوّل تو چوری کا مال دوکان داروں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچنا پڑتا تھا۔ دوسرے جو آتا تھا وہ کھلانے پینے، پلانے میں خرچ ہو جاتا تھا، جیل میں — وہ فضلو ٹھیک کہتا تھا "یار اس حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی ہے۔"

پونا میں ایک دن شام کو اندھیرا ہوتے ایک عورت کا بٹوہ چھین کر بھاگنا چاہا مگر اس کم بخت نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے تھے۔ سکھارام نے بٹوے میں سے دس دس روپے کے نوٹ نکال کر بٹوہ زمین پر پھینک دیا، اور خود بھاگتے بھاگتے ایس۔ ٹی کے بس سٹینڈ کی طرف آ نکلا۔ ایک

بس جانے کو تیار تھی، وہ اس میں سوار ہوگیا، بس چل پڑی۔ بس کنڈکٹر نے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟" سکھا رام نے جس کا سانس دوڑنے سے اب تک پھولا ہوا تھا جواب دیا۔ "جہاں بھی یہ بس جا رہی ہے۔"

بس کنڈکٹر نے کسی جگہ کا نام لیا جو بس کی گھڑگھڑاہٹ میں سنائی نہ دیا، پھر اس نے کہا۔ "سات روپے ہوں گے۔" سکھا رام نے اُسے چوری کا دس کا نوٹ پکڑا دیا اور تین روپے لے کر جیب میں رکھ لیے۔

صبح سویرے بس اپنی منزل پر پہنچی تو سکھا رام آنکھیں ملتا ہوا اُترا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی گاؤں ہوگا، مگر یہاں پہنچ کر دیکھا کہ بڑی رونق ہے، اچھا خاصا قصبہ ہے۔ بازار بھی ہے، بازار میں دوکانیں بھی ہیں، دوکانوں میں سامان بھی ہے۔ چوری کرنے کے قابل سامان!

سکھا رام نے فیصلہ کر لیا کہ دو تین روز یہیں گزارنے چاہئیں، کون جانتا ہے اُس کی قسمت یہاں ہی کھل جائے۔ دن بھر وہ بازاروں میں گھومتا، کس دکان میں کیا کیا سامان ہے، اس کو دماغ میں یاد کرتا۔ کہاں ساڑھیاں ملتی ہیں، کہاں زیور، کہاں ریڈیو۔ کس کس دکان میں تجوریاں ہیں جو یقیناً روپوں سے بھری ہوں گی، رات کو چوکیدار بازار کا گشت لگاتے تھے۔ مگر اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ساڑھے چار بجے صبح وہ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ بس وہی وقت ٹھیک رہے گا، اس کے کام کے لیے۔ دو چار دوکانوں ہی سے اس کا کام چل جائے گا، اور دوکانیں کھلنے کے وقت تک وہ وہاں سے بہت دور نکل جائے گا۔

شہر کی ساری رونق بند ھ کی وجہ سے تھی، زیادہ تر لوگ وہیں کام کرتے تھے۔

سوسکھارام نے سوچا کیوں نہ بندھ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ بندھ واقعی بڑا جنگی تھا۔ دو پہاڑیوں کے بیچ میں ندی کے پانی کو روکنے کے لیے بندھ بنایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے بجلی کے کارخانے بھی تھے۔ بندھ پر اب بھی کچھ کام ہو رہا تھا سینکڑوں مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔

ایک مزدور سے سکھارام نے پوچھا "کیوں بھئی یہ اتنا بڑا بندھ کیوں بنایا ہے؟"

اس نے کہا۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ یہاں پانی اکٹھا کر کے نہریں نکالیں گے جو سو کھے کھیتوں میں پانی پہنچائیں گی۔"

سکھارام نے سوچا "میرے کھیتوں میں بھی پانی آئے گا؟"

وہ مزدور اب کہہ رہا تھا۔" اور یہ بجلی گھر بھی پانی کی طاقت سے چلتے ہیں یہاں بجلی بنتی ہے اور ان تاروں سے دُور دُور جاتی ہے۔ جانتے ہو بمبئی بھی بجلی یہیں سے جاتی ہے۔"

..... اور سکھارام کے دماغ میں بمبئی کی لاکھوں جگمگاتی ہوئی روشنیاں اُبھر آئیں۔ اتنی دُور سے بجلی وہاں جاتی ہے! پھر اس نے سوچا" مگر میرا گاؤں تو صرف چالیس میل ہے یہاں سے۔ وہاں تک تو یہ بجلی جاتی نہیں ہے۔ مجھے اس بجلی سے فائدہ؟"

ایک اُونچے ٹیلے پر کسی مزدور نے ٹین کی چھت کا ایک جھونپڑا بنایا تھا۔ وہ خالی پڑا تھا، رات کو نظر بچا کر سردی سے بچنے کے لیے سکھارام اُسی میں پڑ رہتا۔ وہاں سے ایک طرف بہت دور بندھ پر لگی ہوئی روشنیاں نظر آتیں، دوسری طرف شہر کے مکانوں اور دکانوں کی بتیاں۔ وہ سوچتا اس روشنیوں کے سمندر میں بھی جھونپڑا

ایک اندھیرے کا ٹاپو ہے۔ پھر سوچتا۔ شاید اندھیرا جھونپڑے میں نہیں ہے۔ میرے من میں ہے۔

نہیں یہ اندھیرا کچھ اور قسم کا تھا۔ اس میں تو بندھ کی روشنیاں بھی ڈوب گئی تھیں، اندھیرے کے سمندر کی تہہ میں دور کہیں دھندلی دھندلی سی ٹمٹما رہی تھیں، اس کا اپنا گلا ہی گھٹتا نہیں معلوم ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کوئی دنیا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو، اس نے سوچا اور ایک بار پھر گھڑی کی اندھیرے میں چمکنے والی سوئیوں کی طرف دیکھا۔ چار بج کر بیس منٹ ہوئے تھے، اب اسے چلنا چاہیے۔ بانسار پہنچنے میں کم سے کم دس منٹ تو لگیں گے، یہ سوچ کر وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ زمین کے اندر سے ایک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی جیسے سُرنگ میں کوئی ریل چل رہی ہو یا ہوائی جہاز بہت نیچے اڑ رہا ہو اور چھت پر گھسنے ہی والا ہو۔ ساتھ میں اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین جیسے سرک گئی ہو۔ قدم ڈگمگائے تو اس نے اندھیرے میں دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ہاتھ سے چھوا تو اس کو ایسا لگا جیسے دیوار بھی لڑکھڑا رہی ہے۔ اس نے شام کو شراب پی ہوتی تو وہ سمجھتا یہ سب نشے کا کرشمہ ہے۔ مگر اس نے تو چار دن سے دارو کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا، پھر یہ سب کیا۔ ۔ ۔

"بھونچال!" دفعتہً یہ خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا اور اگلے لمحے میں جھونپڑے کی لڑکھڑاتی ہوئی دیواریں اور کھڑکھڑاتی ہوئی ٹین کی چھت اس کے سر پر آ رہیں۔

جب اس کو ہوش آیا تو سب سے پہلے جو چیز اس نے محسوس کی وہ گندھک کی تیز بو تھی اور ایک دم گھونٹنے والا دھول مٹی کا بادل سا اندھیرا اب بھی اتنا گہرا

تھا کہ اس کو چاقو سے کاٹ سکتے تھے۔ سکھارام کو اپنے ماتھے پر پانی کی ایک لکیر چلتی ہوئی معلوم ہوئی ٹٹول کر دیکھا تو منہ سے "سی" نکل گئی۔ سر میں گہرا زخم آیا تھا جس میں سے خون رس رہا تھا۔ ٹانگوں پر، بازوؤں پر، ایک طرف چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ مگر یہ وقت ان معمولی زخموں کی پرواہ کرنے کا نہیں تھا۔ زخموں کی ٹیس اس کو جھنجھوڑ کر بے ہوشی سے باہر نکال لائی تھی اور اب ایک ہی خیال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ اس جھونپڑے کی طرح بازار میں دکانوں کی دیواریں اور چھتیں بھی گر گئی ہوں گی۔ اس کو تالہ توڑنے کی تکلیف بھی نہ کرنی پڑے گی۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پورے ساڑھے چار بجے تھے۔ بھونچال آئے صرف دس منٹ ہوئے تھے۔

ٹین کا پترا جو اس کے سر پہ گرا تھا اس کو ہاتھ سے ہٹا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا، چاروں طرف دیواروں کی اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتا، لنگڑاتا، گرتا پڑتا، وہ اندازے سے شہر کی طرف چل کھڑا ہوا، اندھیرا اب ایک مٹیلے دھندلکے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ مگر بندھ پر اور شہر میں سب جگہ بجلی کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اب تو اُس کا کام اور بھی آسان ہو گیا تھا۔

سارا شہر ایک دم گر پڑا تھا۔ جیسے گھر نہ ہوں، بچوں کے بنائے ہوئے مٹی کے گھروندے ہوں۔ زمین سے دھول کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ اینٹوں، پتھروں، ٹین کے پتروں کے نیچے دبے ہوئے آدمی۔ مردہ عورتیں، بچے۔ جو مر نہیں گئے تھے یا بالکل بے ہوش نہیں ہو گئے تھے وہ چلا رہے تھے، رو رہے تھے، سسک رہے تھے، بلک رہے تھے، کراہ رہے تھے۔ ایک نے ایک سایہ سا

پاس سے گزرتے دیکھا تو چلایا۔ "بھائی۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے اینٹوں کے اس ڈھیر میں سے نکالو۔ شاید میری ٹانگیں جاتی رہی ہیں۔" مگر سکھا رام کو اس وقت ایک ہی دھن تھی۔ وہ کسی کی جان بچانے کے لیے تیار نہیں تھا، آج بھگوان نے اسے سچ مچ چھپر پھاڑ کر دولت دی تھی۔ ایسا موقع وہ کھونے والا نہیں تھا۔ دو ہاتھوں سے جتنا کچھ سمیٹ سکا وہ لے کر وہاں سے چل دے گا، اور جب تک لوگوں کو ہوش آئے گا وہ اپنے گاؤں، اپنی ساوتری کے پاس پہنچ جائے گا۔

اندھیرے میں گرتا پڑتا، سنبھلتا، ٹھوکریں کھاتا، وہ بازار کی طرف چلا جا رہا تھا، کہیں کہیں مکانوں کی دیواریں بیچ سڑک پہ آ رہی تھیں۔ اینٹ پتھر کے ڈھیروں سے بچنے کے لیے سکھا رام کو گرے ہوئے گھروں میں سے راستہ بنانا پڑتا۔ ایک بار تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کا پیر کسی نرم چیز پر پڑا ہے۔ شاید کسی کی ٹانگ تھی یا ہاتھ تھا۔ ایک ہلکی سی "آہ" سنائی دی اور پھر سکھا رام آگے بڑھ گیا۔

سکھا رام نے صبح کے دھندلکے میں دیکھا کہ بازار میں کسی دوکان کی چھت یا دیوار نہیں بچی تھی۔ دوکانوں کا سب سامان بکھرا پڑا تھا یا اینٹ پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سکھا رام نے ساڑھیوں کی دوکان سے دس پندرہ ساڑھیاں گھسیٹیں۔ ایک ساڑھی کو دُہرا کر کے زمین پر پھیلایا۔ اس میں سب ساڑھیوں کا ڈھیر لگایا۔ کچھ کپڑے کے تھان ڈالے۔ پاس کی دوکان سے ریڈیو لے کر ان کو رکھا۔ ایک جیولر کی دوکان کے ملبے میں زیور بکھرے ہوئے تھے سکھا رام نے ٹٹول ٹٹول کر اٹھائے۔ یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا کہ سونے کے ہیں یا چاندی کے۔ ایک تجوری اوندھی پڑی تھی اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ایک اور دوکان کا کیش بکس اڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ اُس کو کھولنے کی کوشش کی۔ بڑا بھاری تھا ضرور روپے بھرے ہوں گے۔ جب نہ کھول سکا تو بند کا بند ہی ڈھیر میں شامل کر لیا۔ ساڑھی کا گٹھڑ باندھا۔ اب تو وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر اس نے سر پر رکھا۔ وزنی کافی تھا اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ مگر اس نے جی کڑا کر کے قدم بڑھائے تاکہ سویرا ہونے سے پہلے وہاں سے باہر نکل جائے۔

دھیرے دھیرے آسمان میں سویرا اُبھر رہا تھا۔ پورب کی طرف بادل، پہاڑیاں، بندھ، ہلکی ہلکی پرچھائیاں سی اب دکھائی دے رہی تھیں، دھیرے دھیرے شہر کے کھنڈر بھی دھرتی پر اُبھر رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور تباہی۔ ایسا لگتا تھا شہر مر گیا ہے، دُنیا مر گئی ہے صرف ایک آدمی زندہ ہے، اور وہ دونوں ہاتھوں سے دنیا کی دولت بٹور کر لیے جا رہا ہے۔

نہیں (اُس نے سوچا) کوئی اور بھی زندہ ہے! ایک بچہ کے رونے کی آواز نے سکھارام کو چونکا دیا، جیسے یہ آواز باہر سے نہ آئی ہو خود اُس کے من کے اندر سے آئی ہو۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا، ایک گھر کی چھت اور دیواریں ڈھیر ہو چکی تھیں۔ اُن ہی میں ایک طرف باپ مرا پڑا تھا، پاس ہی ماں، اور ان دونوں لاشوں کے قریب ہی ایک سال ڈیڑھ سال کا بچہ جو کسی مُعجزے سے بچ گیا تھا اینٹوں کے ڈھیر پہ بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

سکھارام نے بچے کو دیکھا پھر ایسے نظر پھیر لی جیسے بچے نے اُس کی چوری پکڑ لی ہو، جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ اتنی دور پہنچ جائے کہ بچے کی آواز اس کے

کانوں تک نہ پہنچے۔ مگر بچے نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔
چلتے چلتے اس کے قدم آپ سے آپ رُک گئے، اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ
اُس کا اپنا بچہ ہو جو ہمیشہ اُن کے سپنوں میں آتا تھا۔ مگر جس نے اب تک ساوتری کی
کوکھ سے جنم نہ لیا تھا۔

اس نے مڑ کر بچے کی طرف دیکھا۔ سر پر گٹھڑا اٹھائے اُلٹے پاؤں اس کے
قریب گیا، سوچا کسی طرح اس گٹھڑی کو بھی لے چلوں اور اس بچے کو بھی اُٹھا لوں۔
مگر ہاتھ دو ہی تھے۔ یا ایک بوجھ کو سنبھال سکتے تھے یا بچے کو گود میں لے سکتے تھے۔

اس نے سر سے گٹھڑی اُتار پھینکی۔ دوڑ کر بچے کے باپ کے پاس گیا، بیچارے
کے سر پہ ایک بھاری پتھر گرا تھا۔ کب کا دم توڑ چکا تھا۔ ماں کی نبض پر بھی ہاتھ رکھا۔
ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے، پھر اس نے بچے کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ بچہ
ہمک کر اُس کی گود میں آتے ہی خاموش ہو گیا جیسے اُسے اپنی منزل مل گئی ہو۔

سکھارام نے ایک نظر اُس گٹھڑی کی طرف دیکھا، جس میں دُنیا کی ہر دولت موجود
تھی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے بچے کو سنبھال کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور چل کھڑا ہوا۔

دور بندھ کے پیچھے سورج بادلوں میں سے اپنا سر نکال کر گوتم نگر کی تباہی کو
دیکھ رہا تھا، مگر سورج کی ایک نرم کرن سکھارام اور اُس کی چھاتی سے لگے ہوئے
بچے پر پڑی اور بچہ جس کی آنکھ میں اب تک آنسو تھے، آپ سے آپ مسکرا دیا۔

ماہنامہ "شمع" دہلی

عصمت چغتائی

نوالہ

پوری چال میں ایک دندر مچا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی کھولی میں سانپ نکل آیا ہے۔ یا کسی کے ہاں بچہ ہو رہا ہے۔ عورتیں ایک کھولی سے دوسری میں گھس رہی تھیں۔ شیشیاں، بوتلیں، ڈبے لیے سب کی سب سرلا بین کی طرف لپک رہی تھیں۔ جیسے سرلا بین کا آخری وقت ہو اور ساری پڑوسنیں اپنی سی کرنے پر تلی ہوں۔

ایک طرح سے تو سرلا بین کا واقعی آخری وقت تھا۔

ان کی ٹرین بس چھوٹنے ہی والی تھی۔ وہ پورے ۴۲ برس کی ہوتیں اگر ان کے دور اندیش والدین نے پربھاکر کے سارٹیفکیٹ میں ان کی عمر کے پورے پانچ سال نہ ہڑپ کر لیے ہوتے۔

مگر کاغذ کی عمر ایسا زبردست سہارا نہیں ہوتی۔

وہ یوپی کے کسی گمنام سے گاؤں کی پیداوار تھیں۔ مگر بمبئی میں اتنے سال رہیں کہ وطن کو بھول بھال کے بمبئی کی ہی ہو گئی تھیں۔ ان پر کسی صوبے کا ٹھپا نہیں تھا۔ کوئی انہیں گجراتی سمجھتا، کوئی مارواڑی اور سندھی، بس جگت سرلا بین ہو گئی تھیں۔

سرلا بین کے ای۔ ایم ہاسپٹل میں نرس تھیں۔ مہنگائی الاؤنس ملا کے دو سو چالیس

روپے ملتے تھے۔ بارہ روپے کمرے کا کرایہ دے کر اتنا بچ جاتا تھا کہ بڑے ٹھاٹ سے رہتی تھیں۔ ہاسپٹل سے مرہم پٹی کا سامان، اے، پی، سی کی گولیاں، مرکیوری کروم اصلی گلیسرین اور پیٹینٹ دواؤں کے سیمپل لا کر مفت تقسیم کیا کرتی تھیں۔ ان کا کمرہ آس پاس کے علاقے کے لیے اچھا بھلا اسپتال تھا۔

سرلا بین بڑے کام کی چیز تھیں۔ اوپر سے شکل و صورت کے ساتھ ساتھ چال چلن ایسا تھا کہ کبھی کسی کی گرہستی پہ شبے پڑنے کا خدشہ نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے انتہا ہر دل عزیز تھیں جدھر نکل جاتیں ان کے جنائے ہوئے بچے کلبلاتے روتے بسورتے نظر آتے۔ لوگ ان کے قدموں میں آنکھیں بچھاتے۔ ہر سودے والا، ہر دوکاندار انہیں رعایت سے مال دیتا۔ وہ مول تول کرتی جاتیں اور مریضوں کے حال چال بھی پوچھتی جاتیں۔

"کیوں رے تکسی، بہو کی کمر کا درد کیسا ہے۔ ارے شاکر میاں آمنہ بی کے پیروں کی سوجن اتری کہ نہیں۔ شام کو لے آنا۔ انجکشن دے دوں گی۔ اے او رجنی تیرے گھٹنوں کے درد کا کیا ہوا؟ تیرا مرد پھر دارو پی کر آنے لگا ہے کہ؟"

وہ خیر خبر پوچھتی، گام دیوی کے نکڑ والے بس اسٹاپ پر پہنچ جاتیں اور ان کے مریض ان کو دعائیں دیتے رہ جاتے۔

بس سب کو یہی دکھ تھا کہ سرلا بین اب تک کنواری بیٹھی تھیں اگر شادی کے بعد وہ بیوہ ہو گئی ہوتیں، یا میاں چھوڑ کر چلا جاتا تو بھی صبر آ جاتا۔ مگر یہ تو نرا اندھیر تھا کہ ان کی ریل چھوٹ رہی تھی اور جیون ساتھی کا دور دور نشان نہ تھا۔ سب کے سر ان کے احسانوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سب کے لیے کرتی تھیں،

لیکن ان کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شہر بمبئی ہے یہاں زندگی سرپٹ دوڑتی ہے۔ یہاں مشاطہ اور نائن کا فیشن ختم ہو چکا ہے۔ یہاں تو بس آنکھ لڑ جاتی ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔

سرلا بہن فلم ہیروئن نہ سہی، ڈراؤنی بھی نہ تھیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ان پر عاشق ہی نہ ہو پائے۔ آدمی کا بچہ تھیں۔ باپ بچپن ہی میں مر گئے ماں ہمیشہ کی روگی۔ سنگر مشین کے بل بوتے پر انہیں پالتی رہیں۔ پھر جب بیٹی کمانے لگی تو وہ بالکل ہی ٹوٹ گئیں۔ دو ایک بار اچٹتا ہوا انہیں بیٹی کے بیاہ کا خیال آیا، مگر اس خیال کے کوئی معقول صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی وہ چل بسیں۔ وہ دن اور آج کا دن سرلا بہن ایسی اپنے کام میں جُٹیں کہ شادی کا خیال تک نہ آیا۔ خیال آیا بھی ہو گا تو انھوں نے کسی سے تقاضا نہیں کیا۔ اور تھا بھی کون جس سے تقاضا کرتیں کہ بھئی ہمارا بیاہ کرا دو؟

کہتے ہیں اگر کوئی کنواری کنیا بیٹھی رہے تو دھرتی کی چھاتی پر بوجھ ہوتا ہے اور دھرتی کے اس کرب کا پاپ سب کو لگتا ہے۔ کم از کم سرلا بہن کے جاننے والوں کا تو یہی عقیدہ تھا۔ ان کی نیکی اور پارسائی قابلِ ستائش تھی، مگر نیکی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ تو ان سے کوئی نہیں کہتا تھا کہ بابا کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول جاؤ۔ مگر عورت کے چند گُر ہیں جنہیں اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آج کل تو بر پھانسنا اکیلے ماں باپ کے بس کی بات بھی نہیں۔ اچھی شریف زادیاں بھی اب تو چڑیا خود ہی گھیرتی ہیں۔ پھر شرما کر سر جھکا کر ڈور والدین کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں۔ کوئی داغ نہیں لگتا کسی کو

پتہ بھی نہیں چلتا۔ والدین بھی سرخرو، دولہا دلہن بھی مگن۔ یوں ہو اکرتی ہیں شادیاں، مگر نہیں ہو پاتیں تو بے چاری سرلا بین جیسی مُسمُسی گائیوں کی۔ جو دنیا کے زخموں پہ پھاہار کھنے میں ایسی گم ہیں کہ اپنا کچھ ہوش نہیں۔ سب کے دکھ بانٹتی ہیں، راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتی ہیں۔ نوزائیدہ بچے ہتھیلیوں پہ جھیلتی ہیں۔ اور پھر اپنی نیم تاریک کھولی میں اٹا سیدھا نگل کر سونی کھاٹ پہ پڑجاتی ہیں۔ کوئی اتنا نہیں جو ان کی تنہائی کے رِستے ہوئے زخموں پر پھاہار کھے۔

یہ اتنا بڑا جیتا جاگتا، چنگھاڑتا بمبئی، کیا یہاں کوئی اکیلا عورت کے پیار کا بھوکا نہیں؟ کسی کو عورت کے لمس کی چاہت نہیں، سرلا بین کسی کی محتاج نہیں، اپنا کماتی کھاتی ہیں، ساری چال میں ایک نگینہ سا کمرہ ہے جو کسی فلیٹ سے کم نہیں۔ صوفہ کرسی بھی ہے اپنا الگ سنڈاس بھی۔ اب اور کیا چاہیے اس دنیا میں۔

لوگوں کا کیا ہے، کنوارے تو آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ہر دم شادی کی دعائیں، شادی کے تقاضے۔ لو بھئی شادی کر لو تو بچے کی فرمائش۔ ایک بچہ ہوا تو یہ اُلاہنے کہ اسے ہے بس ایک ہی۔ چلیے دوسرا پیدا کیجیے۔ مگر سرلا بین کو بھی یقین نہ ہوا تھا کہ وہ سدا کنواری ہی رہیں گی، کوئی تو ہوگا یہاں سے وہاں تک پھیلی دنیا میں ۔۔ کوئی ایک اللہ کا بندہ جسے خدا نے ان کی زندگی کا حصّہ دار بنایا ہوگا، یہ اور بات ہے کہ وہ اسے ڈھونڈ نہیں پاتیں۔ لوگوں کے کہنے سے انہیں اور بھی خیال آنے لگا، مگر جب بھی انہوں نے کسی کو اس خیال سے دیکھا وہ شجرِ ممنوعہ ثابت ہوا اور اپنی بیوی کی پوشیدہ بیماریوں کا رونا لے بیٹھا۔ کچھ وقت ساتھ گزارنے کو تو بہت سے تیار ملے مگر ہاتھ پکڑ کے نبھانے کے خیال سے بارات لے کر چڑھتے کا ارمان

کسی کے دل میں نہ جھانکا۔ ہاسپٹل میں بھی کبھی کسی نے گہری گہری پُراسرار آنکھوں سے انہیں نہ دیکھا کبھی کسی نے انہیں ہٹ کر راستہ دینے کی ضرورت تک نہ محسوس کی۔ لوگ دندناتے نکل جاتے اور وہ آڑی ہو کر دیوار سے لگ جاتیں۔

گام دیوی کے ناکے سے وہ روز صبح کو پونے آٹھ بجے والی بس پکڑا کرتی تھیں۔ بس میں سب ہی روز کے جانے پہچانے ہوا کرتے تھے۔ سب کی سیٹیں کچھ مقرر سی ہو گئی تھیں۔ اس دن وہ بے خیالی میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھیں۔ ایک اجنبی کو وہاں بیٹھا دیکھ کر انھوں نے لبالب بھری ہوئی بس پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بس کے بیچ میں لٹکی ہوئی رکاب پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اجنبی نے انہیں سر سے پیر تک دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جائیے" وہ رکاب پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اخبار پڑھتا رہا۔

انھوں نے پہلے تو بوکھلا کر جھٹ سے اپنا بٹوہ دبوچا کہ کہیں کوئی چور اچکا تو نہیں۔ پھر سمجھیں کسی پیشنٹ کا شوہر ہو گا اور ابھی پیروں کے ورم اور کمر کے دکھ درد کا قصہ شروع کر دے گا۔ مگر وہ رکاب پکڑے کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔ جب انہیں یقین آ گیا کہ وہ خود بھی کسی مہلک مرض میں مبتلا نہیں تو وہ سناٹے میں رہ گئیں، ایسا تو کبھی ہوتا نہیں!

مگر دوسرے دن جب پھر وہی ہوا کہ وہ بس پر چڑھیں اور اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا تو وہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گئیں مگر بڑی کسمسائیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں، جی چاہا اسے مٹھی بھر سلفا کی گولیاں ہی دے دیں۔ کہیں زخم تلاش کر کے مرکیوری کروم کا پھاہا رکھ کے سفید جھک سی پٹی باندھ دیں، مگر اس کی مکمل صحت

سے ان پر اوس پڑ گئی، ایک کھروچ تک کا نشان نہ تھا۔ وہ بس میں بے تعلق سا کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔

تیسرے دن جب یہی حادثہ ہوا تو سرلا بین کے چھکے چھوٹ گئے۔

"نگوڑے سے کاہے کو مجھے روز روز سیٹ دیتا ہے کیا تیرے اماں بہنیں نہیں کلموہے" ان کا جی چاہا اسے کسی بات پر خوب جلی کٹی سنائیں، مگر وہ ایسا بے تعلق سا کھڑا جھول رہا تھا کہ انہیں بات بے تکی سی لگی۔

جب ہفتہ بھر یہی دستور چلتا رہا تو سرلا بین بالکل اتھل پتھل ہوگئیں خدمتگزاریوں کی تو وہ عادی ہو چکی تھیں۔ کسی کا احسان اٹھانے کی ان میں عادت نہ تھی۔ ان کے دل پر بوجھ بڑھنے لگا۔ ڈیوٹی پر انہیں بار بار خیال آتا کہ کیا کریں۔ دوسری بس سے چلیں تو وقت پر پہنچنا ناممکن۔

سرلا بین کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دنیا سے روٹھی روٹھی رہنے لگیں۔ جیسے کوئی ان کے ساتھ سخت زیادتی کر رہا ہو۔ ان کا مزاج بڑا نازک ہو گیا، اب وہ بات بات پر الجھ پڑتیں۔ بے بات کے رونے لگتیں۔ ڈیوٹی سے لوٹتیں تو آنکھیں بند کر کے کھاٹ پر پڑ جاتیں، نہ کھانے کی سدھ بدھ نہ کچھ۔ کسی کو کچھ دکھ درد بھی ہوتا تو پاس آتے ڈرتا۔

"سرلا بین کو عشق ہو گیا ہے" ستو گرہ کٹ نے رام دئی کو بتایا۔

"ڈر موئے، تیری کھاٹ کٹے، سرلا بین تو دیوی ہے دیوی"

رام دئی نے ستو کی سات پشتیں تو جم ڈالیں۔

"میں جو کہہ رہا ہوں"

"کیا کہہ رہا ہے، تیرے منہ میں بھوبل۔"

مگر جب ستو گرہ کٹ نے بتایا کہ گام دیوی کے نلکے پر اس کی بزنس ہوتی ہے۔ ہر ایک کو تولنا پرکھنا، اس کی جیب کے بوجھ کو ہلکا کرنا، اس کا روز کا کام ہے۔ ایک عدد بالو روزانہ اپنی سیٹ سرلا بہن کو دے دیتا ہے اور خود کھڑا سفر کرتا ہے۔ آج سے نہیں ہفتوں سے یہ قصہ چل رہا ہے اور معاملہ قطعی پٹتا نظر آ رہا ہے۔

"ہائے میں مر جاؤں!" رام دئی نے چھاتی کوٹ لی اور دوڑی دوڑی شبو کے پاس گئی۔ شبو بھی سناٹے میں رہ گئی۔ پھر دونوں مل کر سعادت کی بہو کے یہاں گئیں۔ سعادت کی بہو منڈیر پر لونڈے کو لٹکائے اجابت کرا رہی تھی۔"

"خدا کی قدرت!" لونڈا موری میں گرتے گرتے بچا۔

پھر یہ بات آگ کی طرح ساری چال میں گھوم گئی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے،" لکشمی گھاٹے نے کہا۔ وہ ریڈی میڈ کپڑوں میں کاج بٹن بناتی تھی اور بڑی جہاں دیدہ تھی، اس کا میاں لاپتہ تھا، ایک لڑکی تھی۔ وہ اس نے مشن اسکول میں دے دی تھی، سب اسے گالیاں دیتے تھے کہ اس نے لونڈیا کو عیسائی بنوا دیا۔ لیکن لکشمی ایک کان سنتی تھی دوسرے کان اڑا دیتی تھی۔ کاج بٹن سے کہیں پیٹ پلتے ہیں؟ سب جانتے تھے، وہ راتوں کو جایا کرتی ہے، لالہ کے ڈر سے گاہکوں کو چال پر نہیں لاتی مگر کسی کو کیا؟ اس نے دارو پی کے کبھی لفڑا نہیں کیا جیسے آئے دن انیرٹری کیا کرتی تھی۔ نام اس کا ایڈتھ تھا مگر انیرٹری ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کھلے بندوں دارو کا دھندا کرتی تھی۔ لالہ کو ڈٹ کر بخشیش دیتی تھی۔ پولیس سے بھی ہفتہ مقرر تھا۔ کوئی اس کے منہ نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ وہ آئے دن دارو چڑھا کر

انگریزی میں گالیاں بکا کرتی تھی۔ کم سے کم چال والوں کا تو یہی خیال تھا۔ کئی بار لکھنؤ میں آچکی تھی، اور سرلا بین کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے اس کی نیا پار لگائی تھی چال میں کئی آبرو باختہ عورتیں رہتی تھیں، مگر کسی کو طعنے دینے اور اعتراض کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی رگ دبتی تھی۔

"تو بیاہ کیا چال میں ہی رچے گا۔"

"اور کیا؟ سامنے کے میدان میں تنبو تن جائے گا۔ بمبئی میں تو بڑی بڑی شادیاں تنبو تان کے کی جاتی ہیں۔" شبو نے فیصلہ کیا۔

"ہائے مزہ آوے گا۔ اپنی سرلا بین دلہن بنے گی۔" رام دئی کو شادیوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر موسم میں نئی شادی رچاتی تھی۔ کچھ دن بعد دولہا اس کی ٹھکائی کر کے کبھی کبھی کپڑے لتے تک چرا کے بھاگ جاتا۔ ابھی پچھلی شادی تو اس نے باقاعدہ کی تھی۔ تنبو تاننے میں بہت خرچہ آتا اس لیے بس کھولی ہی میں پنڈت لوہے کی انگیٹھی جیسا ہون لے کر آگیا اور پھیرے ڈال دیئے۔ رام دئی خوب سج کر دلہن بنی۔ چالی پر عجیب عروسانہ موڈ چھا گیا۔ خوب سی مہندی گھول کر سب نے تھوپی۔ ٹین بجا کر فلمی گانے گائے گئے رخصتی کے وقت جو ہاتھ لگ گیا رام دئی اس کے گلے لگ لگ کر روئی۔ ہائے میرا بیرن۔ ہائے میرا بابل، ہائے مجھے مت اپنی ڈیوڑھی سے نکالو۔" وہ کسی فلمی سین کی یاد میں چنگھاڑتی رہی۔ پنواڑی نے تیز تیز آواز میں گراموفون لگا دیا "کاہے کو بیاہی بدیس"، گو نہایت سر بٹ چنچناتی آواز میں بے حد بے سری عورتیں گا رہی تھیں مگر یہ کم بخت گیت ہی کچھ ایسا ہے کہ جی بھر آتا ہے۔ بیٹی کی رخصتی کا سماں بھی عجیب ہوتا ہے۔ حالانکہ رام دئی رخصت نہیں ہوئی۔ اس کا بھینگا دولہا بھی بیاہ کر

چال ہی میں آگیا۔

کئی دن رام دئی شرمائی لجائی پایل بجاتی پھرتی رہی۔ پھر دولہا نے اس کی پٹائی شروع کردی۔ روز دارو پی کر ہڈیاں توڑتا مہینے بھر کے اندر اندر وہ اس کے چاندی کے کڑے اور ناک کی لونگ لے کر بھاگ گیا۔ رام دئی تھوڑا سا بڑا اسجائے کئی دن تک لنگڑاتی رہی اور اس کی جان کو کوستی رہی۔

ان تلخ تجربوں کے باوجود لفظ 'شادی' سے رام دئی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے۔ اپنے علاوہ بھی کسی کی شادی ہو تو مضائقہ نہیں، موقع خوشی کا ہے۔

ڈرتے ڈرتے سرلا بین کو چھیڑا گیا۔ اور جب وہ ذرا جھینپ گئیں تو بس دھر لیا گیا۔

"سرلا بین بیاہ کر ڈالو"

"ہاں جی یہی عمر ہے کھیلنے کھانے کی"

"تمہارے ماتا پتا کی آتما کو بھی شانتی ملے گی"

"ہائے رام، ہم تو خوب ہلچل مچائیں گے"

"چوک میں تنبو تنے گا"

"دولہا گھوڑے پر چڑھ کے آوے گا"

"سرلا بین گھونگھٹ کاڑھو گی؟"

"اے بھلا کیوں نہ کاڑھیں گی، کہیں بنا گھونگھٹ کے دلہن بنی ہے" رام دئی نے رائے دی، وہ اس لائن میں ایکسپرٹ مانی جاتی تھی۔

"ہائے چال سونی ہو جائے گی"

"سعادت کی بہو کا بچہ کون جنائے گا؟" ہر سال سعادت کی بہو کو سرلا بہن کی خدمات کی ضرورت پڑتی تھی۔

"سوت نہ کپاس کولھو سے لٹھم لٹھا" سرلا بہن چڑ گئیں "کس نے کہہ دیا تم سے شادی بیاہ کا؟"

اے ہے تو پھر روز بس میں سیٹ کیوں دیتے ہیں؟" شبو تنتنائی۔

"یہ تو ان کی بھل منساہت ہے" سرلا بہن نرمی سے مسکرائیں۔

"اے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، آج سیٹ دیتے ہیں۔ کل دل بھی دیں گے" سعادت کی بہو نے گود کے لونڈے کو کوہلے پر ٹھسک کر فیصلہ کیا، اس پر سب چہک اٹھیں۔

ان پیاری پیاری باتوں سے سرلا بہن کی آنکھوں میں بھی خواب جھوم اٹھے۔ انہیں ان مدقوق، آبرو باختہ حرافہ عورتوں پہ پیار آگیا۔ دل شکر گزاری کے احساس سے لبریز ہو گیا۔

"اب کی بار دودھ کم اترنے کی تو شکایت نہیں" وہ بات بدلنے کو ایک دم نرس بن گئیں۔

"ابھی تک تو نہیں" سعادت کی بہو منمنائی۔

"اور دیکھ ایڈتھ، اب کے اگر کچھ لفڑا ہوا تو کسم سے پولیس میں دے دوں گی۔ لوپ کیوں نہیں لگوا لیتی"

"بابا وہ لوگ ہسبینڈ کا نام پوچھتے" ایڈتھ بھنائی۔

"اینڑی صدیک بابو کا نام دیدے" رام دئی نے مشورہ دیا۔

"بٹ، ہم کیتھولک ہے وہ لچا..."

"تو سرماجی کا نام دید سے۔"

"چپ رہو چڑیلو۔" سرلا بین نے سب کو ڈانٹا۔ اور سعادت کی گود کے لونڈے کو چپ کرنے کے لیے چمچہ بھر سیرپ اسے چٹا دیا۔

"دور ہو یہاں سے۔"

"پہلے یہ بتاؤ شادی کب ہوگی۔" شبو اڑ گئی۔

"ہاں تاریخ مقرر ہو جائے۔" لکشمی نے مطالبہ کیا۔

"کس کی شادی؟ کیسی تاریخ؟ کوئی بات نہ چیت۔" سرلا بین بگڑ گئیں۔

"بات نہ چیت، یہ کیسے؟ کیا دولہا گونگا ہے؟" قہقہہ پڑا۔

اور پھر سب نے بوکھلائی ہوئی سرلا بین کو سمجھایا کہ ان کی ڈھیل سے ہی یہ ہڑرا ہوا ہے کہ ان جیسی گنونتی کنواری بیٹھی ہے۔ مرد کی ذات تو کھلوا ہوتی ہے، جب تک منہ میں نوالہ نہ ٹھونسو بات نہیں بنتی۔ سب سرلا بین کے بہی خواہ ہیں، دشمن نہیں کہو تو اپنی جانیں بھی تمہارے لیے دے دیں۔ یہ چڑیا اب ہاتھ سے نہ جانی چاہیے۔

"کہو تو ان سے بات کرنے کو بولوں۔" سعادت کی بہو نے پوچھا۔

"ارے ہم خود بات کرنے کو تیار ہیں ان سے کہ بابا لڑکی پسند ہے تو ایسا بات کرو۔" مگر رام دئی کی اس رائے سے سب کو اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسے مردوں کو پھانسنے میں ملکہ حاصل ہے مگر کم بدبخت کو شادی کا چسکا پڑ چکا ہے، اگر امانت میں خیانت کر گئی تو؟ نہ بابا رام دئی سے اللہ بچائے۔"

"شاید بے چارے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ رعب داب کے کپڑے پہنے چشمہ

چڑھا کے جاتی ہیں وہ سوچتے ہوں گے میٹھی نظر سے دیکھا اور جوتے پڑے" شبو نے تشخیص کی۔

"کپڑے لتے کا اثر تو پڑتا ہے۔"

"ڈیوٹی کی اور بات ہوئی۔ پر یہ ہر گھڑی ڈاکٹرنی بنی رہویں ہیں۔"

"عورت کو کچھ سنگار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ارے یہ مکھڑا اس پر میک اپ ہو تو قسم سے سُری ماں کے چھکے چھوٹ جائیں۔"

"اور کپڑے بھی بھڑک دار ہوں۔"

"تھوڑا بہت تیل پھلیل۔"

"ہاتھوں میں چوڑیاں۔"

"کانوں میں آویزے۔ پھر دیکھتے ہیں بابو جی کہاں جاتے ہیں۔"

سرلا بہن نے اس وقت تو سب کو جھڑک دیا، مگر سوچ میں پڑ گئیں۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔ بمبئی میں ایک سے ایک بھڑک دار عورت گھومتی ہے۔ سوتی، سادی عورتوں پر نظر ہی نہیں ٹکتی۔ جیسا موقع ویسا بھیس۔

مگر ان کے پاس تو سادی سوتی کتّی کی ساڑیاں تھیں۔ دو چار بدرنگ سی کناڈ کی ہوں گی۔ گلے میں تاری زنجیر تو پڑی ہی رہتی ہے۔ اگرچہ اسے زیور کہنا زیادتی ہے، ماں کی یادگار ہے۔

رات کے سناٹے میں ان کے دماغ میں رنگ برنگے کپڑے اور زیور تھرکتے رہے۔

"شاید بیاہتا ہے۔" دوسرے دن شبو نے فکرمند ہو کر کہا۔

"نہیں بیاہتا ہے تو نہیں۔"

"کیسے معلوم؟"

"بس میں کوئی دوست ملے تو پوچھ رہے تھے، کمرہ ملا۔ وہ بولے، ہاں ملا۔ کہنے لگے اب شادی کر ڈالو"

"پھر کیا بولے" رام دئی قریب کھسک کر بولی۔

"ہنسنے لگے"

چلو ادھر سے تو اطمینان ہوا۔ ذات کے تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں، بیگ پر رام سروپ بھٹناگر لکھا ہے۔ وہ تو پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔ بس پھر کیا بات رہ گئی ہے جو ٹال مٹول کر رہی ہو؟"

"منہ سے جو نہیں بولتے"

"کچھ میٹھی نظروں سے کہتے ہوں گے؟"

"نہیں" جو کہتے بھی ہوں گے تو سرلا بہن کے کاہے کو پلّے پڑے گا۔ رام دئی ہوتی، ایڈ بھتہ ہوتی، شبہ ہی ہوتی تو فٹ سمجھ جاتی وہ دن میں باورچی مٹھی میں ہوتے۔

"ٹھنڈی سانس بھری"

"نہیں"

"توبہ! مردوا کون سی مٹی کا بنا ہے" سعادت کی بہو بگڑ گئیں بڑی کائیں کائیں کے بعد طے ہوا کہ سرلا بہن دور اندیشی پہ تیار ہوں۔ تیز تفنگ سے لیس ہو کر منہ میں نوالہ دیں۔ تب ہی نیا پار لگے گی۔

بس اسی کل دن عورتیں اپنے اپنے ترکشوں سے سامان نکال نکال کر سرلا دیوی

کی کمک کو پہنچنے لگیں۔ شبانہ کبھی فلموں میں ایکسٹرا کا کام بھی لے لیتی تھی۔ وہ وہاں سے نہ جانے کیا کیا الّم غلّم لایا کرتی تھی۔ مسز لین اسنو تو سعادت کی بہو کے پاس بھی سال بھر پرانی پڑی تھی۔ ایڈتھ کے پاس تو تمام اسمگل کیا ہوا کاسمیٹک تھا۔ وہ ایک ہیئر ڈریسر کو بھی جانتی تھی اور خود بھی فسٹ کلاس غبارے سے نما اونچے توتنی جیسے بال بنا لیتی تھی۔ اس کے پاس ایسے ایسے چھوٹے بڑے کیڑے سے تھے جو اگر کھیچی کو پہنا دو تو بنت کا قرین جائے۔

بس سب کی سب مرمت پر جٹ گئیں۔ سرلا بین نے بہت "نانہ" کی مگر شبو نے اپنی پیازی نائیلان جارجٹ کی ساڑھی، جس پر سیکوئنس کا کام بنا تھا انہیں پہنائی۔ بلاؤز پر بہت جھگڑا اٹھا۔ اشبو کہتی تھی تازہ ترین فیشن کے مطابق سرخ بلاؤز اور سرخ پیٹی کوٹ ہونا چاہیے، نیچے سے جب کا مارے گا اور لال ہی سینڈل ہوں تب آئے مزہ، سرلا بین نگوڑی کو نہ فیشن کا پتہ نہ میچنگ کے راز معلوم ان کے ہاتھوں میں کھیل بنتی رہیں۔

منہ پر پہلے کریمیں تھوپی گئیں۔ مع سعادت کی بہو کی ہیزلین اسنو کے جو سوکھ چکی تھی، کیونکہ وہ برا مانے جا رہی تھی۔ پھر روز اور پاؤڈر کے پلستر چڑھے خوب سا سیاہ سینٹ لے کر توتنی کی شکل کا جوڑا بنا۔ پھر زیور کی باری آئی، اس پر خانہ جنگی ہوتے ہوتے بچی، ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ اس کا چندہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

جب اونچی ایڑی کے کارچوبی سینڈل پہن کر سرلا بین بس اسٹاپ پر لہراتی ڈگمگاتی پہنچیں تو ان کی بغیر عینک کی آنکھوں میں ترمرے ناچ رہے تھے، پسینے کے شرارے چھوٹ رہے تھے۔

"کیا عورت ہونا کافی نہیں، ایک نوالے میں اتنا اچار چٹنی، مربہ کیوں لازمی ہے"
ان کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔

اور پھر اس نوالے کو بچانے کے لیے ساری عمر کی گھس گھس۔

جب تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے سرلا بین کو شتم پشتم واپس لوٹتے دیکھا تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ بغیر دولہا کے ڈگمگاتی لرزتی چلی آرہی تھیں۔ گالوں پر کاجل کی لکیریں بہاتی وہ گرتی پڑتی بچیں۔

نوالہ تھوک دیا گیا!

یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ سرلا بین سوالوں کی بوچھاڑ سے بے دم ہو کر پلنگ پر گر پڑیں۔

وہ جب بس میں داخل ہوئیں تو وہ ان سے قطعی تغافل اخبار پڑھتا رہا۔ وہ رکاب پکڑے سیٹ کے پاس کھڑی جھولتی رہیں۔ اور وہ بس کے دروازے کی طرف بار بار دیکھتا رہا، جیسے کسی کے چڑھنے کا منتظر ہو۔

انھوں نے نظروں کے سارے تیر اس کے کلیجے میں جھونک دیئے مگر وہ ان کی طرف سے منہ موڑے دروازے کو تکتا رہا۔

انھوں نے کانتا کی جھک میں لپٹا ہوا گلابی آنچل ڈھلکایا۔ مگر اس نے اخبار سے نظریں نہ اٹھائیں۔

انھوں نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ مگر اس کی آنکھوں میں مستیاں نہ لہرائیں۔ اس نے ایک بپھرائی ہوئی سی نظر ان پر ڈالی اور ان کے دھوم دھڑ کے کو بے اعتنائی سے ٹھکراتا ہوا اخبار پر جھک گیا۔

سامنے کی ایک سیٹ خالی ہوگئی اور وہ اس پر ڈھے گئیں۔ سارے تیر سنسناتے ہوئے وار خالی دے گئے اور خالی ترکش لرزتا رہا، کانپتا رہا۔

ڈرتے ڈرتے انھوں نے اپنی سیٹ سے مڑکر دیکھا، وہ بس سے اتر کر جا رہا تھا۔ اترتے وقت اس نے بس اسٹینڈ پر دھندا چلاتے ہوئے سنو گرہ کٹ سے پوچھا۔ "کیوں رے باجی آج سر لا دیوی نہیں آئیں؟"

سنو گرہ کٹ ہکلاتا رہ گیا، اور اجنبی لمبے لمبے ڈگ بھرتا سامنے گلی میں گم ہوگیا۔

("فنون" لاہور)

پورا جوان

آنکھوں میں کاجل کی گھٹا، لب، لعلِ بدخشاں، گال گلابستان سرتا پا موسمِ بہار کی آمد آمد۔ یہ تھی مہندری، وہ کبھی بچپن کو الوداع کہتی دکھائی دیتی اور کبھی اسی بچپن کو گلے لگاتی نظر آتی کبھی وادیٔ شباب میں محوِ خرام، اور کبھی طوفانِ شباب سے بدکتی ہوئی سی لگتی۔ غرض یہ کہ وہ بچپن اور جوانی کی حدِ فاصل پر کسی بھٹکی ہوئی ہرنی کی طرح وحشت زدہ سی رہتی تھی۔

سوہنے کو مہندری سے عشق تھا، مہندری کو سوہنے سے محبت تھی، لیکن سوہنا اپنی من موہنی کو نہیں پا سکتا تھا، اور مہندری اپنے من موہن کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

ان کے راستے کی چٹان کابلا سنگھ تھا۔

ایک صبح سوہنے نے اپنے چچا کا گھوڑا مانگا اور منزلیں مارتا ہوا اٹھارہ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب وہ سائی والا نام کے گاؤں کے باہر کابلا سنگھ کے کچی اینٹوں کے بنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ سوہنے کا اصلی نام بلکار سنگھ تھا۔ لیکن وہ اتنا حسین تھا کہ لوگ اسے سوہنا (خوبصورت) کہنے لگے، اس کے حسن نے علاقے کی حسین ترین لڑکی کا دل موہ لیا تھا، لیکن اس کے باوجود کس قدر مجبور اور

بے دست دیا تھا۔

اس کا گھوڑا بے دم سا ہو کر نتھنے پھڑپھڑا رہا تھا۔ پسینے کی وجہ سے اس کی جلد گیلی مخمل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ خود سوار کے چہرے پر پسینے کے موتیوں کی بارش ہو چکی تھی، اس کا سُرخ سپید چہرہ، جو ابھی باقاعدہ داڑھی اور مونچھوں سے بَری تھا، تمتمایا ہوا تھا، اس کی تیز آنکھیں گھوم پھر کر کابلا سنگھ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے پہلے کبھی اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ اُتا پتا پوچھتا وہ مکان تک پہنچ گیا۔ مکان کے باہر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ سوہنا کو معلوم تھا کہ کابلا سنگھ کے تین بچے موجود تھے۔ لیکن اس نے بچوں سے ان کے باپ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کابلا سنگھ کے پڑوس میں ایک سا ہنسی رہتا تھا۔ (سا ہنسی وہ لوگ ہوتے تھے جو کتوں کو ساتھ لے کر جنگلی بلّوں کا شکار کھیلتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ وہ بلّوں کو کھا بھی جاتے تھے!) اس وقت ادھیڑ عمر کا سا ہنسی اپنے صحن کی چھوٹی سی دیوار پر بیٹھا حقّہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے پٹے اس کی گدّی تک پہنچتے تھے اور ان میں تین چوتھائی چاند کی شکل کا کنگھا پھنسا ہوا تھا۔ سوہنے نے اس کے قریب پہنچ کر ابرو سے پڑوس والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کابلا سنگھ اسی مکان میں رہتا ہے؟"

سا ہنسی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر اس کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا "آہو۔"

"وہ گھر میں ہے کیا؟"

"نہیں، صرف اس کے بچے ہیں — وہ بھی اب آتا ہی ہوگا۔"

ساہنسی کی بات ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور سنائی دیا، ساہنسی نے حقّے کی نے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "لو! وہ آگیا۔"

قریب آکر گھوڑا ایک پھیریاں لینے لگا۔ دھول کے بادل بلبلا کر اس کی ٹاپوں کے نیچے سے نکل ادھر اُدھر اڑنے لگے۔ اسی کیفیت میں سوار نیچے اتر پڑا۔ سوہنے نے اسے بغور دیکھا، اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ سینہ چھاج کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ کمر کا حلقہ اب بھی مناسب حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ٹانگیں لمبی اور سڈول تھیں۔ چہرے کا رنگ ایسا تھا۔ جیسے کسی لق و دق صحرا میں سورج ڈوبنے کے بعد تاریکی پر پھیلا رہی ہو۔ صرف آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ مجموعی اعتبار سے وہ ناگ راج کی طرح حسین اور پرکشش تھا۔

کابلا سنگھ گھوڑے کی لگام تھامے اپنے احاطے میں داخل ہوگیا۔ ساہنسی نے دور سے پکار کر کہا۔ "کابلا سنگھ! تم سے یہ لڑکا ملنے کے لیے آیا ہے۔"

کابلا سنگھ نے اس کی بات بظاہر سُنی اَن سُنی کر دی۔ اس نے احاطے کے کونے میں کھپریل کے نیچے والے بانس سے بندھی ہوئی رسّی کا پھندا گھوڑے کی گردن میں ڈال دیا۔ اس وقت تک گھوڑے پر سوار سوہنا اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

کابلا سنگھ نے کمر سے پٹکا کھول کر اس سے اپنے جوتے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "کہو کیا بات ہے؟ کیسے آئے ہو؟"

"میں آیا تو ہوں تمہارا گھوڑا توڑنے کے لیے۔۔۔"

کایلا سنگھ نے اس کی طرف پیٹھ پھیر دی۔ اور کچھ رک کر بولا "تو؟"

سوہنا گھوڑے سے اتر پڑا اور تیز لہجے میں کہنے لگا۔ "لیکن مجھے چار پانچ سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس وقت تمہارا اکھوپڑا توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"چار پانچ سال کے بعد کیا ہوگا۔؟" یہ کہتے ہوئے بھی کایلا سنگھ نے اس کی طرف ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔

اس کی اس بے اعتنائی سے سوہنے کا چہرہ اور بھی تمتما اٹھا اس نے کہا۔ "اس وقت تک میں پورا جوان ہو جاؤں گا۔"

"یعنی بالغ ہو جاؤ گے۔"

سوہنا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ گھوڑے سے اتر کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "میں نے سنا ہے کہ کسی زمانے میں تم نے علاقے بھر میں تہلکہ مچا رکھا تھا؟ اب بھی تمہاری دھاک ہے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ تم اپنی دھاک کا اس قدر ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں آتے۔"

کایلا سنگھ نے اس کے گھوڑے کی کاٹھی پر کہنی ٹیک دی۔ اور اس کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھنے لگا۔ سوہنا اس کی اس کیفیت کو سمجھ گیا، اور اگلی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش کرنے لگا۔

گھوڑے کی پیٹھ کے اوپر سے پرلی طرف کو تھوکتے ہوئے کایلا سنگھ نے کہا۔

"چار پانچ سال کے بعد جب تم پورے جوان ہو جاؤ گے تو مجھے امید ہے کہ اس وقت تمہاری عقل اس قدر کچی نہیں رہے گی۔"

سوہنے نے اس کی اس چوٹ کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ اسے تو صرف اپنی بات

کہنے میں دل چسپی تھی "تمہاری پہلی بیوی مر چکی۔ اب تم کو اپنا گھر بسانے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے .... اور تم نے مہندری کا ہاتھ اس کے باپ سے مانگا ہے ...."

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہی نہیں، مہندری کا باپ بھی اس بات پر راضی..."
اس کی آواز ایسی تھی جیسے کہیں بہت دور سے بادل گرج رہا ہو۔

اس پر سوہنے نے اپنے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور جھٹکے سے آگے بڑھا تو کھتی کے پیچھے سے سہارا ہٹ جانے کے باعث کابلا سنگھ ہلکا سا غوطہ کھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سوہنا گھوڑے پہ سوار ہو گیا اور منہ میں کف بھر کر بولا۔ "اب تم انتظار کرو۔ میں بھی انتظار کروں گا۔ تین ۔ چار۔ پانچ برس کے بعد میں ایک روز آؤں گا.... اور تمہارا سر کاٹ کر لے جاؤں گا"

یہ کہہ کر سوہنے نے گھوڑے کو ایڑ دی گھوڑا پہلے سمٹا اور پھر بپھر کر بہ یک جست ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

جب تک گھوڑ سوار نظر آتا رہا۔ کابلا سنگھ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

جس تیز رفتاری سے سوہنا سائی والا پہنچا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ وہ واپس لوٹا۔ پھر بھی اپنے گاؤں تک پہنچتے پہنچتے دن ڈھل گیا۔

مہندری اسے گاؤں کے باہر ہی مل گئی۔ وہ نہ جانے کب سے اس کے انتظار میں تھی۔ حسب معمول سوہنا مہندری کی گہری آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، کہنے لگی "تم گاؤں سے نکل کر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد

کابلا سنگھ یہاں آپہنچا۔ وہ شادی کی بات پکی کرنے آیا تھا۔"
"تو بات پکی ہو گئی؟"
"ہاں۔" وہ جھینک کر بولی۔
سوہنا سوچنے لگا کہ عورتیں بھی کس قدر طوطا چشم ہوتی ہیں۔ کیسی دیدہ دلیری سے بات پکی ہو جانے کا اعتراف کر رہی ہے۔
وہ گھوڑے سے اُتر چکا تھا۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اور وہ لگام ہاتھ میں لیے دھیرے دھیرے چچا کے مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔
مہندری نے بیان جاری رکھا۔ "میں گھبرا گئی۔ تم گاؤں میں نہیں تھے اور وہ بات پکی کرنے آپہنچا تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت سے کام لے کر ابگ سے کابلا سنگھ کو سب کچھ بتا دیا۔ میں نے تمہارے بارے میں بھی سمجھا دیا۔ اسے اس بات کا احساس کرا دیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی ... کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دئے کہ تمھیں تو اور بھی لڑکیاں مل جائیں گی لیکن مہندری کو سوہنا اور سوہنے کو مہندری نہ مل سکے گی۔..."
سوہنے کے قدم رک گئے۔ "پھر؟"
مہندری بچگانہ چاؤ سے بولی "سوہنے! وہ جتنا باہر سے تنا آور ہے اتنا ہی قدآور بھیتر سے بھی نکلا۔ میری باتیں سن کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا کہ اسے ان سب باتوں کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ سیدھا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ میرا چاچا (باپ) اس کے پیچھے گیا۔ گھوڑے کی ایک رکاب میں پاؤں جما کر اس نے چاچا کی طرف دیکھا اور بولا "سردار جی! میں نے مہندری اور سوہنے کی شادی پکی

کردی ہے۔ اب آپ بیاہ کا انتظام کر ڈالیں تو بہتر رہے گا۔"

سوہنا دم بخود رہ گیا۔ مہندری نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا۔ "جب تم اس سے ملے تھے، تو اس نے کچھ نہ کچھ تو بتایا ہوگا؟"

سوہنا افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ آکاش پر اکا دکا تارا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ بوجھل آواز میں بولا "نہیں۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

جب سے کابلا سنگھ کی عورت مری تھی اس کے گھر کا کھانا ایک جھری تیار کرتی تھی۔ کابلا سنگھ کی عادت تھی کہ صبح داتن منہ میں ڈال کر کلہاڑے سے ایندھن کے لیے دو چیلر لکڑیاں پھاڑ ڈالتا تھا۔ آج صبح بھی وہ دانتوں میں داتن دبائے اور ہاتھ میں کلہاڑا اٹھائے احاطے میں پڑے ہوئے موٹے موٹے لٹھوں کی طرف بڑھا۔ اسے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کے اپنے ٹٹو کی آواز نہیں تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سوہنا گھوڑے سے اتر رہا تھا۔

کابلے نے اس کی طرف حسبِ عادت توجہ نہیں دی۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر تھوک کر اس نے کلہاڑا ہوا میں اٹھایا اور پھر کلہاڑا لٹھ میں پیوست ہو گیا۔ اس نے دستے کو ہلا جلا کر بھاری آواز میں کہا "سوہنے معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک رات ہی میں پورے جوان ہو گئے ہو۔ مجھے چار پانچ سال تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔"

چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔

ایک دم سوہنے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "ہاں کابلا سنگھ! میں ایک رات ہی میں پورا جوان ہو گیا ہوں۔"

"شمع" دہلی

محمد خالد اختر

LIE DOWN, LIE DOWN YOUNG YEOMAN,
THE SUN GOES DOWN TO THE WEST.
THE ROAD ONE TREADS TO LABOUR
WILL BRING ONE HOME TO REST
AND THAT WILL BE THE BEST

A. E. HOUSMAN.

یہ خزاں کی ایک پیلی اُداس شام تھی ۔ ہم تین دوست ـــ احسان، ثناء الحق اور میں مقامی میونسپل پارک میں ایک بنچ پہ بیٹھے زرد پتّوں کو ہوا میں کھڑکھڑاتے اور اُڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے ۔ وہ باغ کے قطعے میں سونے کے سکّوں کی طرح ہر سو بکھرے پڑے تھے ۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی آخری اُکتی ہوئی کرنیں لمبے درختوں میں سے چھنتی ہوئی ہمارے بنچ پہ اپنی مرتی ہوئی دمک پھینک رہی تھیں ۔

شام کی اداسی ہمیں چھونے لگی ۔ احسان اور میں ہم عمر اور ہم جماعت تھے ۔ مقامی کالج میں سیکنڈ ایر کے طالب علم ۔ ثناء الحق ہم سے دو تین سال بڑا تھا اور بی ۔ اے فائنل میں پڑھ رہا تھا ۔ ایک سینئر ہونے کی حیثیت میں ہم اسے قدر اور عزت سے

دیکھتے۔ وہ ایک چھریرا، دراز قامت، خوبصورت نوجوان تھا۔ صحیح معنوں میں جوانِ رعنا، رنگ سرخی کی لہک لیے، آنکھیں نشیلی اور بڑی، ستواں ناک، قلمیں نیچے وکٹورین وضع میں کانوں کی کونک آتی ہوئی۔ ہم کالج میں آکر پتلون کوٹ پہننے لگے تھے مگر نثار الحق ہمیشہ اپنی اچکن، اونچے شملے کی پگڑی اور اپنے گاؤں کے موچی کی سلی ہوئی طلے کی جوتی میں چلتا نظر آتا۔ وہ سج سج کر ایک شاہزادے کے وقار سے چلتا اور فی الواقع کہانیوں کا شہزادہ لگتا ـــــ ان البیلے جوانوں میں سے ایک جن کے لیے لڑکیاں آہیں بھرتی ہیں اور غم محبت میں جلتی ہیں۔ نثار الحق ایک مضبوط کردار کا نوجوان تھا۔ ہاں اسے اپنے آپ سے کچھ محبت تھی ـــ اور اٹھتے ہوئے شباب کے کس لڑکے کو نہیں ہوتی؟ اس کی باتوں میں واقعی پھولوں کی سی باس تھی اور ایک موہنے والا سبھاؤ اور زندگی کا سوز و ساز ـــ اور جب وہ موج میں ہوتا تو اپنے ہوسٹل کے بستر پر بیٹھا پہروں ایسی باتیں کرتا رہتا جو سننے والے کے دل کو مسحور اور بے چین کر دیتیں۔ وہ ہر طبقے اور ہر عمر کے شخص سے آسانی سے گھل مل جاتا اور اسے اپنا دوست بنا لیتا۔ احسان اور میں ابھی معصوم الھڑ گدھے تھے۔ نثار الحق زمانے کا سرد گرم چشیدہ تھا اور وہ ہمیں اپنے انسانی نفسیات کے وسیع علم سے ششدر کر دیتا۔

اس شام وہ بالکل خاموش تھا اور ہوسٹل سے یہاں تک چلتے ہوئے اس نے ایک بھی بات نہ کی تھی۔ اس خاموشی پر ہم نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی بہترین گفتگو کے فوارے ہوسٹل کے کمرے میں اس کے بستر پر سے چھوٹتے تھے اور باہر چلتے ہوئے وہ اکثر چپ ہو جاتا اور کسی گہرے خیال میں کھو جاتا۔ پھر اس کی زبان کی بجائے اس

کی بڑی بڑی آنکھیں کام کرتیں اور وہ ایک پیدائشی جاسوس کی طرح زندگی کی رنگارنگی کو چپکے سے دیکھتا رہتا۔

احسان ان دنوں اس منزل میں تھا جب کسی کی محبت میں گرفتار ہونے کے لیے جی بے قرار ہونے لگتا ہے۔ دراصل اس عمر میں ہماری امنگیں سچی اور بےباک نہیں ہوتیں اور ہمارے جذبات خود اپنی ہی ذات میں مرتکز ہوتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بے مثل سمجھتے ہوئے ایک اونچی خود رحمی سے خدا کی دھرتی پر پھرتے ہیں۔ احسان نے کالج کی لائبریری میں آسکر وائلڈ کی کہانیوں کی ایک کتاب لے کر پڑھی تھی اور یہ متلا دینے والی میٹھی جذباتی کہانیاں اس کے دماغ میں تیز شراب کی طرح چڑھ گئی تھیں۔

"آسکر وائلڈ سب انگریز لکھنے والوں میں میرا محبوب ہے۔ اوہ! اُس کی "ڈی پروفنڈس" اور — وہ "گلاب اور بلبل کی کہانی"۔" احسان بولا۔

وائلڈ مجھے ان دنوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا — جھوٹے جذبات اور ذہین ضلع جگت کی ظرافت جو جلد باسی ہو جاتی تھی۔ وہ میری پسند کا مصنف نہ تھا اور میں احسان سے اس معاملے پر جھگڑنے لگا۔ احسان نے کہا کہ تم محبت کے جذبات سے کبھی آشنا نہیں ہوئے اور اس لیے آسکر وائلڈ کی خوبصورتی کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس پر ہم میں تُو تُو میں میں ہو گئی اور ہمارے مزاج برہم ہو گئے۔

نثار الحق اس دوران میں اپنے پراسرار طریق پر مسکراتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا دماغ آسکر وائلڈ اور ہماری بحث سے ہزار میل دور ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اس نے وائلڈ کو نہیں پڑھا تھا۔ اور اگر طوعاً وکرہاً پڑھتا بھی تو بھی اس سے کچھ حاصل نہ کرتا۔ وہ کتابوں کے زیادہ پڑھنے پر یقین نہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ٹیگور کی گیتانجلی

کے انگریزی ترجمے کو اس نے بیسیوں بار پڑھا تھا اور اس کے کئی بند اسے ازبر تھے۔

جب احسان اور میں خوب لڑ چکے تو ہم برہمی کے انداز میں ایک دوسرے کو بیوقوف سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف شدید نفرت تھی اور آنسو تقریباً ہماری آنکھوں میں رکے ہوئے تھے۔ شام اب گہری ہونے لگی تھی اور نیلا جھٹ پٹا درختوں کی چھدری ویران ٹہنیوں میں پھیلنے لگا تھا ایک چھپاکی باغ کے کونے میں سے بولنے لگی "تو وت۔ تو دو"۔

ثنارالحق نے کہا "کیا تم ایک سچ مچ کی کہانی سنو گے؟"

"ہاں! ہاں!" میں نے کہا۔ "سناؤ"

احسان کا چہرہ بھی چمک اٹھا "ثنارالحق ضرور سناؤ کہانی"۔

ثنارالحق نے اپنی بڑی آنکھوں سے دور درختوں کے دھندلکوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا سنو۔ یہ کسی کتاب کی کہانی نہیں۔ یہ وہ کہانی نہیں جسے آسکر وائلڈ یا کسی اور نے گھڑا یا لکھا ہو۔ یہ ایک عام انسان کی کہانی ہے جسے قدرت نے خود اپنے قلم سے اڑتی ہواؤں میں لکھا۔ اس میں ایک سادگی اور ہمہ گیری ہے اور یہ ہر ایک کی کہانی ہو سکتی ہے۔ تمہاری یا میری۔ تم کہو گے کہ ہمارے مزاج اور طبیعتیں اور ستارے مختلف ہیں مگر حقیقتاً ایک ہی نوع کے حادثات ہم سب کو پیش آتے ہیں اور وہ ایک ہی سڑک ہے جس پر ہم اپنی منزل کی جانب سفر کرتے ہیں ......"

ثنارالحق کچھ رکا ۔۔۔ گہرے استغراق میں احسان اور میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

باغ میں اب مکمل سناٹا تھا ــــ گاہے گاہے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی جھینگر اور رات کے رفیق کیڑے اپنی مدھم مستقل الاپ سے سناٹے کو معمور کیے ہوئے تھے۔

"غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے" ثنار الحق بولا۔ "میری عمر اس وقت کوئی ساڑھے پانچ برس کی ہوگی۔ میرے والد ان دنوں شجاع آباد میں نائب تحصیلدار تھے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کی رخصت ضرور لیتے اور اسے اپنے آبائی گاؤں کھوہار میں گزارتے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک دیہاتی سفید پوش کی طرح۔ سر پہ صافہ لپیٹے اور لٹھے کی چادر باندھے گاؤں کی گلیوں میں چلتے اور اپنے چوبارے کی بیٹھک میں دیہاتیوں کے مسئلے مسائل سلجھاتے۔ شجاع آباد میں تو وہ بالکل رعب داب والے سرکاری افسر ہوتے۔ ہمیشہ جامہ زیب، چست اور کوڑے کی طرح کڑکدار۔ یہاں گاؤں میں آکر اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ وہ بالکل بدل جاتے۔ ان کا ہی جیسا سادہ لباس پہنتے اور ویسی ہی پرسکون دیہاتی زندگی گزارتے۔ نائب تحصیلداری کی فوں فاں اور ٹیپ ٹاپ شجاع آباد میں ہی رہ جاتی۔ میرے دادا تب بقیدِ حیات تھے۔ ان کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوتی اور جوڑا کریانہ کے چھوٹے براڈ گیج لائن ریلوے اسٹیشن پر سواری کے لیے گھوڑیاں پہنچ جاتیں۔ مجھے یاد ہے کہ گھوڑیاں سواریوں سے کہیں زیادہ ہوتیں۔ تب سائیکل ابھی دیہات میں نامعلوم تھا۔ ایک عجوبہ۔ کوئی کام کی سڑکیں بھی نہ تھیں۔ ہر ایک گھر میں ایک دو گھوڑیاں ضرور ہوتی تھیں اور بیشتر لوگ ان پہ ہی اپنے کاموں پہ آتے جاتے۔ ریل پلیٹ فارم پہ کھڑی ہوتی تو مراسی اور کمی ڈبے

کے پاس دوڑے آتے۔ ہم بچوں اور سامان کو اتارتے۔ گھوڑیاں ہنہناتی ہوئی مسافر خانے کے باہر بندھی ہوتیں اور سامان کے لیے ایک دو خچر جتنے بڑے گدھے ہوتے۔ میرے دادا کی ایک گھوڑی تھی۔ برف کی طرح سپید۔ امیرانہ خو بو والی۔ بڑی نخریلی اور آتشیں مزاج۔ وہ اُن کی لاڈلی تھی۔ اس کا نام ساوی تھا۔ میرے والد اس پہ بیٹھتے۔ آدھ گھنٹہ کمّیوں میں بحث ہوتی کہ کونسی گھوڑی اصیل ہے اور کونسی کھچری۔ اور جب ہم سب اصیل گھوڑیوں پر کسی ہوئی دلیسی کاٹھیوں میں بٹھا دیئے جاتے تو گاؤں کی سمت لمبے اور آہستہ سفر کا آغاز ہوتا۔ سوائے ساوی کے ہر ایک گھوڑی کی باگ آگے آگے چلتے ہوئے کمی کے ہاتھ میں ہوتی۔ کھوہار جوڑے سے چار پانچ کوس ہے مگر اس سفر میں کوس ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ دوپہر کے چلے ہم کھوہار میں گہری پڑے پہنچتے۔ جب تنگ کاٹھیوں میں بیٹھے بیٹھے ہماری کمریں درد کرنے لگتیں اور کولہے چھلنی ہونے لگتے تو یہ چھوٹا سا قافلہ سستانے اور ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے سڑک کے کنارے رک جاتا۔ اس کافی تھکا دینے والے سفر کی کچھ تلافیاں بھی تھیں۔ ڈہیانی سے آگے گزرتے ہوئے ہمیں پبّی کی نیلی پہاڑیاں نظر آنے لگتیں اور ہمارے دل اچھلنے لگتے۔ ان کی طرف بڑھتے ہوئے ایک عجیب مسرت میرے دل کو گرفت میں لے لیتی۔ دوستو! تم کیا جانو میرے دیس کی پہاڑیاں کتنی خوبصورت ہیں۔ دنیا میں ایسی پہاڑیاں اور کہیں نہیں جیسی یہ پبّی کی پہاڑیاں۔ بعض دفعہ اس سفر میں حادثے بھی ہو جاتے۔ کسی گدھے کی تنگ ڈھیلی ہو جاتی اور اس پہ دھرے ہوئے بکس اور ٹوکرے نیچے سڑک پہ لڑھک گرتے۔ تنگ کو کسنے اور اس پر پھر سے سامان جمانے میں آدھ گھنٹہ لگ جاتا اور ایک بار تو وہ گھوڑی جس پہ

میرا بھائی اور میں دونوں سوار تھے، بڑی کھچڑی نکلی۔ میرا بھائی آگے لگام پکڑے بیٹھا تھا (کن خوشامدوں سے ہم نے نورعلی میراثی کو تیار کیا تھا کہ وہ لگام ہمیں پکڑا دے) میں اس کے پیچھے ہاتھ میں ایک چابی سے چلنے والے انجن کو پکڑے بیٹھا تھا۔ یکلخت گھوڑی بدکی اور سرپٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں تو دھکا لگنے سے نیچے زمین پر آ رہا۔ اسی طرح چابی والے انجن کو ہاتھ میں پکڑے۔ مجھے تھوڑی دیر کے بعد ہی پتہ چلا کہ میں گھوڑی سے گر گیا ہوں اور پھر میں رونے لگا۔ حالانکہ مجھے ذرا بھر بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔ میرے بھائی کو گھوڑی کودتی پھلانگتی دور کھیتوں میں لے گئی اور اسے ایک کنوئیں کی منڈیر پر جا گرایا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی اور اس میں سے خون بہنے لگا۔

مگر اتنی صعوبتوں کے بعد جب ہم کھوار میں اپنے آبائی مکان میں پہنچتے تو کیسی آؤ بھگت ہماری منتظر ہوتی۔ گھر کے سب دیے روشن ہوتے اور نچلے ڈیرے میں ہماری دادی، خالائیں اور پھوپھیاں چمکتے چہروں سے ہماری بلائیں لیتیں۔ ڈیوڑھی سے گزرتے ہی دیوار کے پاس اوپلوں کی آگ پر پیتل کی مٹکی میں دودھ ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا۔ ہماری دادی ہمارے پہنچتے ہی ہمیں کڑھے میٹھے دودھ کے گلاس پلاتی۔ ہمارے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ اس کی پیشانی کو چومتی اور خوشی اور محبت سے رونے لگ جاتی۔ وہ بوڑھی اور کبڑی تھی مگر اس کے خدوخال رچیلے اور تیکھے تھے اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ وہ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت عورت تھی۔۔۔۔۔"

"ہا" ثناءالحق نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔۔۔۔" میں کھوار میں پچھلی گرمیوں

میں گیا تھا اور وہ گھر وہ گھر نہیں رہا جسے میں اپنے بچپن میں جانتا تھا۔ اب کے دیکھے میرے جانے پر نہیں چلے اور آبائی حویلی تباہ اور شکستہ حالت میں تھی۔ صرف ہمارا پرانا میراثی نور علی وہاں طویلے میں اپنی کوٹھڑی میں رہتا ہے۔ خمیدہ اور بگلے جیسے سفید بالوں کے ساتھ۔ اس کی تحکریں اور مخول بھی اب وہ نہیں رہے۔ میں بعض دفعہ سوچنے لگتا ہوں کہ وہ سب اچھے مہربان چمکتے ہوئے محبت کرنے والے چہرے کہاں غائب ہو گئے —— سب چلے گئے۔ وقت کے دھندلکے میں۔"

ثناء الحق اب خاموش ہو گیا، شاید گئی گزری چیزوں اور ہستیوں کو یادوں کے پردے پر دیکھتا ہوا۔ ایک بڑا زرد سا چاند درختوں کی اوٹ میں سے طلوع ہو رہا تھا اور اپنی آسیبی دمکاہٹ سے ٹہنیوں اور پتوں میں ضیا پاشی کر رہا تھا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور زرد یائے خزاں کے پتے ہماری طرف تیرتے ہوئے آئے، "میرا دماغ غیر حاضر ہو جاتا ہے اور میں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہوں۔" ثناء الحق بولا "میں کیا کہہ رہا تھا؟"

احسان اور میں مسکرائے۔ یہ ہمارے دوست ثناء الحق کی پرانی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ ایک واقعہ بیان کرنا شروع کرتا اور پھر بات سے بات نکل آتی اور وہ دُور بھٹک جاتا۔ یوں اصل واقعے کا سرا کھو جاتا اور ہم اس کی ان طولانی "ڈائی گریشنز" (DIGRESSIONS) ہی کی وجہ سے اس سے محبت کرتے تھے۔ اگرچہ ہم بھی کبھی کبھی غیر حاضر دماغ اور نیم خوابیدہ سے ہو جاتے اور قطعاً بھول جاتے کہ وہ ہمیں اصل میں کونسا واقعہ بتانے چلا تھا۔

"بولتے جاؤ میک ڈف" میں نے کہا "رات ابھی جوان ہے۔ ویسے تم

ہمیں اپنی اور ایک انسان کی کہانی سنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"ہاں دوستو! اس بہک جانے کے لیے مجھے معاف کرو" ثناء الحق ہنسا۔ میں اب اپنی کہانی سے نہیں بھٹکوں گا ـــ اگر میں بھٹکوں تو تم میرے کان کھینچ سکتے ہو اس طرح میں پھر سیدھی ڈگر پر آجاؤں گا ..... ہاں تو اس ۱۹۲۵ء کے سال میں ہم اپنے والد کے ہمراہ کھوہار میں آئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ڈیوڑھی میں کھڑا لشن چند کھتری کی دوکان سے خریدی ہوئی چاندتارے والی رنگدار کھٹ مٹھی ٹکیاں کھا رہا تھا، میرا بڑا بھائی میری منت کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی یہ ٹکیاں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا اور میں انتا زور زور سے رونے لگوں گا کہ میری دادی اور اماں بھاگتی آئیں گی اور مجھے چپ کرانے کے لیے لشن چند کھتری سے دو آنے کی اور ٹکیاں مجھے لے دیں گی۔ ڈیوڑھے میں ہماری چھوٹی پھوپھی سنگر مشین پر کھٹ کھٹ سلائی کا کام بڑے سگھڑاپے سے کر رہی تھی۔ وہ سارے گاؤں میں واحد سلائی کی مشین تھی اور میری چھوٹی پھوپھی اپنے کو سنگر مشین کی مالک ہونے کے امتیاز کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اتنے میں بھاگ بھری مصلن تیزی سے آئی اور دروازے میں کھڑی کھڑی کہنے لگی۔ "اے جینا بی بی۔ شریو دے گھر جاتک ہویا ای۔"

میری چھوٹی پھوپھی نے مشین پر اپنا ہاتھ روک کر پوچھا "ہیں! جان دے نی بھاگو۔"

"بی بی جینا۔ رب میرے دی سَوں۔ بالکل سچ ہے۔ میں ابھی ابھی وہاں سے ہو کر آرہی ہوں ـــ آدھ رات کو شیر کی بچی نے جاتک جنا ہے اور نور ظہور کے وقت کرمے موچی نے خود سیت جلتے ہوئے اسے بھینس کو دوہتے دیکھا۔"

میری پھوپھی بولی " دھن اسے اس آفت دا۔۔۔۔ پر میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ اس کا مرد اللہ داد پچھلے سال چھٹی پر کب آیا تھا؟"

بھاگ بھری مصلن نے کچھ سوچ کر حساب لگایا۔ " چدھرانی، مجھے جچن پڑتا ہے کتنے پوہ میں۔ وہی مہینہ تھا جب ہڑھ آئے تھے اور یاد ہے مصلی کا کوٹھا ڈھ گیا تھا۔ اس مہینے تو چدھرانی رانی!۔ ہماری گائے کالے سانپ کے ڈسنے سے مر گئی تھی۔ یہ منحوس بجو جب بھی گاؤں میں قدم دھرتا ہے کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔"

"کتنیں۔ تو کتنے مہینے ہو گئے؟" میری پھوپھی انگلیوں پر گننے لگی۔ " ہن بھاگی چڑھیا اسے۔ چار اوپر دس مہینے ہوتے ہیں اور بجو یہاں کوئی پندرہ بیس دہاڑ سے رہا۔ ہائے نی بھاگو۔ یہ جاتک ہو کیسے گیا۔ پہلی دار بچے کو چار اوپر دس مہینے پیدا ہوتے سنا ہے۔ مرد کے بغیر جاتک! چاچی شرپھو تو دوسری حضرت مریم ہو گئی۔۔۔۔ توبہ توبہ!" میری پھوپھی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

" ہائے نی چدہرانی" مصلن نے ناک پہ انگلی دھری۔ " میں نے تو یہ سوچا ہی نہ تھا۔ مگر چدہرانی۔ شرپھو کے پاس اور کون مرد گیا ہوگا؟ مردوں کا تو اس سے بول نکلتا ہے۔"

"چپ کر رہو۔" میری پھوپھی منجی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ " چل شرپھو دے جاتک نوں دیکھ آئیے۔"

وہ جانے لگیں تو میں بھی ضد کر کے ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایک بچے کی پیدائش گاؤں میں ایک اہم واقعہ ہوتا ہے۔ راستہ بھر میں سوچتا رہا کہ پھوپھی کا دنوں کا حساب لگانے سے کیا مطلب تھا اور مرد کا عورت کے پاس جانے سے بچہ کیسے پیدا ہوتا

ہے۔ ان دنوں مجھے پورا یقین تھا کہ بچے آسمان سے گرتے ہیں۔ جب بھی میں اپنی ماں
سے پوچھتا کہ میں کیسے پیدا ہوا تو وہ پراسرار طریقے پر مسکراتی اور کہتی، "لال! میں تمہیں
ہزار بار بتا چکی ہوں کہ تمہاری بوڑھی دائی مائی بھاتاں تمہیں اپنی گود میں لٹائے
آسمان پر سے ہمارے گھر میں کود گری تھی۔" ہمارے بعض بڑے مجھ سے اکثر
سنجیدگی سے کہتے کہ مجھے میرے باپ نے مسلیوں سے پانچ دس روپے میں
خریدا ہوا ہے۔" ان بیانات میں تضاد مجھے حیران سا کر دیتا ۔۔ پیدائش کا
مسئلہ مجھ پر تب کھلا جب میں کافی بڑا لڑکا تھا۔ تم یقین کرو نہ کرو۔

ہم چھپڑ کے پاس شر بھو کے کوٹھے میں گئے۔ وہاں کالے رنگ کے تہبند
اور کالے کرتوں میں گاؤں کی بہت سی عورتیں شر بھو کے جاتک ہونے کی خبر
سن کر آئی ہوئی تھیں۔ ایک لیپے پوتے کمرے میں جس میں سب دیہاتی کوٹھوں
کی طرح ایک طاق بنا ہوا ہے اور المونیم کے چمکتے دمکتے برتن ایک دوسرے کے
اوپر جمے تھے، شر بھو ایک کھاٹ پر بیٹھی ہوئی چیتھڑے میں لپیٹے اپنے بچے
کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی۔ شر بھو ایک چوڑے ہڈ کاٹھ کی خوفناک عورت
تھی ۔۔ توے کی طرح کالی بھوت۔ موٹے اور بھدے خد و خال اور بال کھلے
اور پریشان۔ وہ زیادہ لفظوں کی عورت نہ تھی اور جب وہ بولتی تو اس کی آواز
کی کرختگی ایک کوڑے کی طرح لگتی اور اس کی ہمسائیں کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتیں۔
سب اسے اس کی کڑوی کسیلی زبان درازی سے ڈرتے ہوئے اسے اس کے حال
پر رہنے دیتے اور اس طور اس سے بچتے جیسے وہ طاعون ہو۔ اس کے خاوند
بجو اللہ داد نے اس کی بد کلامی اور درشت مزاجی سے تنگ آ کر لاہور میں چپکے

سے ایک اور شادی کر لی تھی اور ہر کوئی کہتا تھا کہ اس نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ کون سا مرد ایسی عورت کے ساتھ زندگی بھر نباہ کر سکتا ہے۔

شر پھو نے کوری پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور بچے کو دودھ پلانے میں مشغول رہی۔

میری پھوپھی نے کہا "شر پھو! جاتک کی مبارک ہو۔ چن جیسا ہے۔ ماشاءاللہ۔ اس کے باپ کو اطلاع دے دینی تھی۔"

شر پھو نے جل کٹ کر اپنے خاوند بجو اللہ داد کو ایک موٹی سی گالی دی۔ "دادے مار ڈھی بگیا۔ وہ اس بھگون حرامزادی لاہورن کے ساتھ جھک مار رہا ہے اور اس کی جوتیاں اٹھاتا ہے۔ چٹی داڑھی اور ستیا ناس خراب۔ اس بھگون کے گھٹنے چھوڑ کر وہ کیوں آئے گا۔ یہاں آئے تو سہی وہ کنجر۔ میں اس کے منہ پر چپتر نہ ماردوں تو شر پھو نام نہیں۔"

لیکن شر پھو۔ آخر وہ اس کا باپ ہے۔ اسے چٹھی تو لکھوا دو" میری پھوپھی نے کنکھیوں سے مصلن بھاگ بھری کو دیکھا۔

"چٹھی لکھوائے میری جوتی" شر پھو بولی اور گالیوں اور پھکڑوں کی ایک ندی اس کے موٹے ہونٹوں سے نکلی۔ دو تینوں عورتیں توبہ توبہ کرنے لگیں۔

پھر بھاگ بھری مصلن سے نہ رہا گیا۔ وہ کنکنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "بی سرفراز بیگم اللہ داد پچھلے کتے میں آیا آہا تا۔"

شر پھو تلملا کر اٹھی اور چیخنے لگی۔ "پھو نے۔ تیرے دادے داڑھی بگیا۔ تیرے خصم کو چور لے جائیں۔ میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔ تو میرے بچے کو حرامی بتاتی ہے۔

تو حرامی، تیری بے بے حرامی۔ تیری سات پیڑھیاں حرامی۔ وے اسمٰعیل۔ اس چڑیل کو بتا۔ تیرا باپ کتیس کے بعد بوہ میں رات کی رات مجھ سے معافی مانگنے آیا تھا یا نہیں اور جاتے ہوئے میں نے اس کی کیسی گت بنائی تھی۔ تو مجھے نہ پکڑتا اور بیچ میں نہ پڑتا تو میں اس کی داڑھی کا بال بال نوچ لیتی اور وہ اس کھبون لاہورن کے پاس کھوا کھسرا بن کر جاتا۔ وے اسمٰعیل تو نے اپنی بے بے کو اس دن پکڑ کر بڑا ظلم کیا۔"

اسمٰعیل بجو اللہ داد کا بڑا لڑکا، سترہ سال کا ایک اکھڑ، ہونق سا لڑکا تھا۔ کچھ کچھ باؤلا اور بالکل اپنی ماں پر گیا تھا۔

اسمٰعیل نے کہا "چاچا بوہ میں آیا تھا اور بے بے کو میں نہ روکتا تو وہ اس کی جن بچہ کھانی کر دیتی ۔ ۔ ۔ ۔"

شر بھو نے پھر مصلیٰ اور سب عورتوں پر ایک نفرت بھری، زہریلی، جھلسا دینے والی نگاہ ڈالی۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ مولبی ہوریں آئے ہیں۔ بروٹیوں والی مسجد کا امام میاں غوث محمد اندر آیا۔ وہ ایک امام مسجد کی بجائے ایک کرخیل دہقانی چھیڑو لگتا تھا اور اس وقت بھی ہاتھ میں ایک گڈریئے کی لاٹھی لیے ہوئے تھا۔ میاں غوث محمد کی عملیت کی سارے گاؤں میں بڑی دھاک تھی۔ اب بے بکی رو ڈی کے سامنے شعر از بر تھے۔

غوث محمد نے لاٹھی کھٹکھٹاتے ہوئے اپنے کرخت دیہاتی لہجے میں عورتوں کو ہٹنے کے لیے کہا۔ "کڑیو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ شر بھو۔ اللہ کی تم پہ رحمت ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" اور اس نے پنجابی کے کچھ اشعار بچوں کی

برکت کے بارے میں پڑھے۔ "ابھی اس کے کان میں کسی نے اذان تو نہیں دی ؟"

شرپھو نے کہا۔ "مولوی جی۔ آپ کے سوا اذان کون دیتا ہے۔"

"بھئے" مولوی غوث محمد رینگا "حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں پہلی آواز کلمہ کی جانی چاہیئے......"

مولوی غوث محمد نے نومولود کے کان میں اذان دی اور اذان سے فارغ ہونے پر شرپھو اٹھی اور بھڑولی میں سے ایک رومال میں دو روپے مولوی کو گزرانے ۔۔۔ اور مولوی غوث محمد کچھ مزید مسئلے مسائل سمجھا کر اور دو تین لڑکیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد چلا گیا۔ اس کے بعد ہم بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور میری پھوپھی کے ایک روپیہ شرپھو کی ہتھیلی پر رکھنے کے بعد ہم گھر کو لوٹے۔ مجھے واپسی پر اپنی پھوپھی سے یہ پوچھنا یاد ہے کہ اگر بچہ آدھی رات کو آسمان سے گرا تھا تو وہ چھت میں سے کیسے شرپھو کی گود میں آ گیا۔

"ثنا دل۔ کیا الٹ پلٹ سوال تم پوچھتے رہتے ہو" میری پھوپھی نے کہا۔ "جب تم بڑے ہو گے تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا" اور اس نے بھاگ بھری مصلن کو کہنی ماری، آنکھ میں شرارت لیے ہوئے۔

"میری چھوٹی پھوپھی ایک ہنس مکھ لاابالی طبیعت کی عورت تھی ۔۔۔ زندگی کی رنگینی اور کھیل کود سے معمور۔"

ثنا ءالحق پھر کچھ دیر کے لیے گم سم ہو گیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ "شرپھو کے اس بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ پیچھے یہ خبر بھی بھاگ بھری مصلن نے آ کر دی۔ یہ نام بچے کے نانا بوڑھے اور درشت کلام رضی اکبر نے تجویز کیا تھا جو ایک پنشن یافتہ

معلم تھا اور اب لکھوہار کے دیہاتی ڈاک خانے میں ٹکٹوں کی فروخت اور ڈاک کی ترسیل کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی۔ سب پوسٹ ماسٹر اس کے عہدے کے لیے کچھ زیادہ ہی اونچا نام ہے۔ اسے اس کام کے لیے ڈاک کے محکمے سے صرف پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ وہ گاؤں والوں کی چٹھیاں لکھ کر کما لیتا۔ خوب کیریکٹر تھا۔ کڑوا اور زہریلا، اپنی بیٹی شربھو کی مانند۔ اس کا ایک بیٹا جس کا نام عبداللہ تھا اوائلِ شباب میں فوت ہو گیا تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اپنے نواسے کا نام بھی عبداللہ رکھا۔

بجو اللہ داد بچے کی پیدائش کے کوئی تین چار دن بعد گاؤں آیا۔ غالباً اس کے خسر نے اسے پوسٹ کارڈ سے اطلاع دے دی ہو گی۔ اسے دیکھ کر اس شخص کو داد دینی پڑتی تھی جس نے پہلے پہل اسے بجو کا لقب دیا تھا۔ یہ نام اس پر ٹوپی کی طرح فٹ بیٹھتا تھا۔ میں نے اسے گاؤں میں کئی بار دیکھا ہے اور ایک بار اس کے ہاں کسی کام سے لاہور جانے کا اتفاق بھی ہوا — ہو بہو بجو کی شکل — موٹے خدوخال کا ماتمی چہرہ۔ مہندی سے رنگی بوسیدہ داڑھی۔ سر پہ کھڈی کی دار میلے چکٹ کلاہ پہ بندھی پگڑی اور بدن پر ایک پرانی دقیانوسی اچکن پہنے جسے اس نے کئی برسوں میں نہ بدلا تھا۔ اس کی ساری ذات کرم خوردہ تھی۔ جب میں لاہور میں دل محمد روڈ پہ اس کے بالکنی والے غلیظ مکان پہ اس سے ملا تو اپنی دوسری بیوی سے اس کا ایک بچہ ہو چکا تھا اور گھر میں اس کی حیثیت ایک بچے کو کھلانے والی دائی کی تھی۔ مجھے بیچارے بجو پر رحم آیا اور اسے بچے کو ہاتھوں میں لوری دیتے ہوئے دیکھ کر ہنسی بھی — آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔۔۔۔

"میں تمہارے کان کھینچنے لگا ہوں ثنا ء الحق ۔" میں نے کہا۔

"ثناء الحق ہنسا۔ ۔ ۔ ۔" ہاں بجو اللہ داد کے گاؤں میں آنے اور شر بھو کے استقبال کا منظر ایسا تھا جیسے گاؤں والے برسوں میں نہیں بھولے یعنی بھاگ بھری خود وہاں موجود تھی۔ بجو ایک بھوری مریل گھوڑی پر سوار کچی سڑک پر ٹخ ٹخ آتا تھا گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر شر بھو اسے ملی۔ وہ اپنے گدھے پر بیٹھی ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے بروٹیوں میں سے لکڑیاں کاٹنے جا رہی تھی۔ ذرا اس سین کا تصور کرو۔ بجو کا چہرہ اپنی خوفناک بیوی کو آتے دیکھ کر فق ہو گیا اور اس نے باگ موڑ کر درختوں کی اوٹ میں سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن شر بھو اس کے سر پر آپہنچی۔ کلہاڑی ہاتھ میں لیے۔ روکھے بال پھیلائے وہ گدھے پر سے پھلانگ کر اتری اور سڑک کے بیچ گھوڑی کے رستے میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ بجو کے لیے بچنا مشکل تھا۔ اس نے موت اپنے سامنے دیکھی۔ شر بھو نے کلہاڑی کو بڑے وحشیانہ طریقے سے ہلایا اور موٹی گالیوں اور لعن طعن کی ایک نہ ختم ہونے والی بوچھاڑ اس کے موٹے ہونٹوں سے چھوٹی۔ اس منظر کو دیکھنے والے اس عورت کی زرخیز دماغی پر حیران ہو گئے اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگے ۔۔۔ یہ عورت کوئی انسان کی بچی نہیں تھی یہ تو کوئی چڑیل تھی۔

"دادے داڑھی ہگیا۔ بجو آ کھوہ دیا۔ خدا تیری بیڑیوں میں وٹے ڈالے۔ تو نے مجھ پر سوکن ڈالی ہے ؟ میرے گھر کی چوکھٹ کے اندر قدم تو دھر۔ تیری بوٹی بوٹی نہ کر دوں تو میں رضی اکبر کی دھی سرفراز نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

بے چارے بجو نے کچھ دیر تو یہ صلواتیں سنیں۔ پھر اپنی جان کو خطرے میں

دیکھ کر اس نے گھوڑی کو ایڑ لگا کر بھگا دیا اور شرپھو اپنے گدھے پر سوار ہو کر اپنے ننگے پاؤں نیچے لٹکائے اپنے فرار ہوتے ہوئے خاوند کے پیچھے گئی ـــ گالیاں اور چیخیں بکتی اور اپنے چوڑے مردوں کے سے سینے پر دو ہتڑ مارتی، اور اپنے بال نوچتی۔ اس طرح بجو اور اس کی بیوی گاؤں کی گلیوں میں سے گزرے۔ اور جس کسی نے بھی دیکھا بعد میں کہا کہ کھوہار میں خاوند کی ایسی خاطر پہلے کسی جنانی نے نہ کی تھی۔ بجو رات کو اپنے ایک شریک کے گھر رہا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے نومولود کو دیکھا یا نہیں۔ مگر دوسرے دن منہ اندھیرے اس نے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ جب تک شرپھو جیتی رہی اس نے گاؤں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی۔"

چاند اب درختوں کی چوٹیوں کے اوپر اٹھ آیا تھا اور اس کی سفید نقرئی روشنی ہم بنچ پر بیٹھے ہوئے دو تین دوستوں کو نہلا رہی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا شرپھو کا بچہ حرامی تھا؟"

"میں نہیں کہہ سکتا" ثناء الحق نے کہا "وہ حرامی تھا یا نہیں، میری پھوپھی جینا اور بعض دوسری عورتوں کو اس کے حرامی ہونے کا یقین تھا۔ (مگر بعد میں میں نے اس بات کی کافی کھوج کی) بجو اللہ داد لوہے میں رات کی رات آیا ضرور تھا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس گیا یا نہیں، کوئی نہیں جانتا ـــ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ حرامی تھا یا نہیں۔ وہ خدا کی اس دنیا میں بعینہٖ اس طریقے سے آیا جس طریقے سے ہم سب آئے ہیں ـــ ایک عورت کے بطن سے ـــ اور شادی کیا ہے۔ مصطفیٰ کمال کہا کرتا تھا کہ ایک ٹکر گدا ملا کے چند فقرے پڑھنے سے ایک عورت اور مرد کو اکٹھے ہونے کا لائسنس مل جاتا ہے اور اس اتحاد کو برکت اور پاکی مل

جاتی ہے۔ جب ان فقروں کے بغیر ایک عورت مرد کے پاس جاتی ہے تو لوگ شور مچاتے ہیں کہ یہ بدکاری ہے۔ یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ اور دیکھو تو بات ایک ہی ہے۔ کتنے ہی بچے بے محبت شادیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مگر کوئی انہیں برا نہیں جانتا ـــــ میں نے کئی باپوں کو دوسری عورت کے ساتھ گھر بسانے کے بعد اپنی پہلی بیوی کی اولاد سے قطعاً لاتعلق ہوتے دیکھا ہے۔۔۔۔"

احسان اور میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ ثناء الحق اپنے خاص قدرتی عقیدوں کو ہوا دے رہا تھا اور ہم جانتے تھے کہ اگر ہم نے اسے ٹوکا تو مروجہ اخلاق کے خلاف اس کی لتاڑ گھنٹے بھر تک جاری رہے گی۔

"تم کہانی سے بھٹک رہے ہو میک ڈف" میں نے کہا۔

"معاف کرنا ـــــ میں کہاں تھا؟" اس نے پوچھا۔

"شربھو کے بچے کے حرامی ہونے یا نہ ہونے پر تم ہمیں فطرتی اخلاقیات کا درس دینے لگے تھے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں ـــــ" ثناء الحق نے یاد کیا "اس طرح عورت شربھو کے پیٹ سے عبداللہ اس رات پیدا ہوا۔۔۔۔۔۔ ایک پھول کی مانند کھلتا ہوا۔ وہ اس چمکتے دن اور اندھیری رات کی دنیا میں آیا۔۔۔۔"

"۔۔۔۔ سال گزرتے گئے۔ والد صاحب کی تبدیلی وہاڑی ہو گئی اور میں چوتھی جماعت میں چڑھ گیا۔ ہر سال مئی یا جون میں ہم اپنے وطن اپنے دادا دادی کے پاس آتے۔ اپنی پھوپھیوں اور خالاؤں سے ملتے۔ گاؤں کے بچوں

کے ساتھ دیہاتی کھیل کھیلتے۔ گھوڑیوں کی سواری کرتے۔ اپنے پنکھے نما داڑھی والے ماموں جلال کے ساتھ پبّی کے دامن میں ڈھاکوں سے پٹے ہوئے میدان میں خرگوش کے شکار پر جاتے ــــ میرا ماموں جلال اب فوت ہو چکا ہے ــــ کیا ہی عجیب آدمی وہ تھا۔ اس کی حویلی کی ڈیوڑھی میں ہمیشہ دو ادھ پچے کانوں والی، پتلی اور بانکی خاکستری رنگ کی کتیائیں بندھی رہتی تھیں۔ ان کی وہ وہ خاطرداری ہوتی تھی کہ الامان والحفیظ۔ تین چار مراثی ان کی خدمت کے لیے وقف تھے۔ کوئی انہیں نہلا رہا ہے اور رگڑ رہا ہے۔ کوئی بیٹھا چمٹے سے ان کے کانوں کے اندر سے چیچڑ نکال رہا ہے۔ ان کے لیے خاص بوٹیوں سے مرکب طاقت کے کھانے پکتے تھے اور دن میں ایک بار یہ کتیائیں گھی اور شکر کی چوری کھاتی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماموں کے دوسرے شوق کیا تھے۔ وہ مسئلے مسائل بتلانے میں کافی شہرت رکھتا تھا اور گاؤں والے اس سے مسئلے پوچھنے آتے تھے۔ "مولی جی۔ وضو کے بعد کتیا کو چھکنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ مولی جی۔ آج میں نے غصّے میں اس نیک بخت شیدو کو تین دفعہ طلاق کہہ دی۔ ہمارا نکاح ٹوٹا یا نہیں؟" ہم جب بھی جاتے اسے کتیاؤں کی دیکھ بھال، علاج معالجے میں مصروف پاتے۔ اپنی بیوی اور اپنے لمبے گھامڑ سے اکلوتے لڑکے رنگو سے وہ قطعاً لاتعلق تھا۔ میری چھوٹی پھوپھی زینب بی بی اس کے گھر تھی۔ وہ سارا دن بیٹھی سنگر مشین پر کھٹ کھٹ کرتی رہتی اور گاؤں کے لیے ایک ٹیلرنگ شاپ کا مقصد پورا کرتی، وہ ایک ہنس مکھ، لاابالی اور باتونی عورت تھی۔ ورنہ ماموں جلال کو نانی یاد آ جاتی ــــ ہم اس ماموں کو "کتیاں والا ماموں"

کہا کرتے تھے۔ اور ایسے دنوں میں گاؤں کی آدھی آبادی پیدل اور گھوڑیوں پر سوار سب اِدھر اُدھر کے کتوں کو لیے ماموں جلال کی سرکردگی میں خرگوش کے شکار پر نکل آتی تھی۔ وہ شکار کے منظر مجھے نہیں بھولتے۔ کتیوں کا خرگوش کی بو پا کر رک جانا اور کان کھڑے کر لینا۔ سُراغیوں کا بھُربھُری ریت پر جانور کے پنجوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی چھپنے والی جگہ دریافت کرنا اور اس میں گھس کر زور زور سے "ہو ہو سیٹر ہو ہو" چلانا۔ سہمے ہوئے خرگوش کا جھاڑی میں سے تیر کی طرح بھاگ پڑنا اور کتوں کی فوج کا ڈھاکوں کی بھول بھلیوں میں سے اس کا تعاقب کرنا۔ اکثر ماموں جلال کی کتیاں جو پاؤں کی تیز تھیں اور خاص اس کام کے لیے سدھائی ہوئی تھیں، خرگوش کو دبوچنے میں دوسروں سے بازی لے جاتیں۔ آوہ۔ وہ ڈھاکوں اور پتی کی پہاڑیوں میں پھرنے کا لطف اور تعاقب کی دھڑکن اور گرماہٹ — دوستو! وہ کیا مسرت اور بے فکری کے دن تھے ..... وہ اچھے لوگ، وہ ان کے اشغال اور باتیں اب وقت کی اوٹ میں چھپ گئے ہیں اور فنا کی حدود میں ہمارا — اپنے بیٹوں اور پوتوں کا — انتظار کر رہے ہیں۔ میں پچھلے ایک سال سے وطن نہیں گیا۔ اب وہاں کون ہے جس کے پاس آدمی جائے۔ مگر کسی وقت یوں ہی بیٹھے بیٹھے میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے اور میری پتی کی نیلی رنگین پہاڑیاں مجھے ایک طاقتور مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ قوم کی یا ملک کی محبت جسے حُب الوطنی کا بلند بانگ نام دیتے ہیں کہیں بے معنی تو نہیں؟ آدمی دراصل اپنے مولد و مسکن، اپنے خطے سے محبت کرتا ہے جس کی مٹی کی بُو اس نے سونگھی، جس کی ہواؤں میں اس نے سانس لیا، جہاں سے اس کا خمیر اٹھا۔ کوئی حقیقت

میں ایک ملک سے محبت نہیں کرتا۔ سکاٹ لینڈ والے اپنے قبیلے اور اپنی ہیدر سے سرخ ہوتی ہوئی پہاڑیوں کے گیت گاتے ہیں۔ دولت برطانیہ کے نہیں جس پر سے سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایک صحرائی بدو صرف اپنے صحرا کی ریتوں، کھجوروں اور خیموں سے محبت کرتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی باتیں کرتے ہوئے کہیں ہم اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دیتے؟

"یار کہانی سناؤ جو تم نے شروع کی تھی" احسان نے کہا "اگر نثارالحق تم ایسے ہی بھٹکتے رہے تو یہ کبھی ختم نہ ہو گی۔ گیارہ بجے کے بعد ہوسٹل کا پھاٹک بند ہو جائے گا اور ہمیں دیواریں پھاندنی پڑیں گی"

"ہاں میک ڈف" میں بولا۔ "مجھے تمہارا یہ بھٹک جانا اچھا لگتا ہے مگر اب کافی دیر ہو چلی ہے اور مجھے کچھ سردی سی لگ رہی ہے"

"ہا۔ ہا" نثارالحق نے ہڑ گا بھرا ..... "میں کہاں تھا؟"

ہم نے اسے بتایا اور وہ پھر اپنی کہانی کی طرف لوٹا۔

"ہاں .... میری عمر تب نو سال کی ہو گی۔ میں چوتھی میں تھا اور ہم گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ایک دن میری چھوٹی پھوپھی جن کے ہم بڑے دوست تھے مجھے چھپرے سے پرے ایک شادی کے گھر لے گئیں۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو ہم شرفیو کے باپ بوڑھے سنگی رحمی اکبر کے پوسٹ آفس کے پاس سے گزرے۔ پوسٹ آفس کیا تھا۔ مکان کے باہر ایک سرخ لیٹر بکس لٹکا تھا۔ نیچے ایک چٹائی پر ایک صندوقچی اور قلمدان سامنے رکھے پوسٹ ماسٹر صاحب بیٹھے تھے، جلے بھنے اور دنیا جہان سے بیزار۔ گٹھیلا میانہ جسم، سر پر پگڑی، مہندی لگی بھروان داڑھی

مونچھ سے سجا درشت بدہدی چہرہ۔ کتنی لمبی ناک تھی رضی اکبر کی۔ وہ صندوقچی میں سے ایک عورت کو دینے کے لیے کارڈ نکال رہا تھا مگر بڑی بددلی سے۔ چٹائی کے سرے پر جو گئے رنگ کے کرتے میں ایک آدھ ننگا چار سال کا بچہ لیٹا تختی پر اب ت گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے بال گھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول اور دلچسپ اور اس کی آنکھوں میں قدرتی شرارت اور ہنسی تھی۔

"وے تناول۔ تمہیں پتہ ہے یہ جاتک کون ہے؟" میری پھوپھی نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے پتہ نہیں پھوپھی جی۔" میں نے کہا۔ "اس کا کیا نام ہے؟"

"یہ شر پھو بلا کا لڑکا ہے عبداللہ" میری پھوپھی نے کہا "تمہیں یاد ہے چار دو ہے کی بات ہے۔ تم یہاں تھے اور میں شر پھو کے گھر تمہیں لے کر آئی تھی۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے ــــ" اور پھر میں نے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے زور سے کہا۔ "پھوپھی جی۔ پھوپھی جی۔ یہ تو کھچو ہے۔"

عبداللہ کانے کا قلم اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے اپنی طرف سے خوش خطی کی کوشش کر رہا تھا۔

عبداللہ نے کھچو کے لفظ پر اپنی آنکھیں تختی پر سے اٹھائیں اور منہ کھول کر مجھے ایک چمکیلی مسکراہٹ دی مگر رضی اکبر جس نے اپنے نواسے کے متعلق یہ لفظ سن لیا تھا بھلا اس ہتک کو کیسے جانے دیتا۔

اس نے ایک رنگیتی آواز میں کہا "تے تسیں طوانیا سجکو ہو دو گے۔"

میری پھوپھی نے وار کو بڑی مضبوطی سے سنبھالا اور پھر بظاہر بڑی خوش طبعی سے ہیس ہیس کر بولی۔ "یہ میرا بھتیجا سجکا ہے اور ہمارے وادکے سب سجکے ہیں۔

صراطِ مستقیم پر چلنے والے اور سیدھے کام کرنے والے۔ حلال کے سب بچے ہوتے ہیں میاں رضی اکبر۔"

"کر ڑے ۔ جا جا۔ راہ لے" رضی اکبر نے نفرت اور حسد کی آنکھیں اٹھائیں اور گھیں گھیں لفظ اس کے موٹے ہونٹوں سے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح نکلے۔ "میں تجھے بھی جانتا ہوں اور تیرے دادکوں کو بھی۔ یہیں گھاس مارا کر تسے تھے میری زبان نہ کھلوا۔"

ایک اور عورت کو کارڈ دیتے ہوئے رضی اکبر کہنے لگا۔ "راجو مصلّن یا تو روز آ کر ایک تین پیسے کا کارڈ لے جاتی ہے۔ تو کارڈ نہ لکھے تو تیری مصلّی کے وٹ نہیں پڑنے لگیں گے۔ تو سمجھتی ہے سرکار نے ڈاک خانہ تیرے لیے کھولا ہوا ہے؟"

عبداللہ نے اپنے نانا کے خفگی بھرے الفاظ کو بڑے لطف اور مزے سے سنا۔ یہ اس کے لیے باقاعدہ تفریح تھی۔ اس نے میری طرف مسکرا کر مجھے اپنا ہمراز بنایا جیسے کہہ رہا ہو۔ "دیکھو راجو مصلّن کی کیا گت بن رہی ہے۔"

جب میری پھوپھی اور میں ہاتھ ڈالے اس خشکیل بوڑھے آدمی سے رخصت ہوئے تو میری پھوپھی نے کہا۔ "عبداللہ خدا جانے ان خشکی چوڑوں کے گھر کیسے پیدا ہو گیا۔ وہ ان میں سے نہیں لگتا۔ مزاج یا شکل کوئی بھی چیز تو اس کی ماپیاں پر نہیں۔ پتہ نہیں بھوں شر چیو اس کو کہاں سے لے آئی۔"

میں بعد میں اکثر وہاں سے گزرا کرتا۔ میری دو بیوہ خالائیں اس طرف رہتی تھیں اور وہ مجھ سے بے حد پیار کرتیں۔ سیاہ گاڑھے کے لمبے چولے اور سیاہ تہبند میں یہ خالائیں جب بھی میں جاتا گھی اور شکر کا شیرہ گھول کر مجھے کھلاتیں۔ کتنا مزیدار

وہ ہوتا تھا یا اُن دنوں میں کافی پیٹو تھا۔ ان کی البتہ پوپلے موہنوں سے میری بلائیں لینا مجھے ناپسند تھا۔ میرے وہاں سے بار بار گزرنے کی ایک وجہ ایسی بھی کہ تم ہنسو گے۔ میں لیٹر بکس کو دیکھنا چاہتا تھا۔ سُرخ اور چمکیلا لیٹر بکس! جو ایک آدمی کی طرح گول مٹول تھا اور جس کا ایک چھجے دار منہ تھا جس میں سے وہ کارڈ اور لفافے ہڑپ کر جاتا تھا۔ لیٹر بکس گاؤں کے مٹیلے پھیکے رنگوں میں ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند تھا۔ تم پھر ہنسو گے۔ شاید بچپن میں میری اس سرخ گول ڈبے سے شیفتگی کا اثر ہے کہ میں اب بھی جب ایک لیٹر بکس کے پاس سے گزرتا ہوں میرا دل تھوڑا سا اچھلتا ہے اور زندگی چمکیلی اور پُر مسرت لگنے لگتی ہے ـــــ اور پھر یہ خیال کہ تم اس لیٹر بکس میں خط ڈالو تو وہ کئی سو میل سفر کرتا جاتا ہے! لیٹر بکس۔ ہا۔ کتنے بچھڑے۔ دُور دراز پڑے ساتھی اس کی بدولت ملتے ہیں ـــ"

"یہ لیٹر بکس پر بڑا اچھا ایسے ہے میک ڈف۔ اس کے متعلق تمہاری شاعری ہم پھر کبھی سنیں گے ـــــ اب کہانی سناؤ۔۔۔۔"

باغ کے پاس ہی پولیس اسٹیشن میں گھنٹے پر ضربوں کی آواز آئی۔ ایک۔ دو۔ تین ـــــ دس۔ ابھی سے دس! اور ہوا میں خنکی تھی۔

"اچھا میں مختصر ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے لیٹر بکس کے نیچے بیٹھے ہوئے خشکیل خمیدہ پوسٹ ماسٹر اور ننھے مُنّے تختی لکھتے ہوئے یا پاس ہی کھیلتے ہوئے لڑکے میں کچھ کشش سی لگتی تھی۔ میں دور سے انہیں دیکھتا گزر جاتا۔ عبداللہ سے دوستی کرنے کو میرا دل چاہتا تھا مگر میں بوڑھے کی بدمزاجی سے ڈرتا تھا۔ دوسرے میری دادی کو رضی اکبر اور اس کے خاندان کے خلاف کچھ پرانے گلے تھے اور اس نے مجھے

ہدایت کی تھی کہ میں ان کے گھر نہ جایا کروں۔ ہمیں کوئی لفافہ یا پوسٹ کارڈ منگوانا ہوتا تو میری دادی ہمیشہ نورے مراثی یا کسی اور سے منگواتی۔ اسی طرح جو خط آتے ان کو لینے کے لیے بھی کوئی کمی بھیجا جاتا۔ اسے دو تین چکر کاٹنے پڑتے کیونکہ میری دادی سے بدلہ لینے کے لیے بوڑھا منشی اکبر پہلے پھیرے پر کسی کو یہ کہہ کر جھڑک دیتا کہ "میں نے ابھی چھانٹی نہیں کی" یا "میرے کام میں ہرج ہوتا ہے میں اپنے وقت پر چھانٹی کروں گا" حالانکہ گاؤں میں بہت کم چٹھیاں آتی تھیں اور وہ بھی ہفتے میں دوبار۔

ایک دفعہ میں نے عبداللہ کو لیٹر بکس کے نیچے اکیلے بیٹھے ہوئے پایا۔ اپنے نانا کی نقالی میں پوسٹ ماسٹر بنے ہوئے۔ بوڑھا آدمی غالباً باہر بروٹیوں میں گھاس چھیلنے گیا ہوا تھا یا کسی شریک کے ہاں کوئی جائداد کا جھگڑا طے کرنے۔ عبداللہ تختی پر آڑے ترچھے حروف میں قلم پر زور دے دے کر ابجد کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے شرارت سوجھی۔

میں اس کے پاس گیا۔ "پوسٹ ماسٹر۔ مجھے دو پیسے کا کارڈ تو دینا۔"
عبداللہ نے اوپر مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"تمہارا نانا کہاں ہے؟"

"واندھے......"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہیں الف ب لکھنی آتی ہے؟"

"کیوں نہیں" میں نے فخر سے کہا۔ یہ تو میں نے پہلی جماعت میں سیکھی تھی۔

مجھے سونک پہاڑے بھی آتے ہیں اور انگریزی میں اے۔ بی۔ سی لکھ سکتا ہوں۔
سی۔ اے۔ ٹی کیٹ۔ آر۔ اے۔ ٹی رَیٹ ۔۔۔۔۔ اور میں تمہاری طرح کھبچو نہیں
ہوں۔"

وہ یک لخت زور زور سے پکارنے لگا۔" بے بے۔ بے بے میانوں کا
لڑکا مجھے کھبچو کہتا ہے۔"

میں نے اسے منت کر کے چپ کرایا اور پھر اس کی تختی پر خوشخط الف ب
لکھنے لگا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ اے۔ بی۔ سی کیسے لکھتے ہیں اور کیٹ کیسے۔
"میرا نام لکھو۔"

میں نے اس کا نام لکھا۔ وہ بڑی خوشی اور تعجب سے دیکھتے ہوئے بولا۔
"میں بے بے کو جا کر دکھا آؤں۔"

"ٹھہر بے بے کو پھر دکھا دینا۔ یہ میرا نام ہے — ثناء الحق — دیکھو
کتنا شاندار" اور میں نے اس کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھ دیا۔ پھر خیال آنے
پر میں نے آگے یہ الفاظ لکھے ۔۔۔۔ "دوست بیلی۔"

میں نے اسے آدمی اور خرگوش اور گھوڑے کی بھدی الٹ سلٹ تصویریں تختی
پہ بنا دیں۔

"یہ گناہ ہوتا ہے" اس نے کہا "میاں جی کہتے ہیں کہ آدمی کی تصویر بناتا
گناہ ہوتا ہے اور اللہ میاں اس پہ بڑے خفا ہوتے ہیں — تم نے اللہ میاں
دیکھے ہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ بڑے نیک لوگ ہی اللہ میاں کو دیکھ سکتے ہیں۔"

"بے بے کہتی ہے اللہ میاں ہر جگہ ہوتے ہیں۔ میں انہیں درختوں اور پیڑ کے پاس ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے تو نظر نہیں آتے ۔۔۔ اُن کی داڑھی ہوتی ہے؟"

"اللہ میاں کی شکل نہیں ہوتی۔۔۔"

"شکل نہیں ہوتی!" یہ بات عبداللہ کو بڑی عجیب لگی۔ پھر اس نے کہا "ہماری مینں نے کُٹی دی ہے چلو تمہیں دکھاؤں۔ نہیں پر میاں جی نے کہا تھا تم یہیں بیٹھے رہنا۔ کوئی لفافے لے جائے اور پیسے نہ دے ۔۔۔ اور مودھے پانڈی کا لڑکا ہے نا، ناما۔ کل شام کو وہ اس لاٹرے بکس میں روڑے ڈالتا رہا۔ میاں جی نے اسے خوب مارا۔"

اس طرح ہم باتیں کرتے رہے جو اب مجھے یاد نہیں۔ وہاں صندوقچی کے پاس ایک کاغذ میں سوراخ کرنے والی مشین تھی۔ عبداللہ نے اس سے مجھے سوراخ کر کے بتایا۔ یہ مجھے بڑی عجیب و غریب بات لگی اور ہم پوسٹ ماسٹر کے ایک نئے نویلے سفید کاغذ کو مشین چلا چلا کر سوراخوں سے چھلنی کرتے رہے۔ سوراخوں کی جو گول گول کترنیں نکلتی تھیں وہ ہمارے لیے سونے سے زیادہ قیمتی تھیں۔ ہم ان کو بعد میں بانٹنے کے لیے سنبھال سنبھال کر رکھتے جاتے۔ وقت اُڑتا گیا۔ اتنے میں میں نے نظر اٹھائی تو سامنے سے ہاتھ میں ٹیک والا عصا لیے کمہار کا پوسٹ ماسٹر اپنی گھسٹتی چال سے چلتا آ رہا تھا۔ میری تو جان نکل گئی۔ وہ دہیں سے رینگا۔ "یہ میانوں کا لڑکا آج کیا لینے آیا ہے؟" ممکن ہے اس نے اسے اپنی طرف سے خوش طبعی ہی سے کہا ہو اور خوش آمدید کے طور پر۔ مگر میں اتنا ڈرا کہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا ۔۔۔ اپنی قیمتی کترنوں کو بھول کر۔ بعد میں مجھے یقین

ہے کہ عبداللہ نے اسے بتایا ہوگا کہ مشین سے اس کے کاغذ میں سوراخ بھی میں نے کیے ہیں اور تختی پر جاندار چیزوں کی تصویریں بھی میں نے بنائی ہیں۔ بوڑھا ضرور بڑبڑایا ہوگا مگر میرا خیال ہے اس نے عبداللہ کو معمولی سرزنش کی ہوگی۔ وہ دوسروں کے لیے بڑا کٹر، ملا اور کھردرا تھا، اپنے خون پوست کے لیے نہیں اور اپنے چھوٹے خوبصورت نواسے کے لیے تو اس کا دل خاص طور پر نرم تھا۔

لیکن ایک بار میں بوڑھے رضی اکبر کی سخت خفگی کا سبب بنا اور وہ بھی مفت میں۔ عبداللہ چند دوسرے بچوں کے ساتھ چھپرے پر شیدن کھیل رہا تھا۔ میں وہاں سے گزرا تو ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہوگیا۔ شیدن تم نے کھیلی ہوگی۔ زمین پر ایک لکیر سے ایک مستطیل کھینچ لیتے ہیں جسے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ خانوں کے نام بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ ایک خانہ نانی ہوتا تھا۔ ایک ٹاپو۔ ایک گھر گھڑا گھڑا اپو اور پر چھوٹا سمندر اور اس سے آگے بڑا سمندر۔ کھیلنے والا پہلے پہلے خانے میں گٹی پھینکتا ہے اور وہ ایک ٹانگ پر پھدکتا ہوا پاؤں سے گٹی کو باہر سرکاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ گٹی لکیر کے اوپر نہ آئے اور نہ ہی پاؤں لکیر پر پڑے ورنہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور دوسروں کی باری آجاتی ہے۔ نانی کے اوپر سے پھلانگ کر گزرنا پڑتا ہے اور اس میں گٹی چلی جائے تو پھر پہلے خانے سے شروع ہونا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی باری پر پہلے خانے کلیر کر لیے اور گٹی نانی میں پھینکی اور خانوں میں سے پھدکتا ہوا چلا تو عبداللہ نے شور مچایا کہ میرے پاؤں کی ایڑی لکیر پر آگئی ہے۔ میں نے اس سے انکار کیا اور عبداللہ کہنے لگا کہ "تم روند مارتے ہو ہم تم سے نہیں کھیلتے۔" اس نے گٹی اٹھائی

اور گھر کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کی بڑی منت کی اور اسے یقین دلاتا چلا کہ میرا پاؤں لکیر پر نہیں لگا تھا۔ مجھے کھیل میں مزا آرہا تھا..... اور میں جیت رہا تھا عبداللہ بھی ضدی بلا تھا۔ نہیں مانا۔ آخر میں نے غصے میں چڑ کر کہا "نہیں کھیلتا تو چڑھ ..... " سب گاؤں کے بچے لڑکے اور بڑے ایسے لفظ بغیر سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں مگر عبداللہ نے تو بات کا بتنگڑ بنالیا اور گھر اپنے نانا اور بے بے سے جا کر میری شکایت کی کہ ثناء الحق نے اسے گندی گالی دی ہے۔ میں تو وہاں سے چلا آیا مگر بوڑھے رحمی اکبر اور سر پھو نے بڑا طوفان مچایا..... "کون جمیا اسے ساڈے دتے نوں گالیاں دینے والا۔ اب یہاں آئے تو سہی" پوسٹ ماسٹر نے اس پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ شام کو اپنے نواسے کے ہمراہ چوبارے پر میرے دادا کے پاس آیا ___ برسوں میں شاید پہلی بار۔ اس نے میرے دادا کو کہا کہ ثناء الحق نے عبداللہ کو یوں یوں کہا ہے۔ جب دادا نے مجھ سے پوچھا تو بات سچ تھی اس لیے میں انکار نہ کر سکا۔ میرے دادا نے مجھے خوب جھڑکا کہ تو نے یہ گندی باتیں کہاں سے سیکھیں اور یہ کہ اسے علم نہیں تھا کہ مجھے بُری عادتیں پڑ گئی ہیں۔ میں بڑا شرمندہ ہوا اور اس شرارت کی ساری جڑ عبداللہ نے میری اس سرزنش پہ خوب بغلیں بجائیں۔

میں اس گرما میں پھر اس کے ساتھ کھیلنے نہیں گیا ___ چغل خور، شکایتی رقعہ کہیں کا!

میں نے کیٹس کو کوٹ کیا ___ میرا دل دکھتا ہے اور ایک سُلا دینے والی

سکنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے..... میک ڈف ۔"
احسان نے کہا "یار ہمیں دیوار پھاندنی پڑے گی ۔ اگر پھر پکڑے گئے تو ریلیوٹ ہو جائے گی ۔"
ثناء الحق نے اپنی کہانی جاری رکھی، اپنی گزری ہوئی یادوں کے حزن میں ڈوبی ہوئی۔ جس کا ایک ایک لمحہ وہ دوبارہ جی رہا تھا۔ وہ ایک طاقت ور شراب کے نشے میں سرشار انسان تھا۔" اور ہر سال ہم اپنے وطن میں تقریباً ساون بھادوں کے مہینوں میں آتے تھے جب ہمیں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ میں اکثر عبداللہ کو دیکھتا۔ کبھی گاؤں کے بچوں کے ساتھ گڈیاں اور شیدن اور گلی ڈنڈا کھیلتے ۔ کبھی چھپڑ میں اپنی بھینس کو نہلاتے ۔ کبھی دریا کے اُس پار واڑے میں اپنے جانوروں کو چراتے۔ درانتی لیے گھاس چھیلنے کے لیے بروٹیوں کی طرف جاتے یعنی وہ مختلف کام کرتے جو سب غریب دیہاتی لڑکے کرتے ہیں اور جو میری رائے میں خشک الفاظ رٹنے یا سود مرکب کے سوال حل کرنے سے کہیں زیادہ صحتمند اور مفید کام ہیں۔ سدا ڈڑوٹھ کی قوسی کی طرح وہ سورج اور بارش کی چھینٹوں میں بڑا ہوتا رہا۔ جب بھی ہم ملتے ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے جو اب مجھے یاد نہیں۔ ہم دونوں اس کی حقیقی خودی کو بھول گئے تھے اور وہ اب ہمارے درمیان ایک ہنسی کی بات تھی۔ اس نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور گاؤں کے اسکول میں بھی جانے لگا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے منشی کے بولنے کی ہو بہو نقالی کر کے ہمیں بڑا ہنسایا۔ اس کا نام غلام رسول تھا مگر وہ مشہور منشی چھجڑ کے نام سے تھا۔ اگرچہ اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ عبداللہ نے بڑی ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے جتایا "ثناء دل ۔

یہ چچڑ لڑکوں کو بڑی سزا دیتا تھا۔ جب کسی لڑکے کو سبق نہ آتا تو اس کے پاس آکر پیٹ، بغل یا ٹانگوں پر زور زور سے چٹکیاں لیتا۔ لڑکے ٹاپتے درد سے چلاتے اور چچڑ بڑا خوش ہوتا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ایک دن اس نے میرے ساتھ بھی ایسا کیا۔ میں نے تبادل بدلے میں چچڑ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی انگلی پر زور سے چک مارا۔ پھر تو چچڑ صاحب کو نانی یاد آگئی۔ زور سے "ہاؤ" کیا۔ وہاں چچڑ نے مجھے دھمکی دی کہ "بے وقوف، بدتمیز، نالائق۔ میں تیرے نانا رضی اکبر سے تجھے پٹواتا ہوں۔" وہاں سے بھاگا اور ڈاک خانے میں میاں صاحب کے سامنے میری شکایت کی کہ آپ کے نواسے نے گستاخی کی ہے اور میری انگلی کاٹ لی ہے۔ میاں صاحب کی عادت تم جانتے ہو۔ انہوں نے کہا "چچڑ۔ تیرے کرتوت ہی ایسے ہیں۔ اس کی سزا تجھے ملی۔ ورنہ عبداللہ بڑا نیک ہے۔" میری بے بے چچڑ کی ہال ہال سن کر بدھانی لیے آگئیں اور پھر تو آگے آگے مسٹر چچڑ اور پیچھے میری بے بے مدھانی اٹھائے اور چچڑ کی ایسی تیسی کرتی ہوئی وہ چچڑ کو راجے کے کھوہ تک چھوڑ آئی۔ وہ دن اور آج کا دن چچڑ نے پھر کسی لڑکے کی چٹکیاں نہیں لیں۔ مجھے آتا دیکھتا ہے تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ چچڑ کی ایک اور عادت یہ تھی کہ اچھے کھاتے پیتے لڑکوں کو تلوں تالی بجا کر بلاتا "اوئے مظفر اسے (تالی) جا اپنی بے بے سے تازہ مکھن لے آ۔" یا "اوئے۔ نانی۔ شیطان دی نانی (تالی) آج منشی جی کو مسّی روٹی کھلا۔" جس طریقے سے عبداللہ یہ باتیں سناتا تھا اور جس مسخرے انداز میں۔ ہنسی سے بل پڑ پڑ جاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے گاؤں کے بچوں کو ٹیکری پر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے عبداللہ کی سرکردگی میں تانی کو گھیر رکھا

تھا اور تالیاں بجا بجا کر ایک ساتھ کورس میں گا رہے تھے۔

تانی گتے دی نانی جلالپور جانا پیا

تانی بیچاری رونے لگا اور پھر حلقے میں کوئی سوراخ دیکھ کر نکل بھاگا۔ سب چھوٹے شیطانوں کا ٹولہ تانی گتے دی نانی جلاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آگے آگے عبداللہ۔ میں نے جا کر تانی بیچارے کو ان شرارتی لڑکوں سے نجات دلائی۔ تب میری بارہ تیرہ سال عمر تھی اور میں خاصا لڑا اونڈ نگڑا تھا۔

غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ میں نے اسلامیہ کالج لاہور میں فسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ داخلے کے بعد ہی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور میں وطن چلا گیا۔ دادا جی تب علیل تھے اور میرے جانے کے کوئی ایک ماہ بعد وفات پا گئے، آخری دم تک ہوش میں رہے اور اپنے بستر سے ایک بادشاہ کی طرح ہدایتیں دیتے۔ میں گھوڑی پر اسی طرح کہیں دن ڈھلے وہاں پہنچا۔ دادا سے مل کر نیچے آیا تو پھوپھی جینا نے باتوں باتوں میں بتایا کہ مہینہ پہلے شربھو مر گئی ہے۔ شربھو کی موت بھی بالکل اس کی دبنگ جفاکش اور وحشیانہ زندگی کے عین مطابق تھی۔ وہ آدھی رات کو اپنے گدھے پر پتی سے لکڑیاں کاٹ کر لا رہی تھی کیونکہ دن کو وہاں محکمہ جنگلات کے بیلداروں کی پہرہ داری رہتی تھی۔ اندھیری کالی سیاہ رات تھی اور یہ دو جنوں جتنی دلیر عورت اکیلے دم پہاڑی سے اتر رہی تھی کہ ایک مریادھے (جنگلی سؤر) نے اس پر حملہ کیا۔ شربھو کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اس شیر کی بچی نے اس سے مریادھے کا جی دار مقابلہ کیا۔ جنگلات والوں نے بعد میں پتہ چلایا کہ انھوں نے اس رات پتی میں

"یا علی مدد" کا نعرہ سنا تھا اور اس کے بعد ایک عورت کی عجیب ہولناک چیخیں اور بددعائیں۔ اس مقابلے کو کسی نے نہیں دیکھا اور کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہوا اور شربھو خونخوار جنگلی سور سے کیسے لڑی مگر دوسرے دن صبح گاؤں کے باہر شربھو کا گدھا لکڑیوں کے گٹھے سے لدا ہوا دیکھا گیا۔ اپنی ہنکانے والی کے بغیر۔ اس سے ہر ایک کو تعجب ہوا اور جب شربھو دیر تک نہ آئی تو بوڑھا رضی اکبر۔ اس کے بیٹے اور دو پوتے گاؤں کی ایک جماعت کے ساتھ تلاش میں چل پڑے۔ ایک پہاڑی پر چند بیٹھے اور اچھلتے ہوئے گدھوں سے سراغ پا کر وہ اُدھر گئے اور وہاں ایک جھاڑی کے پاس انھوں نے شربھو کا زخمی مسخ شدہ اکڑا ہوا جسم پایا۔ آنکھیں سفاکانہ انداز میں کھلی اور پھیلے ہوئے ہاتھ کی مٹھی کے ساتھ کلہاڑی جس پر خون جما ہوا تھا۔ پاس ہی دو قدم پر جنگلی سور سر میں کلہاڑی کے پھل کا قاتل زخم لیے مردہ پڑا تھا۔

میری پھوپھی بینا نے کہا " جو کچھ کہو۔ تھی شربھو کسی جن کی بچی۔ جو عورت ایک مریادھے کو کلہاڑے سے مار سکتی ہے اس کے جگر سے اور زور کو دھن ہے۔۔"

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ساتھ جوڑا لے جایا گیا اور جب اسے دفنایا گیا تو نہ صرف کھوار بلکہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ میری پھوپھی نے ڈرامائی انداز میں یہ واقعہ سنایا تو میں نے محسوس کیا کہ شربھو جاتے جاتے گاؤں کی تاریخ میں ایک امر (LEGEND) چھوڑ گئی ہے جو پشتوں میں نہیں بھلائی جائے گی۔

دوسری صبح میں شربھو کے گھر اس کے بیٹوں سے تعزیت کرنے اور فاتحہ پڑھنے گیا۔ رضی اکبر اپنے لیٹر بکس کے نیچے چٹائی پر بیٹھا تھا ــــ خمیدہ اور شکستہ۔ وہ اپنی بیٹی کی موت کے صدمے سے دنوں میں بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور پہلے سے بھی زیادہ

روکھا اور زہریلا۔ اس کی آنکھیں خالی اور کوری نظر آتی تھیں جیسے وہ پتھر کی ہوں۔
میں نے جا کر کہا "السلام علیکم چاچا جی۔"
اس نے پہلے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نہیں پہچانا۔ پھر اس نے کہا "وعلیکم السلام۔ آؤ جی۔ جی آیا نوں۔ لفافے کارڈ لینے آئے ہو؟" وہ اچھی طرح میرے آنے کا مقصد جانتا تھا۔
"نہیں چاچا جی۔ اجازت دیں تو بیٹھ جاؤں۔ ماسی سرفراز کے انتقال کا سن کر بڑا افسوس ہوا۔ بڑی شیر دل عورت تھی۔ مشیتِ ایزدی کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔"
"مشیتِ ایزدی رضی اکبر دے خاندان واسطے ای رہ گئی ہے۔" وہ بڑبڑایا اور پھر ایک زہر خند کے ساتھ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔
"میں نے کہا کہ ہر ایک کی زندگی لکھی ہوئی ہے اور سب کو باری باری جانا ہے۔ لیکن کئی تو یہاں دھرنا مار کر بیٹھے ہیں۔ ایہہ بڈھے نیاز احمد ہوریں حالی جیندے نے۔ مرسے نہیں۔"
اپنے دادا کے بارے میں اس کا یہ حوالہ ایک جلتا ہوا انگارہ تھا مگر میں اسے چبا گیا۔ رضی اکبر کا غالباً بڑھاپے کے صدمے سے دماغ چل گیا تھا۔
میں نے کہا۔ "چاچا جی۔ آپ کی اس بات کے بعد مجھے فاتحہ نہیں کہنی چاہیے۔ مگر سرفراز بیگم آپ کی بیٹی تھی۔ میں مرحومہ کی فاتحہ کہنے آیا ہوں۔
میں نے ہاتھ اٹھائے۔ اس نے سرسری اور بے دلی سے ہاتھ اٹھائے اور ہم نے فاتحہ پڑھی۔ فوراً بعد رضی اکبر نے کہا۔ "نیاز احمد کے پاس میرے نواسوں کی کچھ زمین گروی رکھی ہوئی تھی جس پر وہ قبضہ کر بیٹھا ہے۔ اس کو کہو کر میرے نواسوں

کا حق نہ مارے اور اس سے پہلے کہ فرشتۂ اجل اس کی روح کو واگذار کرے اس ظلم سے توبہ کرے۔"

بوڑھے کی باتوں نے میرا دل بڑا میلا کیا۔ میں نے تحمل سے کام لیا اور اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا "عبداللہ کہاں ہے؟"

"عبداللہ — حافظ عبداللہ۔ وہ واڑے پیچھے کاٹنے گیا ہوگا۔"

میں وہاں سے نہر کے پار واڑے میں گیا۔ سورج چمک رہا تھا اور اناج کے ادھ کٹے کھیت سنہری دھوپ میں نہا رہے تھے۔ ایک باڑ کے پاس میں نے عبداللہ کو ایک ٹیکری پر دیکھا۔ وہ ایک درانتی سے کچر کچر گھاس کاٹ رہا تھا۔ ایک دیہاتی لڑکے کی طرح تازہ رُو اور صحتمند۔ اس کے چہرے پر طمانیت اور سکون تھا اور ہونٹوں پر ماہیا کی گنگناہٹ۔

"آؤ بھائی تناول۔ کب آئے ہو؟"

ہم نے ہاتھ ملائے۔ وہ مجھ سے چار یا پانچ سال چھوٹا تھا۔

"میں تمہارے نانا کے پاس فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم واڑے میں گئے ہوئے۔"

"بے بے نے مرباد ھے کو مار ڈالا۔"

"ہاں مجھے پتہ لگ گیا تھا۔ تمہاری بے بے بڑی بہادر تھی۔"

"جنیا والا دل تھا بے بے کا . . . ." وہ پھر درانتی چلانے لگا "تناول میں نے قرآن حفظ کر لیا ہے۔"

"حافظ عبداللہ بن گئے ہو گویا۔"

"اور میں اب بچپن کے سکول میں جاتا ہوں کھوہار میں تو صرف پانچ جماعتیں ہیں۔ بچپن میں ہائی سکول ہے۔ مجھے بھی اے۔ بی۔ سی آ گئی ہے۔ وٹ از یور نیم۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔ دِن ٹو بجل مائی شو" اور وہ فخر سے مسکرایا۔

پھر وہ بولا "تنا دل۔ یہ جو ہوائی جہاز اُڑا تے ہیں کیسے بنتے ہیں؟"

"کیسے کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرا دل کرتا ہے میں ہوائی جہاز اڑایا کروں۔ ہوائی جہاز مجھے بڑا پسند ہے، پر میاں جی کہتے ہیں وہ گر پڑتے ہیں۔"

"ہاں گر تو پڑتے ہیں۔" میں نے اسے دو تین ہوائی جہازوں کے گرنے کے حادثات سنائے۔ جرمن زیپلسن کا قصّہ بھی جسے ہوا میں آگ لگ گئی تھی۔

ہم گھاس کی کتر کتر اور پرندوں کی چہچہاہٹوں میں بہت سی باتیں کرتے رہے۔ وہ سوال پوچھتا تھکتا نہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بائیسکوپ کیا ہوتا ہے۔ اس نے زینب بی بی کے گھر بھونپو والے گراموفون کے ریکارڈ سنے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ اس میں کوئی گانے والی رُوح چھپی ہوتی ہے۔ اتنی باتیں ہم نے کیں۔

میں نے کہا "تم درانتی سے گھاس بڑی تیزی سے کاٹتے ہو۔"

"تم کاٹو۔ بڑا آسان ہے۔" اور اس نے درانتی میرے ہاتھ میں دے دی۔

میں نے گھاس کاٹنے کی کوشش کی مگر اسے اتنا آسان نہ پایا۔ وہ ہنسنے لگا اور پھر اس نے مجھے اس کا گر سمجھایا کہ درانتی کو اس طرح پکڑتے ہیں اور اس رُخ چلاتے ہیں اور یہ کہ درانتی کا پھل پہلے ٹھیک کر لینا چاہیے اور پھر کسی پتھر پہ تیز۔ میں نے پھر کوشش کی تو اپنا ہاتھ تھوڑا سا کاٹ لیا۔ خون بہنے لگا۔ اور عبداللہ

نہر کے کنارے سے مٹی پر ریت لے آیا جسے اس نے زخم پر بکھیر دیا۔ پہلی دفعہ ہاتھ ہر کسی کا کٹتا ہے" اس نے میری حوصلہ افزائی کی "تم میرے ساتھ آیا کرو۔ میں تمہیں فٹافٹ سکھا دوں گا۔ میں اب گھر کے بہت سے کام خود کرتا ہوں۔ پہلے تو میری بیبے بی تھی۔ میں اٹیرن سوت بھی کات لیتا ہوں اور موجے بھی گانٹھ لیتا ہوں مگر ہوائی جہاز اڑانا مجھے نہیں آیا۔"

"ہوائی جہاز تمہارے پاس ہے کہاں؟"

"تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں۔ اگلے سال میں آؤں گا اور ہم دونوں اسے اڑایا کریں گے۔ گاؤں کے اوپر اور بی کے اوپر۔"

"ہاہا۔ ہاہا" وہ درانتی پھینک کر خوشی سے ناچنے لگا۔ اور پھر اس نے شکایت کی کہ میرے پاس تھا تو میں اس پر کیوں نہیں آیا۔ ریل گاڑی میں کیوں۔ میں نے کوئی مناسب عذر کیا۔

ہم واپس ایک بڑا سا گٹھا لے کر آئے اور چھپر کے پاس پھر ملنے کا وعدہ کر کے لوٹ گئے۔

ایک بار میں پھر اسے ملا۔ میں ساوی گھوڑی پر اپنے ایک رشتہ دار کو ملنے پنجسن جا رہا تھا۔ راستے میں سڑک پر عبداللہ اور اس کے پانچ چھ ساتھی بستے بغل میں دابے پیدل سکول کو رواں تھے۔ میں نے اس کو گھوڑی پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ ساوی گھوڑی، میں نے کہا ہے امیرانہ خوبو کی وضعدار گھوڑی تھی اور بعض وقت وہ اتنی بڑگیینہ ہو جاتی تھی جتنی کوئی گھوڑی ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنی پیٹھ پر سواری کرانے

سے وہ خوش نہیں ہوتی تھی اور گویا اخلاقاً اور مجبوراً ایسا کرتی تھی۔ اب جب میں نے عبداللہ کو زین کے پیچھے نمدے کے تہہ پہ بٹھایا تو سادی نے اسے ناپسند کیا۔ وہ بپھری۔ اس کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگے۔ وہ اگلی ٹانگیں اٹھا کر ہمیں گرانے کی نیت سے کودی۔ مگر میں نے اسے لگام سے قابو رکھا اور رکابوں میں پاؤں مضبوطی سے جمائے۔ جیسا کہ نورے مراثی نے مجھے سکھایا تھا۔

"دیکھو۔ دیکھو" عبداللہ نے کہا "سادی خشتاں کرنے لگی ہے۔"

میں ابھی اچھا سوار نہیں تھا اور سادی کی متلون مزاجی سے ڈرتا تھا۔ میں دل میں ڈر گیا لیکن ظاہراً بڑی بہادری سے کہا۔ "اس حرامن کو کبھی کبھی جن چڑھتا ہے میں ابھی اس کو سیدھا کرتا ہوں۔"

جب سادی ہمیں گرا نہ سکی تو وہ بپھری ہوئی اپنی خود سری سے پویہ میں ہو گئی۔ میں اس کی ایک آنکھ میں غصے اور کینے کی دمک دیکھ سکتا تھا اور اگرچہ میں نے عبداللہ پر رعب ڈالنے کے لیے بڑے مشاق شاہسوار کا طور اختیار کیا جو گھوڑوں کی رمزوں اور چالوں سے واقف ہو مگر دل میں میں بے حد خائف تھا۔ میرا پسینہ چھوٹ گیا۔ عبداللہ نے کہا۔ "بھائی شادل۔ تمہیں گھوڑے کی سواری نہیں آتی۔ اسے کھڑا کرو۔ کھڑا کرو.... ڈر۔ ڈر۔ ساویئے کی پٹے کرنی اے۔ ڈر۔ ڈر۔"

ہم ایک رستے پہ جا رہے تھے جس کے ایک طرف کیکر کے کانٹوں کی باڑ تھی۔ سادی نے کیا کیا کہ اپنے بدن کو باڑ کے ساتھ ساتھ رگڑ کر بھاگنے لگی تاکہ ہمیں کانٹے چبھیں۔ وہاں سے وہ پل کے پاس نہر کی پٹڑی پہ آ گئی۔ اسی طرح کودتی ہوئی شرارت پہ آمادہ۔ اور میں اپنی سٹی بھول گیا تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس کا ارادہ

ہمیں نہر میں اچھال پھینکنے کا ہے مگر اس کا ارادہ یہ نہ تھا۔ صرف وہ برے نومشق سواروں کو بھانپ لیتی تھی۔

وہ پٹڑی پر بھاگی۔ ہم اس کی پیٹھ پر جمے رہے۔ عبداللہ نے کہا "اس کی باگیں مجھے پکڑاؤ۔ شنادل۔" مگر اتنے میں زین کا تنگ کسی طرح ڈھیلا ہونے سے زین الٹ گئی اور اس کے ساتھ میں زمین پر آ رہا۔ گھوڑی کی رفتار بھی ہلکی تھی۔ عبداللہ بھی کود کر نیچے اتر آیا۔ ساوی فوراً وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کی ٹانگوں کی نسیں کانپ رہی تھیں۔

عبداللہ خوب ہنسا۔ پھر اس نے گھوڑی کو تھاپیاں دیں اور پھر اس نے نمدے کے نہر کو بچھا کر اس پر زین کے تنگ کو مناسب طریق پر کسا۔ نہ کم اور نہ زیادہ۔ اس نے کہا تمہیں سواری نہیں آتی۔ اب شنادل۔ میں آگے بیٹھتا ہوں اور تم پیچھے۔ اب ساوی خشتاں نہیں کرے گی۔

اس نے مجھے چڑھایا اور پھر خود رکاب میں پاؤں رکھ کر بڑی پھرتی اور صفائی سے اوپر زین پر کود گیا۔ باگیں ہاتھ میں سنبھالیں۔ پہلے تو ساوی نے اپنی پہلی اڑی کرنے کی کوشش کی۔ کبھی گھومتی کبھی اچھلتی مگر عبداللہ نے تھپکیوں، بولیوں اور باگ کے اشاروں سے اسے رام کر لیا۔ وہ بھانپ گئی کہ اب اس کی پشت پر ایک سوار ہے اور اس کی کچھ نہ چلے گی۔ وہ اب عبداللہ کی مرضی پر کبھی دُلکی چلتی کبھی پوپیہ اور کبھی آہستہ آہستہ۔ راستہ بھر عبداللہ مجھے گھوڑے کے گر سکھاتا رہا جس طرح اس نے ایک دفعہ مجھے درانتی سے گھاس کاٹنا سکھایا تھا۔ وہ پیچھے تر پر آ گیا اور میں زین پر۔ اب کے میں کافی سدھا ہوا سوار تھا اور ساوی نے راستہ بھر کوئی

جنکشن کی بجائے نہ گی جنکشن آنے پر میں نے عبداللہ کو سڑک کے دوشاخے پر اتارا اور خود آگے موج پور کی سمت چل پڑا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ مسکراتا ہوا اور اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا۔ بایاں ہاتھ۔ عبداللہ ابھی کھبچو تھا۔

اس کے بعد میں ایک دو دفعہ گھر گیا اور پھر حالات کے تحت تین چار سال تک نہ جا سکا۔ میرے دادا کی وفات کے بعد کھوہ، وہ پہلا سا کھوہ نہ رہا۔ وقت کے ساتھ کتنے ہی انقلابات آجاتے ہیں۔ چیزوں میں اور انسانوں میں ہم خود بدل جاتے ہیں اور ایک طرح سوچو تو نہیں بھی بدلتے۔ میں اپنے بچپن اور لڑکپن سے اپنے آپ میں بڑی تبدیلی پاتا ہوں۔ لیکن شاید اسی زمانے کے تاثرات، عادات، خوشبوؤں اور نظاروں نے ہی مجھے وہ آدمی بنایا ہے جو میں اب ہوں۔ ممکن ہے اپنی اصل میں میں وہی معصوم، کھویا ہوا، شرارتی بچہ ہوں۔ مگر یہ میں جانتا ہوں کہ چیزوں میں وہ پہلی سی تازگی اور بھڑک اب مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ زمین پر پھیلی ہوئی ایک سنہری دھند اب اٹھ گئی ہے ..... دادا کے تین ماہ بعد میری دادی بھی سیڑھیوں سے گر کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اگلے سال میری دونوں بیوہ خالائیں بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئیں۔ پہلے بڑی خالہ نذیراں تپ محرقہ میں مر گئی۔ میری چھوٹی خالہ کو اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ اگرچہ بڑی اسے جھڑکتی اور ٹوکتی رہتی تھی۔ وہ گھلنے لگی اور آخر ایک مہینے کے بعد اپنی بڑی بہن سے جا ملی۔ میری چھوٹی پھوپھی جینا اپنے خاوند گنتیوں والے ماما غلام رسول کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر خانیوال کے پاس چلی گئی۔ جہاں انہیں آبادکاری کی شرائط پر کچھ مربعے زمین مل گئی تھی.....

۱۹۴۸ء میں میں گاؤں چند روز کے لیے گیا۔ وہاں پچی کی زمینوں پر ہمارے

چند شریکوں نے قبضہ کر لیا تھا اور میرے والد نے مجھے لکھا کہ وہاں جا کر اس ٹنٹے کو چکاؤں۔ میں رات کو اپنے چوبارے پر جا رہا۔ میرے دادا کے پرانے مراثی نورے کی گھر والی نے مجھے روٹی کھلائی۔ دوسرے دن شام کو میں پٹواری سے مل کر گھوڑی پر واڑے سے آ رہا تھا کہ راستے میں خاندان کے قبرستان کے پاس میں فاتحہ پڑھنے کے لیے رُکا۔ جب میں بچپن میں اپنے دادا کے ہمراہ یہاں آیا کرتا تو سیلی پختہ اینٹوں کی کائی سے سبز قد آدم چار دیواری تقریباً محفوظ تھی اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹنے والا آہنی دروازہ تھا تاکہ گائیں بھینسیں اندر نہ جا سکیں۔ میں اس دروازے پر جھوٹے لیا کرتا تھا۔ اندر لمبی گھاس میں ہمارے مرے ہوئے بڑوں کی پختہ قبریں تھیں ـــــ ہر قبر کے اوپر ایک کتبہ تھا جس پر مرنے والے یا مرنے والی کی تاریخ پیدائش درج تھی اور اس کے نیچے ایک تعریفی شعر جس سے مرحوم کی تاریخِ وفات نکلتی تھی۔ میرا دادا ایک عالم اور شاعر تھا اور یہ کتبوں پر اشعار اس کے تھے۔ اب میں نے دیکھا کہ چار دیواری بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور لوگ اس کی اینٹیں اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ چکر والا آہنی پھاٹک بھی غائب تھا۔ قبریں سب شکستہ حالت میں تھیں اور اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں ڈھنپی ہوئیں۔ میں شام کے دھندلکے میں کتبوں کی عبارت پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جو اب مٹ چکی تھیں۔ تب میں نے ایک دیہاتی لڑکے کو منہ پہ ڈھاٹا باندھے اور ہاتھ میں کوئی چیز لیے سامنے سے برڈیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی چال اور وضع میں مجھے کوئی چیز آشنا لگی اور پھر میں پکارا "عبداللہ! حافظ عبداللہ!!" وہ ٹھٹکا۔ اور پھر اس نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی کیونکہ یہ وہی تھا۔ اب سترہ اٹھارہ برس کا لمبا، تنومند لڑکا۔ جوانی کی سرحد

پر۔ داڑھی کا سبزہ نمودار۔

"ثناء الحق۔ بھائی ثناء الحق" اس کی آواز میں بلوغت اور مردانگی کا بھاری پن تھا۔ "السلام علیکم۔ کب آئے ہو؟ خیر خیریت ہے؟"

اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی اور مجھے عجیب سا لگا۔ شاید میں نے سوچا ـــ اس کے ابا کے خون میں رچی ہوئی جدی اکھڑپن اور درشتی اب جب کہ وہ جوان ہو گیا ہے اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ اس کے انداز میں کچھ راز داری، کچھ بھید کا شائبہ میں نے محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملنے سے کتراتی رہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے؟

"کہاں جا رہے ہو عبداللہ؟"

"بردشیاں۔ بیٹھے کاٹنے"

"اس وقت؟ اور یہ منہ پر ڈھاٹا کیوں باندھا ہے؟"

"منہ سوج گیا ہے اس لیے رومال باندھ لیا ہے"

"آج کل کیا کر رہے ہو؟ چاچا جارحی اکبر کا کیا حال ہے؟"

"چاچا ٹھیک ہے۔ میں نے مڈل پاس کر کے سکول چھوڑ دیا ہے۔ اچھا تم اب کچھ دن رہو گے؟ میں کل ملنے آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ"

وہ جلدی میں تھا۔ میں اسے اس گھرے ہوتے جھٹپٹے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھتا رہا ـــ یہ تعجب کرتے ہوئے کہ وہ کس طرح بدل گیا ہے اور کیسے اتنا بے رُخا اور روکھا ہو گیا ہے۔ پھر قبرستان میں کچھ وقت گزار کر اور فاتحہ پڑھنے کے بعد آگے گاؤں کی طرف چل دیا۔

میں گاؤں کی آوازوں میں جب دیئے سے روشن کمرے میں کھانا کھانے بیٹھا تو نورا مراثی نیچے اکڑوں بیٹھ کر اور حقہ پیتا ہوا مجھے گاؤں کی خبریں دینے لگا۔ وہ ایک چھوٹا مجبوکبڑا سا آدمی تھا۔ ایک بکرے جیسی چھدری داڑھی کے ساتھ جواب سفید ہو چلی تھی۔ اس میں اپنی نسل کی ساری لطیفہ گوئی اور نقل کرنے کی صلاحیت تھی اور اس کے چٹکلوں اور باتوں نے مجھے خوب لطف دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مولوی غوث محمد نے دوسرا نکاح پڑھوا لیا ہے۔ چٹی داڑھی اور آٹا خراب۔ لالو ماچھی کی بیوی پنجسن کے علیا کمہار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بابا فضلے کے دو لڑکے فوج میں چلے گئے ہیں۔ میں نے اس سے قبرستان میں حافظ عبداللہ سے ملاقات کا اور اس کے عجیب بے پروائی کے رویے کا ذکر کیا۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ اب گاؤں کی گلیوں میں بے لگام گھوڑے کی طرح مستایا پھرتا ہے، ہر وقت ریشمی لاچہ میں چھیل چھبیلا بنا ہوا۔ بات بات پہ ہنستا ہے اور گاؤں کی کنواریوں کو دیکھ کر اس کے منہ پہ ہیر وارث شاہ یا ماہیے کے بول آجاتے ہیں۔ وہ رانجھا اور مہینوال بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"نورے" میں نے کہا "جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ہم سب اس منزل میں سے گزرتے ہیں۔"

"سچ ہے میاں شادول۔ کیئیوں پر اس آندھی کو چڑھتے دیکھا ہے۔ یہ جوانیوں کا بھوت بڑا برا ہے۔ حافظ مجنوں کو دیکھو۔ نہ صورت نہ شکل۔ اس عمر میں بھی عورتوں کی مجلس میں جا بیٹھتا ہے اور جب لڑکیاں اس سے ٹھٹھا مخول کر کے اٹھا دیتی ہیں تو کہتا ہے۔ دل کر یندا مجلس کریئے باہن نہ دیندیاں گڑیاں۔ اگلے دن مجھے سکول

کے پاس ملا اور کہنے لگا۔ ساٹھ برس کا ہو گیا یہ حافظ مجنوں مگر اب بھی جنانی کو دیکھ کر دل مچل جاتا ہے۔ گناہ کمانے کی بات ہے۔ جنانی شے ہی خدا نے عجیب بنائی ہے اور ہر ایک جنانی کا الگ الگ سواد۔ تو میاں تناول۔ حافظ عبداللہ پہ تو مست جوانی گھر کر آئی ہے۔"

پھر اُس نے مجھے حافظ مجنوں کی نقل کر کے خوب خوب ہنسایا اور میں سو گیا۔ صبح کاذب کے وقت مسجد میں اذان سے میری آنکھ کھلی۔ تم جانتے ہو میں نماز کم ہی پڑھتا ہوں مگر گاؤں میں خدا جانے کیوں مسجد میں جا کر جماعت میں نماز پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے سادہ دہقانی لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ کر عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے مسجد میں جا کر مولوی غلام غوث کی امامت میں نماز پڑھی۔ اس کا لہجہ اسی طرح دہقانی اور اکھڑا سا تھا مگر وہ میرے کانوں پہ گراں نہ گزرا۔ وہ مجھے اس ماحول میں کچھ اچھا ہی لگا۔ دعا پڑھنے اور حاضرین سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں اٹھا تو میں نے حافظ عبداللہ کو وہاں دیکھا۔ ہم اکٹھے جوتیاں پہن کر باہر نکلے۔ گلی میں مویشی اپنے گلے کی گھنٹیاں ٹنٹناتے گھاس چرنے ریڑیوں میں جا رہے تھے۔ گاؤں جاگ اٹھا تھا۔

"عبداللہ" میں نے کہا "مجھے پتہ لگا ہے کہ اس گاؤں میں رانجھے کی روایت اب تمہارے دم قدم سے ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا بھائی تناول ؟" اس کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ اس نے اس کا بُرا مانا ہے۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنسا اور اس نے میرے ہاتھ پہ ہاتھ مارا ۔۔ بالکل ایک جوان کی طرح۔

"بھائی تناول ۔ مجھے معاف کر دو ۔ میں کل شام تم سے اوپرا ملا ۔ میں ایک ضروری کام سے جلدی میں تھا ۔ تم نے پتہ نہیں اس سے کیا سمجھا ہو گا ۔ اب میں فارغ ہوں اور میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں ۔"

ہم اوپر چوبارے میں آئے اور بیٹھ گئے ۔

"بھلا بوجھو بھائی تناول ۔ میں کل شام کو کہاں جا رہا تھا ؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں ۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم مویشیوں کے لیے چارہ کاٹنے جا رہے ہو ۔ میں دل میں حیران تھا کہ اس کام کے لیے یہ کونسا وقت ہے ۔"

"میں تمہیں بتا دوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا ۔ لیکن تم میرے پرانے بیلی اور بڑے بھائی ہو ۔ تم سے کیسے چھپاؤں ۔ میں ایک آدمی کو ٹوکے سے قتل کرنے جا رہا تھا ۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں "کیوں ! تم نے اسے قتل کر دیا پھر ؟"

"نہیں " عبداللہ نے کہا " اس کی قسمت اچھی تھی ۔ وہ مجھے مل جاتا تو میں اس کو کبھی نہ چھوڑتا ۔ اس کی تکہ بوٹی کر دیتا ۔ وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے ۔"

"تمہاری قسمت اچھی تھی ۔" میں نے تلخی سے کہا " تم خون کر دیتے تو پولیس تمہیں پکڑ کر لے جاتی اور تم پھانسی چڑھ جاتے ۔ تم اتنے اچھے لڑکے تھے ۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم بڑے ہو کر قاتل بن سکتے ہو ۔"

"بھائی تناول ۔ تم تو غصے ہو گئے ۔ وہ حرامزادہ بڑا بھیڑا آدمی تھا ۔ اس نے میری شاداں کے ساتھ فحش مذاق کیا تھا اور اس پہ دست درازی کرنے کی بھی کوشش

کی تھی۔ میں بڑا بے غیرت ہوتا جو اس کو پی جاتا۔ میں مرد ہوں۔"

پھر اس نے مجھے ساری کہانی سنائی۔ گاؤں کے ایک سفید پوش برکت کی لڑکی جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتا تھا اپنے چھوٹے دس سالہ بھائی کے ہمراہ اپنے ماموں کے ہاں رسول پور گئی تھی۔ جب وہ گھوڑی پر واپس آرہے تھے تو ایک شخص غلام محمد گامی اور اس کے ایک ساتھی لفنگے نے انہیں راستہ میں ایک کیکروں کی ڈھک کے پاس روک لیا اور شاداں کو چھیڑنے لگے۔ شاداں ایک دلیر اور پر حوصلہ لڑکی تھی اس نے ان کو خوب خوب سنائیں، مگر آخر وہ اکیلی عورت تھی اور اس کے مدِمقابل دو تگڑے نوجوان! اور وہ دل میں بڑی ڈری۔ جگہ بڑی بیابان تھی۔ گامے نے بڑھ کر لڑکی کو بازو سے نیچے کھینچنے کی کوشش کی۔ شاداں کا چھوٹا بھائی رونے لگا۔ خدا نے اس کی آبرو کی حفاظت کی کیونکہ اس وقت سڑک پر سوڑھی شریف کے پیر صاحب اور ان کی جماعت کے کچھ لوگ اچانک گھوڑیوں پہ آتے نظر آئے۔ گامے کی ان کو دیکھ کر سٹی گم ہو گئی اور شاداں کو دھمکی دے کر کہ وہ اس کے ہاتھ سے نہیں بچے گی، گاما اور اس کے ساتھی کیکروں میں گم ہو گئے۔ شاداں نے اپنی گھوڑی کو تیز کیا اور اسے دوڑاتی ہوئی پیر صاحب کی جماعت کے پاس سے گزری۔ وہ ایک لڑکی کو اس طرح تیز گھوڑی دوڑاتے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور پیر صاحب نے پوچھا بھی "دھیئے خیر ہے؟" مگر شاداں نے جانور کی رفتار کم نہ کی اور اس طرح اپنے گاؤں میں ہانپتی کانپتی پہنچی۔

شاداں نے تین چار روز ہوئے اس وارڈ سے میں اس کا ذکر روتے ہوئے کیا اور میں نے قسم کھائی کہ میں گامے کو نہیں چھوڑوں گا اور وہ زندہ نہیں رہے گا۔

ایک دن رسول پور جا کر اس کے متعلق مجھے پتہ لگا کہ اس کا باپ اب جہلم میں سکونت پذیر ہے جہاں وہ کسی وکیل کا منشی ہے۔ گامن پیچھے کہنے کو تو زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے مگر اس کا اور اس کی لفنگوں کی ٹولی کا کام سوائے عیلی عیلی کرنے اور گاؤں کی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے کے اور کچھ نہیں۔ میں نے اس کا گھر دیکھا اور اس جگہ کا پتہ لگایا جہاں وہ سوتا تھا۔ کل شام کو میں اسے ختم کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ اسی لیے میں تمہارے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا کیونکہ رسول پور آٹھ کوس ہے اور مجھے کافی دور جانا تھا۔ مگر افسوس اس کی حیاتی کچھ دن اور لکھی ہوئی ہے۔ ایک دن پہلے وہ اپنے باپ کی سرزنش سے بگڑ کر جہلم جا بھرتی ہو گیا۔"

"تمہارا مطلب ہے تم کل شام رسالپور گئے بھی اور لوٹے بھی؟ سولہ کوس؟"

"یہ کوئی بات نہیں۔ میں کوئی تین بجے مسجد میں آیا۔ گھر بھی نہیں گیا۔ میاں صاحب فکر کر رہے ہوں گے۔ دیکھو شنادل تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔" پھر بولا "شنادل تم نے میری شاداں کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"میں تمہیں دکھاؤں گا۔ سارے گاؤں میں اس جیسی سوہنی اور جاندار کڑی اور کوئی نہیں۔ اور تم مان جاؤ گے کہ عبداللہ یونہی اس کے لیے ہوکے نہیں بھرتا۔ یم ورگا اس کا بوٹا قد ہے اور اس کی آنکھیں نشے کے کٹورے ہیں۔ پھول گلاب کا ہے شاداں۔"

میں ہنسا۔ "عبداللہ۔ تم تو شاعر ہو گئے ہو۔"

"شنادل چیز ہی ایسی ہے — چپ شنادل وہ دیکھو۔ وہ آ رہی ہے۔

چاول دیکھو۔"

میں نے لکڑی کی نیچی بالکنی میں سے دیکھا۔ گلی کے موڑ پر سے ننگے پاؤں، نیلے تہبند اور سبز چھینٹ کی لمبی قمیص میں ایک لڑکی سر پر گھڑا رکھے آرہی تھی ——— دوسری دیہاتی لڑکیوں کی طرح کنویں پر سے پانی بھرنے جاتی ہوئی۔ وہ واقعی خوبصورت تھی، بانکی اور چھیل چھبیلی۔ رنگ میں صباحت تھی اور اس کے چہرے کے خدوخال تیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اتنی شرمیلی اور معصوم لگتی تھی جیسے اس نے کبھی کسی نوجوان دیہاتی لڑکے کی خواہش سے جلتی ہوئی نظروں کو اپنے جسم میں کھبتے نہ محسوس کیا ہو۔ جیسے کبھی اس کے ارمان نہ جاگے ہوں۔ سب دیہاتی نوخیز لڑکیاں ایسی ہی لگتی ہیں اور ان کے سینوں میں جذبات کا کتنا متلاطم طوفان اور کتنے رنگین سپنے ہوتے ہیں یہ خدا ہی جانتا ہے۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور اس نے ہمیں بالکنی پر کھڑے اور اسے دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے میں آگ سی دوڑ گئی اور اس کی چال میں آپ ہی آپ لڑکھڑاہٹ آگئی ..... اور اس کے سر پر کپڑے کے چھلے پر رکھے ہوئے گھڑے کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنے لانبے نازک ہاتھوں سے گھڑے کو سنبھالتی وہ الٹا اور ایک تڑاخ سے گلی کے فرش پر گر کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔

عبداللہ نے اوپر سے کہا "کڑیئے۔ گھڑا توڑ دتا ای۔ تینوں بےبے مارے گی۔"

گھڑے کے ٹوٹنے سے وہ بڑی پریشان ہوئی اور کچھ دیر وہاں گم سم کھڑی رہی اور پھر چہرے پر ایک مسکراہٹ لیے وہ الٹے پاؤں بھاگی۔ سامنے سے بابا شاہو اپنی

لاٹھی لیے آتا تھا۔ شاداں اس سے ٹکرائی اور شاہو کی لاٹھی گر پڑی۔ شاہو نے گری ہوئی لاٹھی کو اٹھایا اور بھاگتی ہوئی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس نے گلی کو سنایا "اے برکتے دی کڑ ئیے۔ تو مجھے بھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے"

"اس کا گھڑا تم نے تڑوایا ہے" میں نے عبداللہ سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور پھر وہ سنجیدہ ہو گیا "تم میرے بھائی ہو۔ میری مدد کرو۔ قول دو کہ تم میری مدد کرو گے"

اس نے مجھے بتایا کہ شاداں کی بے بے تو اسے پسند کرتی ہے لیکن برکت شاداں کا رشتہ اپنی بہن کے لڑکے سے کرنا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی میں اس بات پر ناچاقی رہتی ہے۔ تم برکت سے بات کرو" عبداللہ نے کہا "تمہاری بات کا بڑا اثر ہوگا۔ آخر مجھ میں کوئی نقص تو ہے نہیں میں خدا کے فضل سے جوان اور تندرست ہوں اور میں اپنے چاچے کے ساتھ مل کے آٹے کی مشین کا کام شروع کر رہا ہوں۔ خدا اس میں برکت دے گا۔ تم برکتے کو کہنا کہ شاداں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سچ مچ شاداں میں اس کو بڑا خوش رکھوں گا ـــــ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ ایک محبت میں مخمور نوجوان کی طرح باتیں کرتا رہا۔ میں مسکرایا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں برکت سے ضرور بات کروں گا۔ وہ چلا گیا۔ تو میں تھوڑی دیر کے بعد برکت کے ہاں گیا۔ وہ میرے دادا کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے طریقے سے لڑکیوں کے لیے اچھے رشتے ملنے کی مشکلات کا ذکر کیا۔ تم میری لوگوں کو اکسانے کی صلاحیت تو جانتے ہو۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میں نے کوئی دو گھنٹے کی

تقریر کے بعد اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ شاداں کا رشتہ عبداللہ سے کر دے گا۔

"پتر ثناء الحق" اس نے کہا "تم مجھے نہ کہتے تو میں کبھی نہ مانتا تم بڑے سیانے ہو اور تمہاری بات کو میں موڑ نہیں سکتا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ بڈھا سڑی رضی اکبر میرے پاس عبداللہ کا رشتہ مانگنے آئے گا۔"

"وہ آئے گا" میں نے کہا "اور اگر وہ نہ بھی آئے تو کوئی بات نہیں عبداللہ بجو اور نثر بھو کا لاڈ کلہ ہے۔ بجو خود لاہور سے آ کر تمہارے پاؤں پڑے گا۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ برکت کو میں نے بڑی تدبیر سے شیشے میں اتارا ہے۔" عبداللہ شام کو آیا تو میں نے اسے یہ خوشخبری دی۔

وہ بے حد خوش ہوا "میں جانتا ہوں میرے بخت اچھے ہیں ثنا دل تم نے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔۔۔۔۔ تمہارے پاؤں دباؤں!"

"مگر عبداللہ" میں نے کہا "کیا رضی اکبر برکت کے پاس شاداں کا رشتہ مانگنے آئے گا؟"

"یہ میرا کام ہے" وہ بولا "میاں جی دوسروں کے لیے کتنے ہی درشت ہوں، میرے ساتھ ان کا بڑا لاڈ ہے۔۔۔ وہ جائیں گے۔"

میں گاؤں میں تین چار دن اور رہا۔ میرے جانے سے پہلے معاملات طے ہو گئے تھے اور اس کی شادی کی بات چیت پکی ہو چکی تھی۔

عبداللہ مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے آیا۔۔۔ سارا راستہ وہ ہنسی مذاق

کی باتیں کرتا رہا اور ماہیا گاتا رہا۔ اس نے مجھ سے شادی میں آنے کا وعدہ لیا اور کہا کہ وہ مجھے کارڈ لکھے گا۔ وہ اس وقت کتنا خوش اور بے فکر تھا، ایک ایسے شخص کی طرح جس کی عزیز ترین خواہش پوری ہو گئی ہو۔

پولیس اسٹیشن کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ چاند اب برف کی طرح سفید اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا اور تارے نیلے سیاہ غبار میں چاروں طرف چھٹکے ہوئے مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ کبھی کبھی پتے ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے کھڑکھڑاتے۔
"ہمیں اب دیوار پھاند کر ہی جانا پڑے گا۔ بارہ ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔
"فکر مت کرو" ثناءالحق نے کہا "رات جوان ہے اور رات ہماری ہے ...... اور کتنا کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ کتنی یادیں میرے دماغ میں ہجوم بن کر ابھر رہی ہیں — مگر کسی اور وقت۔ تم تھک گئے ہو گے اور تمہیں نیند آ رہی ہو گی۔ میں اب زیادہ دیر نہیں لوں گا ..... ہاں حافظ عبداللہ کی شادی میرا خیال ہے، مارچ ۱۹۴۰ء میں مجھے لاہور اپنے کالج کے پتے پر اس کا کارڈ ملا کہ اس کی شادی فلاں تاریخ کو طے پائی ہے اور میں ضرور آؤں۔ میں ان دنوں امتحان کی تیاری میں مصروف تھا لیکن میں نے ایک دن کے لیے گاؤں جانے اور شادی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ جوڑے اسٹیشن پر ہمارا مراثی نورا گھوڑی لے کر پہنچا ہوا تھا۔ یہ ساوی نہیں تھی جو میرے دادا کی وفات کے دو دن بعد ہی مر گئی تھی۔ یہ اس کی جوان بچھیری تھی، اپنی ماں کی طرح سفید نہیں بلکہ خاکستری رنگت کی، کنوتیاں کھڑی کیے اور جوانوں کی طرح چمکدار، پھرتیلی اور چاق چوبند۔ اس پر وہی پرانی اپنی

ماں کی انگریزی زین کسی تھی ـــ گاؤں کی واحد انگریزی زین ـــ سب جاندار ہستیاں گزر جاتی ہیں مگران کی استعمال کی چیزیں ان کے پیچھے رہ جاتی ہیں اور ہماری گاؤں کی حویلی میں ابھی تک ایک صندوقچی پڑی ہے جس میں میرے دادا کی عینک، ربڑ کی ٹوپی والی کالی دوات اور کچھ پرانے خطوط اور مسودات رکھے ہیں ـــ ماضی سے ملانے والی ایک زنجیر کی مانند... نورے نے مجھے بتایا کہ بجو اللہ داد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی پر آیا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خبر نے مجھے کیوں حیران کیا۔

شام کو میں اپنی حویلی میں پہنچا۔ دوسرے دن عبداللہ کا نکاح تھا ـــ عبداللہ اپنی شادی کے انتظامات میں لگا تھا۔ مگر میرے آنے کا سن کر وہ وقت نکال کر میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا۔ وہ ایک بانکا گبھرو لگتا تھا۔ بادشاہ کی طرح خوش۔ وہ چاہتا تھا میں اس کا شہبالہ بنوں۔ میں نے کہا ایک تو میں وہ کپڑے نہیں لایا جو اس موقعے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے شہبالہ ایک چھوٹے لڑکے کو ہونا چاہیئے جو اس کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ سکے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا " شادل۔ تمہیں وہ دن یاد ہے جب ساوی نے اڑی کی تھی اور تم میرے پیچھے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھے تھے اور کپڑوں کا کیا ہے۔ میں تمہیں اپنا لاچہ دے دوں گا۔ تم بڑے اچھے شہبالے بنو گے...."

میری عادت ہے کہ مجھے تماشا بننے سے ہول آتا ہے اور آخر میں نے اسے اکسایا کہ وہ اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی رحمت کو شہبالہ بنائے۔

رات کو میں اس کے گھر گیا اور اس کے اعزا و اقربا سے ملا۔ بوڑھے سٹری

رضی اکبر کے چہرے پر میں نے پہلی بار مسکراہٹ سے ملتی جلتی کوئی چیز دیکھی۔ اس کے "جی آیاں نوں۔ شناء الحق"۔ میں حقیقی محبت کی گرمی تھی۔ وہ اس حد تک پر تواضع تھا کہ اندر سے دلہن کا جوڑا بھی دکھانے کے لیے لے آیا۔ گوٹے کناری کا سرخ باناتی جوڑا جو اس نے خود جہلم میں ایک درزی سے سلوایا تھا اور جس پہ ڈیڑھ سو روپے لاگت آئی تھی۔ میں نے جوڑے کے کپڑے اور اس پہ کام کو بہت سراہا اور اس سے رضی اکبر بہت گنگنانے لگا۔ رات بھر گاؤں کی لڑکیاں گھڑوں پر ماہیے اور شادی کے گیت گاتی رہیں اور دیہاتی مہمان نئے تہبندوں اور صافوں میں ملبوس حقے پیتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دوسری صبح حافظ عبداللہ سر پہ لنگی باندھے، اجلا ریشمی لاچہ اور اچکن پہنے چھیل چھبیلا براتیوں کے ہمراہ دلہن کے گھر "ڈھکا"۔ وہ ہماری سادی کی بچھیری پر انگریزی زین میں سوار تھا۔ اس کا چہرہ سہرے سے ڈھنپا ہوا۔ اور چھوٹا رحمتا اپنے نئے کپڑوں اور سلمے ستارے والی گول ٹوپی میں مغرور اور خوش اس کے پیچھے اس کی کمر میں اپنے بازو حمائل کیے۔ دلہن کے گھر تک زیادہ فاصلہ نہ تھا اس لیے ہم سب پیدل چلے۔ مولوی غلام غوث نے نکاح پڑھایا۔ چھوہارے بانٹے گئے۔ اس کے بعد شاداں کا داج جو اس کے باپ برکت نے اسے دیا تھا، باہر لایا گیا۔ رنگین چول پاپوں کے پلنگ اور پلنگڑیاں، چمکتے ہوئے پیتل اور ایلومونیم کے بھانڈے، ایک بڑا صندوق، ایک لال چھپا چرخہ، دو لالٹینیں، ایک دودھ بلونے کی "مٹی" مدھانی کے ساتھ، رنگدار لکڑی کے چمچے اور ڈوئیاں، چار پانچ اچھے مکمل بستر اور ایک سنگر مشین ـــــ داج میں ایک بھینس بھی تھی۔ جب براتی داج کو دیکھ چکے تو مصلی شاداں کے داج کو پلنگوں

پر رکھے سارے گاؤں میں پھرانے لے گئے تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں کہ شاداں کے باپ نے اپنی بیٹی کو کیا کچھ دیا ہے۔

دوپہر کی روٹی میں نے دلہن کے گھر کھائی۔ مٹی کے برتنوں میں بکرے کے گوشت کا سالن اور گھی میں تر بتر آٹے کی میٹھی کڑھائی۔ ہر کوئی ہنسی مذاق کی ترنگ میں تھا۔ خود سڑی رضی اکبر نے ایک دو مذاق کیے۔ اس نے ایک بوڑھے پانڈی کا ذکر کیا جو کہا کرتا تھا کہ کڑھائی سلونے سے پہلے کھانی چاہیے تاکہ آدمی اچھی چیز سے شکم سیر ہو جائے تو پھر سلونے کو ہاتھ لگائے۔ اس نے حافظ مجنوں کا بتایا جس نے ایک دفعہ کڑھائی کی پوری دو تین پراتیں کھالی تھیں اور جب وہ نکو نک ہو گیا تو دو آدمیوں کو اسے جھولے کی طرح اٹھا کر اس کے گھر پہنچانا پڑا۔ حافظ مجنوں نے جو موجود تھا اور کڑھائی کو دونوں ہاتھوں سے شپڑ شپڑ کھا رہا تھا، اس قصے کی صداقت سے انکار کیا لیکن سب اس پر ہنسے۔ جب اسے زیادہ چھیڑا تو وہ اپنے اذیت دینے والوں کو دور کرنے کے لیے اپنی لاٹھی ہوا میں گھماتا ہوا وہاں سے بھاگا —— اوہ، یہ دیہاتی شادیاں، یہ تمہارے شہروں کی شادیوں کی طرح پھیکی اور بے روح نہیں ہوتیں ۔۔۔۔ چار بجے ہم رخصتی گیت کے درمیان شاداں کی ڈولی عبداللہ کے مکان پر لائے ۔۔۔۔ میں نے عبداللہ کو بات بات پر ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس کے سنگی ساتھی اس سے مردانہ، براہِ راست ننگے مخول کرتے تھے اور وہ جواب میں ہنس دیتا تھا۔ مجھے شام کو گاڑی پکڑنی تھی اور جب میں وہاں سے چلا تو حافظ عبداللہ ایک رنگین پایوں کی پلنگڑی پر کھڑا تھا اور اپنی خالاؤں اور پھوپھیوں اور دوسری عورتوں سے ہنستا ہوا سلام کرائی وصول

کر رہا تھا ــــ وہ اب شادی شدہ تھا ــــ گھر بار والا۔ ایک پورا مرد۔

جب اگلے سال میں گاؤں گیا تو عبداللہ کا ایک بچہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پہلے گھر سے جہاں اس کا بڑا بھائی اور اس کے بیوی بچے رہتے تھے اٹھ آیا تھا اور پھر کے پار اپنی کلتکی (آٹے کی مشین) کے احاطے میں ایک کچے گارے سے بنے کوٹھے میں رہتا تھا۔ ایک دوپہر کو ایک گاؤں سے لوٹتے ہوئے جہاں میری بڑی پھوپھی ایک ٹھیکیدار سے بیاہی تھی، میں کلتکی میں اس سے ملنے کے لیے رکا۔ کلتکی کی "کوہ کوہ" اور ٹوپی دار لمبی چمنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں سے میں نے اندازہ لگایا کہ آٹا پس رہا ہے اور حافظ عبداللہ کا کام چل پڑا ہے۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا۔ بڑی چوکھٹ کے کھلے دروازے کے باہر تین چار گدھے اناج کی بوریوں سے لدے کھڑے تھے۔ میں گھوڑی پر سر پہنچا کیسے اندر داخل ہوا تو میں نے عبداللہ کو مشین کے کوٹھے کے باہر ایک بڑی تکڑی میں کچھ بورے تولتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک ہنستے ہوئے خوش آمدید بھرے چہرے کے ساتھ کام چھوڑ کر بھاگتا ہوا آیا۔ میں گھوڑی سے اترا جسے ایک کوزہ پشت کمیں نے سنبھال لیا اور ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔ اس نے مجھے محبت سے زور آزمائی کے سے انداز میں خوب بھینچا اور ہم ہنسنے لگے۔ وہ اب مونچھ رکھے تھا۔ اس کے بال کنگھی چوٹی سے جمے ہوئے تھے اور تیل سے چمکدار۔ اس کی کلائی پہ ایک گھڑی بندھی تھی۔

"شنادل۔ تمہارے آنے کا پتہ ملا تھا اور اس کے بعد میں دو دفعہ تمہارے مکان پہ ہو آیا ہوں" اس نے کہا "تمہیں میرے پاس ٹھہرنا چاہیے تھا۔ خدا کے فضل سے

میری اتنی حیثیت ہے کہ تمہارے جیسے مہمان کو بستر اور روٹی دے سکوں۔"

وہ مجھے اپنے کوٹھے کے اندر لے گیا۔ صحن میں ایک بھینس اور کٹی کھرلی کے پاس بندھی تھیں اور اس کی بیوی اپنے بچے کو گود میں ہلکورے دیتی ایک پیڑھے پر مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی ہانڈی پکا رہی تھی۔

"شاداں! شاداں!! شادل آیا ہے۔ اٹھ سلام کر۔ یہ تیرے باپ سے میری سفارش نہ کرتا تو تو میرے گھر کبھی نہ آتی —— شادل! ہمارا ایک جاتک ہے۔"

شاداں اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے اٹھی اور جھکی آنکھوں سے کہنے لگی "جی آیاں نوں۔ بھائی جی۔" اور اس نے اپنے بچے کو آگے بڑھایا۔

میں نے گل گوتھنے ننگے بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ایک صحت مند موٹا بچہ تھا۔ بٹنوں سی آنکھوں والا۔ بالکل اپنے باپ پر۔ وہ رونے لگا اور میں نے اسے اس کی ماں کو دے دیا۔

"نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سکندر حیات" اس کی ماں نے غرور اور خوشی سے کہا۔

"مولوی غوث محمد نے کہا تھا کہ اس کا نام سکندر حیات رکھو۔" عبداللہ نے کہا "بڑا ہو کر بخت والا ہو گا اور وزیر بنے گا۔"

میں نے شاداں کو غور سے دیکھا۔ وہ سال میں ہی پوری عورت بن گئی تھی۔ جسم بھرا بھرا اور گدرایا ہوا۔ کچھ کی طرح مضبوط اور پختہ بیاہی عورت کا چہرہ۔ وہ اب بھی ایک ملکہ کی طرح حسین اور پُر وقار تھی۔ وہ ایک بہتی ہوئی نزاکت سے چلتی تھی۔

ہم لپے پُتے صاف ستھرے چمکیلے برتنوں سے سجے ہوئے کمرے میں داخل

ہوئے تو ایک طاق میں رکھے ہوئے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔

عبداللہ نے مسرت سے کہا "شاباش شاباش۔ گھڑیے گھڑیے بول۔ شادل آیا امی"
میں رنگین پایوں کی پلنگڑی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں شاداں کے داج کا سارا سامان ایک عجائب گھر کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ ایک بڑے بھونپو والا گراموفون بھی تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کمرے سے زیادہ آرام دہ اور پرتعیش کوئی شاہی محل ہو سکتا ہے۔ شاداں میٹھی لسی ایک شیشے کے جگ میں لے آئی اور ہم نے دو دو گلاس پیئے۔ عبداللہ نے اپنی بیوی کو چھیڑا "شادل۔ میں تم سے تمہاری بہن کی ایک شکایت کرنا چاہتا ہوں۔ جب سے سکندر حیات خاں ہمارے گھر میں تشریف لائے ہیں تمہاری بہن نے میری پرواہ میں کمی کر دی ہے۔ نہ یہ اب میری ٹانگیں دباتی ہے نہ میرا سر سہلاتی ہے"

شاداں شرمائی ہوئی فوراً باہر چلی گئی۔

عبداللہ نے کہا "شاداں نے مجھے بڑا سُکھ دیا ہے۔ اس کے آنے سے میری جون ہی بدل گئی ہے۔ سچ ہے نیک بخت عورتیں اپنی قسمت ساتھ لاتی ہیں۔ اس کے آنے کے چھ مہینے کے اندر اندر مجھے کسی کی محتاجی نہیں رہی۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ اپنا گھر بار اور اپنا کاروبار"

پھر اس نے اچانک کہا "شادل۔ تمہیں جنانی کی خواہش نہیں ہوتی؟ تم اپنا گھر کیوں نہیں بساتے"

میں نے جواب دیا کہ ابھی وقت نہیں۔ میں پڑھ رہا ہوں اور جب میں پڑھائی سے فارغ ہو جاؤں گا تو شادی کی سوچوں گا۔"

"جنسی کے بغیر ایک مرد کی کچھ زندگی نہیں۔ آدمی گناہ سے بچتا ہے۔ تم کیسے عورت کے بغیر رہتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

میں وہاں عبداللہ کے گھر کوئی دو گھنٹے بیٹھا۔ اس نے مجھے اپنی کلٹی کے کاروبار کے متعلق بتایا اور یہ کہ وہ کچھ پیسے آنے پر آرے اور ٹوکے کی مشین بھی لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہم نے بھونپو والے گراموفون پہ کچھ ریکارڈ بھی سنے۔ اس کی بیوی ایک لکڑی کی طشتری میں کھانا لے کر آئی۔ ساگ اور تازہ مکھن اور تنور کی روٹی۔ کھانے نے بڑا لطف دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں سکندر حیات کے ہاتھ پہ دو روپے رکھ کر اس خوش بابرکت گھر سے رخصت ہوا۔ اپنی زندگی کے بنجر پن اور تنہائی کا سوچتا ہوا میں کچھ اداس اداس حویلی کو لوٹا۔

میں اپنے تعلیمی کورس پڑھنے سے ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ اور اس کی وجہ سے میں متواتر دو سال بی۔ اے میں فیل ہوتا رہا۔ والد صاحب قبلہ سخت ناراض تھے۔ کیونکہ مجھ سے انہوں نے کافی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس مدت میں میں گاؤں نہ جا سکا۔ حافظ عبداللہ اور اس کا ایک ساتھی دشنو کھتری جو گاؤں میں مکینک بنا ہوا تھا، ایک بار لاہور مشینری کے کچھ پرزے خریدنے کے لیے آئے۔ عبداللہ ریواز ہوسٹل میں مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اس کا جسم ابھی تک کسرتی تھا مگر خوشحالی اور بے فکری کی وجہ سے کچھ فربہی کی طرف مائل۔ اوائل شباب کی تازہ روئی کی جگہ ایک مردانہ پختگی نے لے لی تھی اور اس نے بھی نوکیلی مونچھیں اگا لی تھیں۔ جن کی نوکوں کو وہ مسلسل بل دیتا رہا۔ وہ بے ساختگی سے ہنستا تھا۔ اس نے مجھے

بتایا کہ اب اس کا ایک اور لڑکا بھی پیدا ہو چکا ہے۔

"اور اس بار تم نے اس کا نام خضر حیات رکھا ہو گا؟ — سکندر حیات کے بعد خضر حیات" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "نہیں نہیں۔ اس بار میں نے سب تجویزوں کو رد کر دیا۔ میں نے اس کا نام اس کے چاچا پر شناء الحق رکھا ہے۔" اس نے فخر سے میری طرف دیکھا اور میرے دل کا کوئی اندرونی حصہ مسرت سے دمکا۔

"چاچا رضی اکبر نے اس کی مخالفت نہیں کی؟" میں نے پوچھا "اسے ہم ملُوانوں سے بڑی کد ہے۔"

"سچ کہوں۔ میاں جی نے مخالفت کی مگر میں نے کہا کہ اس کا اصل چاچا شناء الحق ہے اور میں اس کا نام یہی رکھوں گا۔"

"اور بہن شاداں کیسی ہے؟"

"ٹھیک اور خوش ہے۔ ہاں میاں جی سے اس کی نہیں بنتی اور مجھ پر بھی غصے ہوتی رہتی ہے کہ میں میاں جی کی پاسداری کرتا ہوں۔ شادی کے وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ اتنی تیز مزاج نکلے گی۔ ایک دو بار تو وہ اس بات پہ میکے چلے جانے کی دھمکی بھی دے چکی ہے لیکن میں اس کو راضی کر لیتا ہوں۔ جناتی گو بھی انجن کی طرح ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔" ...... میں کچھ سوچ میں چلا گیا۔

"اسے خوش رکھو۔"

"ہاں۔" وہ چونکا "خوش! تم نے اسے مجھے دلایا ہے۔ میں اب بھی اس سے پہلے کی طرح محبت کرتا ہوں۔"

وشنو کھتری ایک لمبے کوٹ میں ایک چھوٹا سا آدمی تھا۔ چھدرے کانوں میں مندریاں پہنے بولا۔ "لالہ سکھی رام کا قول تھا کہ جب عورت ہٹ پر آتی ہے تو صرف ایک چیز اسے درست کر سکتی ہے۔ سونٹے کی مار ...... اور وہ ......"
میں نے دیکھا کہ وشنو کھتری کے کوٹ کی جیب میں سے ایک بند بوتل کا منہ تھوڑا سا نکلا ہوا ہے۔ وہ مجھے شراب کی بوتل لگی اور میں تعجب کرنے لگا کہ کہیں حافظ عبداللہ کو بھی چسکی لگانے کی لت تو نہیں پڑ گئی۔ وہ آدھ گھنٹے کے بعد چلے گئے۔

۱۹۴۲ء کے جون جولائی کے مہینے میں مجھے اپنے والد کی ہدایت کی تکمیل میں پھر گاؤں جانا پڑا۔ میں اس مشن پر جانے سے قطعی خوش نہیں تھا اس وجہ سے کہ فریقِ ثانی نہایت چڑچڑا اور تلخ کلام بوڑھا حافظ عبداللہ کا نانا رضی اکبر تھا۔ ایسے خانگی تنازعے بڑے تدبّر اور حوصلے ہی سے نپٹائے جا سکتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب دوسرا فریق مصالحت کی راہ اختیار کرے اور کچھ جھکے۔ رضی اکبر ایسا شخص نہ تھا۔ وہ ساری زندگی نہ خدا کے سامنے جھکا تھا نہ شیطان کے سامنے۔ اور میرا خیال ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں اس کے سجدے نیازمندی اور عبودیت سے عاری ہوتے تھے۔ اس کا معبود وہ خود تھا ـــــ اس کا غرور اور اس کی انا۔ دریا کے پار ہماری کچھ متنازعہ زمین پر جو ایک آدھ ایکڑ تھی اس کے بڑے نواسے اسمٰعیل نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ والد صاحب نے اسے اور رضی اکبر کو کئی بار لکھا کہ وہ قبضہ چھوڑ دیں مگر یہ ایسی بات تھی جو رضی اکبر کے سینے میں ہمارے خاندان کے خلاف بھرے ہوئے زہر کو اور زیادہ گھولتی۔ میں نے سوچا کہ میں اس معاملے میں بوڑھے کی

بجائے حافظ عبداللہ سے بات کروں گا کہ وہ اپنے نانا کو سمجھائے۔

جب گاڑی جوڑے کے اسٹیشن پر پہنچی تو مطلع ابر آلود تھا۔ کالی سیاہ گھٹا پتی کی پہاڑیوں پر سے اُمڈتی ہوئی آسمان پر چڑھتی آ رہی تھی اور پربت کی ٹھنڈی ہوا ایک ہرادل دستے کی طرح درختوں کو تھپیڑے مارنے لگی تھی۔ نورے نے جو گھوڑی لے کر آیا ہوا تھا مجھے کہا کہ زور کی برسات آنے والی ہے اور بہتر ہو گا کہ چودھری علم دین کے ڈیرے میں بارش کے رکنے تک آرام کر لیں۔ مجھے پتی کے شاداب گمرے نیلے پہاڑ کیکروں اور بھیکڑوں کے درمیان لہراتی سیاہ ہوتی ہوئی سڑک، چمکتے کڑکتے بادلوں کے نیچے کرلاتے ہوئے پرندوں کی نوائیں، سب اتنے بھلے اور سحر انگیز لگے کہ میں نے اس موسم میں گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ "بارش آتی ہے تو آئے۔" میں نے کہا۔ ہم چل پڑے۔ آگے آگے بدکتی گھوڑی پر میں اور پیچھے پیچھے سامان سے لدے گدھے پر نورا مراثی۔

ہم کمال پور سے گزرے اور بارش پھر بھی نہ آئی۔ اگرچہ ٹھنڈی ٹھنڈی فر فر کرتی ہوا نمی سے لدی ہوئی تھی۔ تھوڑی دور آگے ایک چھوٹی پگی کے اوپر ہم نے ایک خمیدہ کندھوں والے لاٹھی ٹیک ٹیک کر چلتے ہوئے بوڑھے آدمی کو جا لیا۔ میں پاس سے گزرا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ کھوہار کا پوسٹ ماسٹر رضی اکبر تھا۔ بڑھاپے اور ضعیفی اور کبڑے پن کے باوجود اسی طرح مغرور، اور ساری دنیا کے خلاف کینہ پالے۔

"السلام علیکم چاچا جی" میں نے گھوڑی روکتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"وعلیکم السلام" وہ رکھائی سے غرایا اور اسی طرح لاٹھی ٹیکتا ہوا چھوٹی مضبوط ٹانگوں سے کچی سڑک پر چلتا رہا۔

"چاچا۔ میں نثار الحق ہوں۔ عطار الحق کا بیٹا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں نے کہا۔

"اچھا! اچھا۔ میری بینائی کمزور ہوگئی ہے۔ مگر میں ملوانوں کو ایک میل سے سونگھ لیتا ہوں۔ ان کی بُو اتنی تیز ہے۔ نثار الحق خاں۔ تمہارے باپ کا کیا حال ہے؟"

"وہ خیریت سے ہیں۔"

"خیریت سے؟" اس نے اپنی لاٹھی ہوا میں لہرائی "اسے میری طرف سے کہہ دو کہ ظلم کبھی نہیں پنپتا۔ جب تک رضی اکبر زندہ ہے اسے وارڈے والی زمین کا ایک چپہ نہیں مل سکتا۔"

"چاچا!" میں نے کہا "زمین کی کس نے بات کی ہے؟ آپ گھوڑی پر چڑھ بیٹھیں۔ گھوہار کا کافی فاصلہ ہے اور بارش آرہی ہے۔ میں پیدل آجاؤں گا۔"

وہ اس اخلاق پر حیران ہوا۔ وہ اپنے زہر کو اگلنے کی خاطر تلخ کلامی کے لیے زمین ہموار کر رہا تھا اور یہاں اس کے شریک اور دشمن عطار الحق کا بیٹا اسے سواری کے لیے اپنی گھوڑی کی پیشکش کر رہا تھا۔

"جاؤ۔ جاؤ" وہ بولا "میری ٹانگیں گھوڑی سے زیادہ مضبوط اور تیز ہیں۔"

میں نے ایک بار اور اصرار کیا اور پھر اس کی کھلی کدورت کو دیکھ کر میں نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ ایک فرلانگ آگے سڑک کے موڑ پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ اسی طرح خمیدہ، لاٹھی ٹیکتا، تیز تیز چلتا ہوا آرہا تھا۔ سر پر صافہ۔ جھریوں والے

تلخ چہرے پر لال بھری داڑھی۔ تپی ہوئی خشمناک آنکھیں، ایک تنہا کھولتا ہوا بوڑھا آدمی۔ اس وقت وہ مجھے ایک المیہ کردار لگا۔

پہلے چھینٹے کلمیانہ کے گاؤں سے کچھ آگے ہم پر پڑے۔ کھوہار یہاں سے بس ایک کوس تھا۔ ہم نہ رکے اور بڑھتے گئے۔ پرے پٹی کی پہاڑیوں پر بڑی موسلا دھار بارش برستی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ یہاں ابھی بوندا باندی ہی تھی۔ آسمان بھری ہوئی سیاہ گھٹاؤں کا ایک آتشیں کڑاہ بنا تھا۔ ہم کھوہار میں داخل ہوئے تو بارش موسلا دھار برسنے لگی اور حویلی تک پہنچتے پہنچتے ہم بالکل بھیگ گئے۔ یہ ایک سیلابی بارش تھی اور اس خطے میں بھی جو بارشوں کے لیے مشہور ہے۔ میں نے آسمان کو اس طرح برستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب میں نے سوچا۔ ہفتوں تک گاؤں کی گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ رہے گا اور ہر کوئی ہاتھ میں لاٹھی لیے اور اپنے تہبند کو اوپر اٹھائے اپنے کام پر نکلے گا اور زہریلے ملیریا کے مچھر چھپڑوں میں پیدا ہو کر انسان اور جانور کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔

میں نے چوبارے میں کپڑے تبدیل کیے۔ نورے نے مٹی کی انگیٹھی میں پھونک مار مار کر آگ جلائی اور آگ کے سامنے بھیگے ہوئے بستر کو خشک کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔ گاؤں پر خاموشی سی طاری تھی اور سوائے موٹی چادروں میں گرتی ہوئی بارش اور بجلی کی کڑک کے اور کوئی آواز نہ تھی۔

میں اس بالکنی پر کھڑا ہو کر اس ہولناک بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ اچانک پٹی کی طرف بجلی کسی نامعلوم زبان کے حروف کی شکل میں کوندی اور سارا آسمان روشن ہو گیا اور پھر ایک دہلا دینے والی گڑگڑاہٹ سے ایک چندھیا دینے والی روشنی کی

تلوار سی نیچے لپکی۔ دس توپوں کی کڑک کے ساتھ۔

نورے نے خوف سے کہا۔ "میاں جی۔ گاؤں کے نزدیک کہیں بجلی گری ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

میرا خیال ہے کوئی آدھ گھنٹے کے بعد طوفانی بارش کے شور میں میں نے دو عورتوں کی آواز سنی۔ "نی نثر پھودے عبداللہ بے چارے تے بجلی پئی اے۔" دوسری عورت نے کہا "ہائے ہائے نی بے چارا۔ میں مر گئی۔ ہائے جان ہی آہی۔"

میرا دل ڈوب گیا اور میں دعا کرنے لگا کہ میرے کانوں نے غلط سنا ہو۔ بارش ذرا تھمی تو نورا اور میں باہر بھاگے۔ گلی میں بہتے پانی اور گارے میں شپشپاتے اور دیواروں کو پکڑتے۔ کلتکی میں پہنچتے پہنچتے ہمیں کچھ وقت لگا۔ کلتکی کے کوٹھے کے پھونس کی چھت گری ہوئی تھی اور مشین کا انجن تڑا مڑا اور سیاہ اپنی آہنی پنجر نمایاں کئے پڑا تھا۔ چھ سات دیہاتی عورتیں اور مرد جمع تھے۔ انجن اور مشین کے درمیانی پٹے کے نیچے کوئلے کی طرح سیاہ، سکڑا اور جھلسا ہوا حافظ عبداللہ کا جسم پڑا تھا۔ بالکل ناقابلِ شناخت۔

بعد میں روتی ہوئی شاماں نے مجھے بتایا کہ جب چھت کے گرنے کا دھماکہ ہوا تو عبداللہ اس کے منع کرنے کے باوجود دیکھنے کے لیے بھاگا کہ اس کی مشین کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچا۔ پھر بجلی بڑے زور سے کڑکی اور مشین پر گری اور عبداللہ جو اپنی اُئی سے پاس کھڑا تھا جل بھن گیا۔

اوہ! وہ بین جو دیہاتی بوڑھیوں نے اپنے بازو لہرا لہرا کر اس کی میت پر کیے! عبداللہ کا جسم رضی اکبر کے گھر کے صحن میں چادر میں ڈھنپا ایک چارپائی پر پڑا

تھا۔ ارد گرد اس کی خالائیں، پھوپھیاں اور دوسری عورتیں سیاہ کپڑوں میں اکڑوں بیٹھی تھیں۔ ایک ایک اٹھتی اور مرے ہوئے شخص کی طرف ہاتھ بڑھا کر اور اسے مخاطب کر کے دلگداز بین کرتی۔ دیہات میں جب کوئی مرتا ہے تو اس کا مناسب ماتم کیا جاتا ہے اور گاؤں کے سب لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

اور جب ہم شام کو اس کی میت کو اٹھائے دفنانے لے گئے تو ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر رنج و غم کے الفاظ، سوائے ایک شخص کے۔ یہ اس کا نانا رضی اکبر تھا۔ بوڑھے ضدی آدمی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ بہا۔ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھ کوری اور خالی تھی۔ وہ کھرے تلخ لہجے میں موسم اور فصلوں کی باتیں کرتا رہا۔ ایک بار اس نے مجھ سے میری پڑھائی کے متعلق بھی پوچھا۔ ہاں جب میں نے مشیتِ ایزدی کا ذکر کیا تو وہ بھڑک اٹھا اور حقارت اور غرور سے غرایا "مشیت کا کرم ہمیشہ رضی اکبر کے گھر پر ہی ہوتا ہے!".... میں نے جان لیا کہ اس کے لیے اب اس دنیا میں زیادہ دیر زندگی نہیں۔

ثناء الحق خاموش ہو گیا۔ چاند کچھ پھیکا پڑنے لگا تھا اور پہلے مرغوں کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

اور یہ ایک آدمی کی زندگی کی کہانی ہے۔ میں نے حافظ عبداللہ کو اس دنیا میں آنے پر دیکھا اور مولوی کو اس کے کانوں میں کلمہ پڑھتے سنا۔ پھر وہ میری آنکھوں کے سامنے بچپن اور بلوغت کی منزلوں سے گزرا جس میں سے سب انسان گزرتے ہیں۔ وہ اس طرح بڑھا جیسے ایک پھول زمین میں سے اگتا ہے۔ وہ جوان ہوا اور جوانوں کی طرح ایک لڑکی کی چاہت میں دیوانہ ہو گیا۔ میں نے اسے اس کی شادی کے وقت

چارپائی پر کھڑے مسکراتے اور سلام کرواتی قبول کرتے دیکھا۔ میں نے اسے ایک ذمہ دار مرد بنتے، گھر بساتے اور باپ بنتے دیکھا اور پھر میں اس وقت بھی موجود تھا جب اسے سوندھی مٹی کے نیچے آرام کرنے کے لیے لٹایا گیا۔ سب آدمی ان سب منزلوں میں سے گزرتے ہیں اور آخر میں زمین ان کو اپنی کوکھ میں بلا لیتی ہے اور وہ سایوں کی طرح زندوں کی آنکھوں اور ذہنوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کے سب خواب، ارمان پچھتاوے اور مستقبل کے ارادے ایک مشتِ خاک بن کر ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں مگر ایک طرح وہ باقی رہتے ہیں —— دوسرے انسانوں کے سینوں میں۔ اس میں بڑی سچائی ہے کہ سب آدمی ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں۔ جب ایک مرتا ہے تو ہم سب اس کے ساتھ مرتے ہیں .....

پھر ہم بنچ سے اٹھے اور اپنے اپنے خوالوں اور خیالوں میں کھوئے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموش سڑک پر ہوسٹل کی سمت چل پڑے۔

("فنون" لاہور)

اعجاز حسین بٹالوی

دس پیسے کے بارہ

آخر نثار حسن کاظمی ایم۔ اے کو نوکری مل گئی۔

نوکری کا پروانہ ملے تین دن ہو چکے تھے۔ اس کی والدہ محلے کی عورتوں سے مبارکبادیاں وصول کر چکی تھیں اور نثار حسن کاظمی اپنا بستر باندھ چکا تھا۔ نوکری ملنے کی خوشی تو ضرور تھی لیکن آج کافی ہاؤس میں اس کی آخری شام تھی اور جب دوستوں کی مجلس برخاست ہوئی اور وہ گھر جانے کے لیے اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ کافی ہاؤس کی کرسیوں میزوں سے گلے ملے۔ درو دیوار سے لپٹ کر رو دے۔ وہ دوستوں کے ہجوم میں گھرا ہوا کافی ہاؤس سے یوں نکلا جیسے میکے سے دلہن کی ڈولی نکلتی ہے۔

دوست احباب رخصت ہوئے اور وہ اکیلا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سالہا سال سے اس کے قدم ہزار ہا مرتبہ ان راستوں کو ناپ چکے تھے۔ کرشن نگر، کالج اور کافی ہاؤس ان راستوں کا ہر درخت، بجلی کا ہر کھمبا، سڑک کا ہر موڑ اس کا آشنا تھا ——— اور کل سے نئی زندگی ہوگی۔ نئے راستے۔ نئے لوگ، نیا کام۔

اس نے سوچا کیا ہوا جو شہر میں نوکری نہ مل سکی۔ اندھیرا تو گاؤں ہی میں ہے۔ اصلی پاکستان تو انھیں دیہات میں بستا ہے۔ پاکستان کو ترقی کرنی ہے تو سب سے پہلے

تو گاؤں میں روشنی پھیلانی پڑے گی۔ وہ یہی سوچتا ہوا اڈے دفتر کے قریب سے گزر کر کرشن نگر کی طرف مڑ گیا۔ اس کا اصلی وطن تو اب کرشن نگر ہی تھا۔ انھیں گلیوں میں کھیل کر بچپن گزارا اور وہیں جوانی آئی۔ بریلی کی تو شاید ہی کوئی یاد اس کے حافظے میں محفوظ ہو۔ اور ہوتی بھی کیسے۔ وہ تو ابھی چوتھے درجے میں پڑھتا تھا کہ اس کا خاندان بریلی سے اٹھ کر پاکستان آ گیا۔ اس کے والد بریلی کی کچہری میں پیشکار ہوتے تھے۔ اب انھیں لاہور کی کچہری میں نوکری مل گئی اور وہ لوگ کرشن نگر میں گھر الاٹ کرا کر یہیں کے ہو رہے۔ گھر میں تو اردو بولی جاتی تھی مگر نثار حسن خود اچھی خاصی پنجابی بولنے لگا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی فصیح پنجابی بولنے والا ایسا لفظ بول جاتا کہ نثار حسن کی ترکی تمام ہو جاتی اور وہ ششدر اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔

ایم۔ اے تک پہنچتے پہنچتے اسے محنت کی اچھی خاصی عادت پڑ گئی تھی۔ خاندان کی مالی حالت بہت خوشحال کبھی نہ ہو سکی اس لیے اسکول کالج کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بیچ بیچ میں ملازمت کرتا رہا۔ کبھی محلے میں کسی امیر آدمی کے لڑکے کی ٹیوشن پڑھا دی۔ کبھی اخبار میں ترجمے کا کام کر دیا۔ لیکن اب ایم۔ اے کے بعد تو اسے مستقل ملازمت کی تلاش تھی۔ چنانچہ اس نے ریڈیو پاکستان، انکم ٹیکس، خاندانی منصوبہ بندی، کسٹم اور محکمہ آبکاری میں درخواستیں دے دیں اور آخر کار نصیبہ محکمہ خاندانی منصوبہ بندی میں کھلا اور اسے ایک معقول تنخواہ پر اس محکمے میں ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ دقت صرف یہ تھی کہ ملازمت دیہات کی تھی لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا اور اپنی نئی ملازمت پر روانہ ہو گیا۔

ملازمت کا پہلا پڑاؤ ضلع کا صدر مقام تھا۔ لاہور سے دور جس ضلع میں اسے

کام کرتا تھا اس کے صدر مقام پر تمام نئے بھرتی ہونے والے افسروں کو بھرتی کیا گیا
تاکہ دیہات میں بھیجنے سے پہلے خود ان کی مناسب تربیت کی جائے۔ پہلا لیکچر ضلع
کے ڈپٹی کمشنر نے دیا جس میں اس عظیم کام کی اہمیت واضح کی گئی جو یہ سب نوجوان
شروع کرنے والے تھے۔ اس مسئلے کو ملک کے لیے بہت بڑا چیلنج قرار دیا گیا
اور ان نوجوانوں کے دلوں میں اس کام کی عظمت اور اہمیت کے چراغ روشن کیے
گئے۔ حکومت ان کے کام کی پشت پناہی کرے گی۔ کروڑوں روپے کا بجٹ
اس کام کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ ان کے کام پر اس ملک کے مستقبل کا دارو
مدار ہے۔ آنے والی نسلیں صحت مند، ذہین اور ذمہ دار ہونی چاہئیں۔ ضلع کے
ڈپٹی کمشنر واقعی گفتار کے غازی تھے پہلے لیکچر ہی میں ان نوجوانوں پر جادو کر گئے
اور اس تقریر کے بعد جب انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو محسوس ہوا
کہ ہر شخص اپنے آپ کو عظیم کام کے لیے سینہ سپر کرنے پر پوری طرح آمادہ ہے۔
پھر دو ہفتے تک اُن کی تربیت ہوتی رہی۔ ڈاکٹروں اور جنسیات کے ماہروں
کے لیکچر۔ علم البدن کے پروفیسروں کے لیکچر، بچوں کی پیدائش اور افزائشِ نسل پر
لیکچر۔ مانع حمل تدابیر پر لیکچر۔ آبادی اور اقتصادیات پر لیکچر۔ دیہی معاشرت اور
خاندانی منصوبہ بندی پر لیکچر۔ غرضیکہ یہ دو ہفتے علم کی گہما گہمی اور نئے ساتھیوں
کے میل جول میں گزر گئے۔ کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ لاہور اور لاہور والوں کا کچھ
خیال نہ آیا۔ نئے کام کی تربیت مکمل ہو چکی تو ان کے تبادلوں کے احکام آگئے اور
دو ہی روز میں نوجوانوں کا یہ گروہ چڑیوں کے چنبے کی طرح اڑ کر منتشر ہو گیا۔ نثار حسن
کاظمی کی تعیناتی ضلع کے صدر مقام سے ستر میل دور ایک گاؤں میں ہوئی جس کا

نام تھا رکھاں والا۔

ستر میل کا یہ سفر کوئی چھ گھنٹے میں طے ہوا اس لیے کہ دس میل کے بعد کچی سڑک شروع ہوجاتی تھی اور اس سڑک پر ہر روز لاری کے آنے جانے سے سڑک کی مٹی پسے ہوئے باریک میدے کی طرح ہو گئی تھی۔ لاری کے ٹائر اس میں دھنستے چلے جاتے تھے۔ پھر سڑک میں گڑھے بھی تھے مگر لاری ڈرائیور کسی پختہ مشق ملاح کی طرح جو ساحلی چٹانوں سے بچا کر کشتی کو چھوٹے چھوٹے جزیروں تک پہنچاتے ہیں۔ لاری کو کمال احتیاط سے ان گڑھوں سے بچاتا ہوا رکھاں والا کی طرف لیے جا رہا تھا۔ لاری کی معزز آبادی میں تھانے کا ایک سپاہی، ایک چھوٹے سے طرّے والا زمیندار جس نے گلے میں پستول لٹکا رکھا تھا اور نثار حسن کاظمی تھے۔ باقی آبادی عام دیہاتی عورتوں اور مردوں کی تھی۔ راستے میں دو تین مقام ایسے بھی آئے جہاں لاری نے اطمینان سے رک کر آرام کیا۔ یہ راستے کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں بچوں نے گڑ والے چنے، عورتوں نے باسی پکوڑے اور پستول والے زمیندار نے کھوئے کے پیڑے خریدے جن کا رنگ سفید سے پیازی ہو چکا تھا اور اس نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے دوکاندار سے کہا "او ئے بدبختا مکھیاں تو جھل لیا کر۔" نثار حسن کاظمی نے بڑ کے درخت کے نیچے لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے نکال کر پانی پیا اور لاری پھر چل پڑی۔

کوئی دو گھنٹے بعد نثار حسن کاظمی نے لاری میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف نظر اٹھائی تو اسے محسوس ہوا کہ ان کے خد و خال، ان کے چہرے یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہ تازگی، جو سفر کے شروع میں چہروں پر تھی اب غائب ہو چکی تھی۔ گرد کا

ایک دیوہیکل ہیولا تھا کہ لاری کے ساتھ ساتھ اڑتا چلا جا رہا تھا اور دونوں طرف کی جھاڑیوں اور درختوں کو آندھی کی طرح اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جا رہا تھا۔ نثار حسن کاظمی ایم۔اے فیملی پلاننگ آفیسر رُکھاں والا ہر لحظہ اپنی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

رُکھاں والا دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیلے پہ آباد تھا۔ نثار حسن کاظمی نے پتلون سے گرد کی تہیں جھاڑتے ہوئے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ مسافر لاری کی چھت سے اپنا اپنا سامان اتروا رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے گٹھڑیاں سروں پر رکھے گاؤں کی گلیوں میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے اندازے سے پہچانتے ہوئے اس سے کہا۔ "آپ خاندانی منصوبہ بندی ......"

جی ہاں جی ہاں نثار حسن کاظمی کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اسی ایک لفظ سے رکھاں والا کی ساری اجنبیت ختم ہو گئی۔ "تو چلیے میں آپ ہی کو لینے آیا ہوں۔ میں یونین کونسل کا سیکرٹری ہوں۔"

نثار حسن کاظمی اس کے ساتھ ہو لیا۔ لاری کے اڈے کے ساتھ ہی ایک جوہڑ تھا جس کے بند پانی پر گہری سبز کائی کی تہہ جم گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جن پر مرغیاں چونچیں مار مار کر کوڑے کو چاروں طرف پھیلانے میں مشغول تھیں۔ اس کے ساتھ گاؤں کی مسجد تھی اور پھر پرائمری سکول تھا جس کی محراب پہ جلی حروف میں لکھا تھا۔ "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" باہر کے دروازے پہ خوش آمدید لکھا تھا مگر بارش کی دھار کچھ اس طرح پڑی تھی کہ "آ" مٹ گیا تھا اور اب صرف "خوش مدید" باقی رہ گیا تھا۔ جس راستے پر وہ چل رہے

تھے وہاں سے چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی میڑھی گلیاں گاؤں کے اندر چلی گئی تھیں جن کے دونوں طرف مٹی کے کچے مکان تھے جن میں بعضوں کی دیواریں لپی ہوئی تھیں مگر اکثر گھروں کی دیواریں لیپ پوت کی محتاج تھیں۔

نثار حسن کاظمی کے میزبان نے اس سے کہا "اچھا ہے آپ گاؤں کے باہر ہی رہیں گے۔ ہم نے یونین کونسل کے دفتر ہی میں آپ کی رہائش کا انتظام کر دیا ہے۔"

یونین کونسل کا دفتر گاؤں کے پرانے مندر کی عمارت میں واقع تھا۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد سے اب تک یہ مندر اور اس کے ملحقہ کمرے ویران پڑے تھے۔ شروع شروع میں رہتک اور حصار کے مہاجر یہاں آکر ٹھہرے تھے مگر جب ان کو قریبی موضع میں زمینیں الاٹ ہو گئیں تو مندر پھر ویران ہو گیا۔ اب یونین کونسل نے اس کی مرمت کرا کے یہاں اپنا دفتر قائم کیا تھا۔ اس عمارت کے ایک مختصر سے کمرے میں نثار حسن کاظمی کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کوٹھڑی میں ایک چارپائی تھی۔ ایک شکستہ سی کرسی تھی اور ایک میز پر لالٹین رکھی تھی۔ یونین کونسل کے سیکرٹری نے نثار حسن کاظمی کی طرف تحسین طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ شہر سے آ رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ کو اپنا کمرہ پسند آئے گا۔" نثار حسن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا۔ "اب آپ آرام کریں۔ شام کا کھانا تو میں آپ کے لیے لاؤں گا اور کل سے آپ کا کوئی بندوبست کر دیں گے اور ہاں کل ہمارے چیئرمین صاحب بھی آپ سے ملنے آئیں گے۔ آج وہ پار کے ایک گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔"

نثار حسن کاظمی کا بستر چارپائی کی پائینتی پڑا تھا اور وہ اس سے ٹیک لگائے چھت کی کڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا اور سورج دریا کے دوسری طرف درختوں کی اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ نثار حسن کاظمی جیسے گہرے خواب سے جاگ کر اٹھا اور مندر کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اس نے صدر دروازے پر لگا ہوا بورڈ پڑھا۔ "دفتر یونین کونسل رکھاں والا" اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دریا کی طرف نکل گیا۔ دور حدِ نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں سیم اور تھور کی کھائی ہوئی بھربھری سفید سفید زمینیں تھیں۔ سر پر آسمان کی چھت تھی اور دور دور تک کوئی چیز نظر میں حائل نہ ہوتی تھی۔ ہر شے خاموش تھی، خاموش اور ساکت۔ دریا کا پانی بھی انتہائی خاموشی سے بہہ رہا تھا اور ہر شے آہستہ آہستہ سرمئی اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ دور ٹیلے پر گاؤں کی مسجد کے مینار اور پھیلے ہوئے کوٹھے ایک گہرے غبار میں چھپتے جا رہے تھے اور خاموشی جو نثار حسن کے دل کے اندر تھی اور اس کے باہر تھی اسے ایک عجیب طرح کا سکون پہنچا رہی تھی جیسے جدائی کے زخموں پر مرہم کا کام کر رہی ہو۔

اگلے روز یونین کمیٹی کا چیئرمین نثار حسن کاظمی سے ملنے آیا۔ اوپر ململ کا ڈھیلا ڈھالا آستین کا کرتا۔ نیچے نیلے رنگ کا تہمد، سر پر چھوٹا سا پٹکا جو اس طرح باندھا گیا تھا کہ اس کے تیل لگے ہوئے پٹوں کی چمک پر حاوی نہ ہو سکتا تھا۔ مونچھیں جن کے سروں کو تاؤ دے کر ذرا سا اوپر کی طرف اٹھا دیا گیا تھا اور سر پر تیل لگانے کے بعد وہی ہاتھ مونچھوں پر بھی پھیر دیا گیا تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان گھوڑی کا رنگ سفید جو مندر کے بیرونی صحن میں پیڑ تلے باندھ دی گئی تھی۔ چیئرمین کے

آنے سے پہلے گاؤں کے کافی لوگ کمیٹی کے دفتر میں پہنچ چکے تھے۔ یہ سب لوگ علاقے کے معتبر تھے۔ نمبردار، یونین کونسلوں کے ممبر، جرگے کے رکن، چودھری اور علاقے کے بااثر لوگ جن سے نثار حسن کاظمی کا تعارف کرایا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے کام اور اپنے فرائض کے متعلق انھیں تفصیل کے ساتھ کچھ بتائے۔ اب نثار حسن کو اس طرح کی تقریر کرنے کا موقع مل گیا جس طرح پہلے روز ڈپٹی کمشنر صاحب نے کی تھی۔ گاؤں کے لوگ خاموشی سے اس کی تقریر سنتے رہے مگر اس کو حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ تقریر کے بعد جو سوال پوچھے گئے ان میں سے بیشتر کا تعلق اس کے کام سے نہ تھا مثلاً آپ کی ذات کیا ہے؟ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کس خاندان سے آپ کا تعلق ہے؟ مہاجر ہیں یا مقامی؟ تعلیم کتنی ہے؟ شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟ اور جب یہ میٹنگ ختم ہو گئی اور مجمع آپس میں گھل مل کر منتشر ہو گیا تو ایک فقرہ جو نثار حسن کاظمی نے دبے دبے لفظوں میں دو تین مختلف لوگوں سے سنا تھا کانسی کے تھال کی طرح اس کے ذہن میں جھنجھناتا رہا "پر جی چودھری صاحب جو رُوح دنیا میں آتی ہے اسے بھلا کون روک سکتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کس کا دخل ہے" اور اسے یوں لگا جیسے یہی فقرہ اس کے راستے کی سب سے بڑی کھائی ہے یا تو وہ خود اس میں گر جائے گا یا سمت اچھی ہوئی تو اسے پھلانگ کر نکل جائے گا۔

اپنی ہدایات، تربیت اور چیئرمین کے مشورے سے نثار حسن کاظمی نے باقاعدگی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ لوگوں کو اس کام کی اہمیت سے آشنا کیا جائے اور پھر اس کام کے پرچار کے لیے کام کرنے والوں کا

ایک پورا دستہ گاؤں کی آبادی پر چھوڑ دیا جائے جو ہر شادی شدہ مرد اور عورت کو
خاندانی منصوبہ بندی کے فوائد سے آگاہ کرے۔ نثار حسن کاظمی کی تربیت اور علم کے
مطابق دیہاتی آبادی کے دو گروہ ایسے تھے جن کی صف آرائی اس سلسلے کا اولین
کام تھی۔ ایک گاؤں کی دائیاں اور دوسرے گاؤں کے حکیم۔ چیئرمین کے اختیارات
کو استعمال میں لا کر یونین کونسل کے سارے علاقے کی دائیوں کو طلب کر لیا گیا اور
نثار حسن کاظمی نے ان کی تربیت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آج ان کا پہلا لیکچر تھا۔ پرانے
مندر کے بڑے کمرے میں جہاں آج سے ربع صدی پہلے تک مخروطی اور مدور پتھروں
کی پوجا ہوتی تھی، آج نثار حسن کاظمی نے ایک نئی تدریس کی ابتدا کی۔

اس کے سامنے پچیس تیس دیہاتی عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن میں بیشتر ادھیڑ عمر کی
تھیں۔ کوئی کوئی ڈھلتی جوانی کی تھی۔ جس نے جوانی میں بیوہ اور بے سہارا ہو کر دائی
کا کام شروع کر دیا تھا۔ چہرے مہرے سے سب کی سب تجربہ کار اور پکی پیڑھی
معلوم ہوتی تھیں۔ نثار حسن کاظمی عجیب مخمصے میں گرفتار تھا کہ بات کا آغاز کہاں
سے کرے۔ سب سے پہلے اس کے منہ سے نکلا۔ "بہنو اور بی بیو"۔ پھر خاموشی
چھا گئی پھر اس نے سوچ کر کہا۔ "میں اسی کام کے متعلق آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں
جو آپ برسوں سے کر رہی ہیں یعنی بچے کی پیدائش"۔ اس فقرے کے بعد جیسے
نثار حسن کاظمی اپنے موضوع پر قائم ہو گیا اور اس نے پورے وثوق اور علم کے ساتھ
اپنی تقریر جاری کر دی۔ زمین کی گھٹتی ہوئی پیداوار اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی۔
لمبے چوڑے خاندان کی مصیبتیں۔ تعلیم کی ضرورت، اقتصادی بدحالی اور خوشحالی کی
وجوہات، مختصر کنبے کے فوائد غرضیکہ ایک دریا تھا جو آہستہ روی سے بہتا چلا

جارہا تھا اور دیہات کی یہ دائیاں جو برس ہا برس سے اِس علاقے کی آبادی میں اضافہ کرکے خوش ہوتی اور مبارکبادیاں وصول کرتی چلی آئی تھیں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں کہ اُن کے بظاہر نیک کام کے کیسے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ پھر اُس نے گریز کیا اور اپنی تقریر کا رُخ آبادی کو کم کرنے کے لیے احتیاطی تدابیر کی طرف موڑ دیا۔ مانع حمل تدابیر سے پہلے ضروری تھا کہ وہ بچے کی پیدائش اور افزائشِ نسل کی ابتدا کا تذکرہ کرے چنانچہ اس نے طرح طرح کے چارٹ سنبھال کر سامنے لٹکا دیئے۔

یہ دیکھئے نسلِ انسانی کا آغاز اس ایک جرثومے کے دوسرے جرثومے سے ملاپ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اُس نے لمبی سی چھڑی اُٹھا کر ایک چارٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اِس نقشے میں عورت کا جسم ...... اور ابھی وہ فقرہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی دونوں عورتوں نے اپنے دوپٹے کا پلو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور دوسری صف میں بیٹھی ہوئی تینوں عورتیں چارٹ پر سے نگاہیں ہٹا کر دیوار کی طرف دیکھنے لگیں پیچھے سے ایک عورت کی دبی ہوئی آواز "ہائے ہائے نیں یہ ڈاکٹر کیسی بے شرمی کی باتیں کر رہا ہے"

کمرے کی فضا میں اب ایک ایسا کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ تقریر جاری رکھنا نثار حسن کاظمی کے لیے مشکل ہوتا جارہا تھا اور قریب تھا کہ وہ گھبرا کر کرسی پر بیٹھ جاتا مگر اسے اپنی تقریر کے لیے ایک اور سہارے کا خیال آیا۔ اس نے پھر کہا۔ "بہنو اور بیٹیو! مجھے افسوس ہے کہ جو کام آپ ساری عمر کرتی رہی ہیں اس کے بیان پہ آپ کو خواہ مخواہ ہچکچاہٹ ہو رہی ہے حالانکہ آپ سب خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور آپ نے سن رکھا ہے کہ شرع میں شرم نہیں ہوتی۔ یہ اگر

ایسا ہی مضمون ہوتا تو خدا کے کلام اور رسول اللہؐ کی احادیث میں بچے کی پیدائش کا ذکر نہ ہوتا۔ آپ جانتی ہیں کہ افزائشِ نسل تو ایک اعتبار سے خدا رسولؐ کے حکم کی بجا آوری ہے۔" اب کمرے کی فضا میں پھیلا ہوا کھچاؤ ٹوٹ گیا۔ آنکھوں پر پڑتے ہوئے دو پٹے نیچے گر گئے، دیوار پر لگی ہوئی نظریں واپس چارٹ پر آلگیں اور پچھلی رو سے ایک بڑی عمر کی دائی کی آواز آئی جو اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت سے مخاطب تھی۔ "اے بیٹے ڈاکٹر ٹھیک ہی تو کہتا ہے شرع کے آگے کیا شرم جو چیز تم ساری عمر دیکھتی رہی ہو اس کی تصویریں دیکھنے میں کیوں شرماتی ہو۔"

خدا خدا کر کے نثار حسن کاظمی نے اپنی تقریر ختم کی اور دائیوں کو اگلے روز صبح نو بجے دوسرے لیکچر کے لیے آنے کی ہدایت کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پورے اٹھارہ دن دائیوں کی تربیت پر صرف ہوئے۔ نثار حسن کاظمی کا کام آسان نہ تھا۔ صدیوں کے توہمات ان کے دلوں سے دور کرنے تھے۔ صرف علم ہی کافی نہ تھا۔ کوشش یہ تھی کہ وہ اِس کام کی اہمیت سے واقف ہو جائیں اور اس کے اچھا اور ضروری ہونے پر ایمان لے آئیں۔ سب سے بڑی دِقت یہ تھی کہ اگر وہ خالص علمی انداز سے گفتگو کرتا تو وہ بیزار ہو کر بے تعلق ہو جاتیں اور اگر وہ انھیں ذرا ڈھیل دیتا تو وہ ایسی کھُل کر باتیں کرنے لگتیں کہ کلاس روم کی گفتگو اور فقرے بازی بے حیائی کا نمونہ بن جاتی۔ ایک روز جب وہ نہایت علمی اور سائنسی انداز میں مرد اور عورت کے اختلاط کے وقت احتیاطی تدابیر کا ذکر کر رہا تھا تو ایک دائی نے ہنس کر کہا "ڈاکٹر جی آپ کی تو شادی بھی نہیں ہوئی، آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہو گئیں" اور اس پر سب کی سب اِس طرح کھلکھلا کر ہنسیں کہ نثار حسن کاظمی

کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

اِن سب مشکلات کے باوجود وہ خوش تھا کہ اُس کے کام کو آگے بڑھانے والا یہ پیشرو دستہ آہستہ آہستہ کام کی اہمیت سے واقف ہوتا جارہا تھا۔

مانع حمل دواؤں اور احتیاطی تدابیر پر اُن کو مفصل لیکچر دیئے گئے تھے اور نثار حسن کاظمی کو یقین تھا کہ جب یہ عورتیں تربیت مکمل ہونے پر سارے علاقے کے گھروں میں پھیل جائیں گی تو گویا اِس علاقے میں خاندانی منصوبہ بندی کا پہلا مورچہ قائم ہو جائے گا۔

خاندانی منصوبہ بندی کا دوسرا مورچہ علاقے کے مقامی طبیب، حکیم اور سیانے تھے۔ چیئرمین نے یونین کونسل کے سارے ممبروں سے کہا کہ اپنے اپنے علاقے کے حکیموں کی فہرستیں اسے بھیج دیں۔ یونین کمیٹی نے تمام حکیموں کو چٹھیاں لکھ کر اپنے دفتر میں بلا لیا اور مقررہ روز سارے علاقے کے حکیم گھوڑوں پر سوار دفتر میں پہنچ گئے۔ قریبی مواضعات کے حکیم پیدل چل کر بھی آئے۔ غرضیکہ اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ نثار حسن کاظمی کو اپنے دعوت ناموں کا یہ ردِ عمل دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ وہ ہنس ہنس کر ہر ایک سے ہاتھ ملاتا۔ اس کا نام پتہ اپنے رجسٹر میں درج کرتا اور انھیں اپنے کام میں شریک کرتا جاتا۔ حکیموں کا کام دائیوں کی نسبت زیادہ آسان تھا۔ دائیاں تو دراصل ایک طرح کی ففتھ کالم تھیں جنھیں غنیم کی صفوں میں گھس کر بغاوت پھیلانا تھی مگر حکیم تو میدانِ جنگ تک گولہ بارود سپلائی کرنے والے دستے کا کام کرنے والے تھے اور پھر اس خدمت کے لیے اقتصادی مفادات

الگ تھے۔

نثار حسن کاظمی نے علاقے کے تمام حکیموں کو سمجھا دیا کہ یہ کارِ خیر ان کے تعاون کے بغیر نہ ہو سکے گا۔ احتیاطی تدابیر کے لیے لاکھوں روپے کا سامان دیہاتوں میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی فروخت اور تقسیم کا کام حکیم صاحبان کو سنبھالنا پڑے گا۔ پھر نثار حسین کاظمی نے اپنا بکس کھولا۔ "یہ دیکھیے اس ڈبیا میں جھاگ والی گولیاں ہیں اور بیس گولیوں کی قیمت صرف چار آنے ہے اور یہ ہیں ربڑ، دس پیسے کے بارہ۔ شہر سے یہ چیز خریدیئے تو آپ کو صرف ایک کے دام آٹھ دس آنے پڑیں گے لیکن سرکار کی مہربانی ہے کہ آپ لوگوں کی مالی حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اتنی کم قیمت مقرر کی ہے، یعنی دس پیسے کے بارہ۔ میری گزارش ہے کہ آپ ان دونوں چیزوں کا اسٹاک اپنی اپنی دکانوں پر رکھ لیجیے اور ضرورت مندوں کو سپلائی کیجیے دونوں احتیاطی تدبیروں میں سے اگر ایک کا بھی استعمال کر لیا جائے تو کافی ہے۔"

تقریر کا یہ حصہ سن کر حکیموں کے چہروں پر دلچسپی کی کوئی خاص لہر نظر نہ آتی تھی بلکہ وہ چیئرمین کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے خاموشی سے اُس کو کہہ رہے ہوں کہ آپ نے آخر ہم کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا اب ہم سے ایسے کام لیے جائیں گے۔

اب نثار حسن کاظمی نے ترپ کا پتہ پھینکا۔ "جناب حکیم صاحبان اس کارِ خیر میں شرکت کے لیے ہم آپ کی تھوڑی بہت مالی امداد بھی کریں گے حکومت نہ صرف اس ملک کی بہتری اور خاندانی منصوبہ بندی کی کامیابی میں دلچسپی لے رہی ہے

بلکہ آپ کی مالی بہبود بھی اس کے پیشِ نظر ہے — طریقہ اِس کا یہ ہوگا کہ آپ ہمارے پاس سے اگر دس روپے کا مال خرید کر اپنے پاس رکھیں گے تو اس کو بیچ کر ہمیں صرف پانچ روپے واپس کر دیں گے باقی پانچ اپنی خدمات کے عوض منافع کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں گے۔"

اب معزز حکیم صاحبان کی دلچسپی خاندانی منصوبہ بندی میں فزوں تر ہونے لگی اور ہر طرف سے اِس تجویز کو خوش آمدید کہنے اور اس کی کامیابی کے لیے مزید تجویز پیش کرنے کی پیش کش شروع ہو گئی۔ ایک حکیم صاحب نے فرمایا کہ مسجدوں کے خطیبوں سے بھی اِس کارِ خیر میں شرکت کرنے کے لیے کہا جائے لیکن نثار حسن کاظمی نے اِس کی حامی نہ بھری۔ پرائمری اسکولوں کے مدرسوں کے متعلق خیال یہ تھا کہ جہاں تک اسکولوں کے اندر کا سوال ہے وہاں تک ان کا دائرۂ عمل بچوں تک محدود ہے اسکول سے باہر البتہ اگر وہ چاہیں تو نئے خیالات کی ترویج میں کافی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بعض حکیم صاحبان نے ان احتیاطی تجاویز کو حفظانِ صحت کے لیے بھی مفید قرار دیا اور جب ان اشیا کو اپنی دوکان پر اسٹاک کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوتا تھا ہر شخص دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا ہے۔

نثار حسن کاظمی نے کہا "جناب حکیم صاحبان سرکار کا حکم یہ ہے کہ میں پانچ روپے نقد لے کر دس روپے کا مال آپ کو دے دوں۔ یہ دس روپے کا مال بذاتِ خود چالیس پچاس روپے سے کم نہیں یہ تو صرف دیہات کی مالی حالت اور نئے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے ایسے کم داموں پر آپ کو دیا جا رہا ہے لیکن آپ کے چیئرمین صاحب آپ پر مزید مہربانی کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال

ہے کہ آپ میں سے جو صاحبان ہم کو یہ حلف نامہ لکھ دیں کہ وہ دس روپے کا مال ہم سے وصول کر رہے ہیں اور اس کو فروخت کر کے ہم کو پانچ روپے واپس کر دیں گے اور پانچ روپے خود رکھ لیں گے اُن کو مال فی الحال بغیر قیمت وصول کیے دے دیا جائے اور قیمت صرف اسی وقت وصول کی جائے جب مال فروخت ہو جائے۔"

اب حکیم صاحبان نے جھاگ والی گولیاں اور ربڑ اِس ذوق و شوق سے حاصل کرنے شروع کیے جیسے سمجھ دار تاجر منڈی میں دام سستے دیکھ کر زیادہ سے زیادہ مال خریدتا ہے۔

اب دوسرا مورچہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ نثار حسن کاظمی نے اپنی کارکردگی کی ماہانہ رپورٹ اپنے افسرانِ بالا کو بھیجنا شروع کر دی۔ وہ اُس کے کام سے خوش تھے اور وہ بھی اپنی کامیابی سے مطمئن تھا کبھی کبھی دیہات کی دائیاں اس کے دفتر میں آکر اسے اطلاع دیتیں کہ کیسے ابتدائی مدافعت کے بعد گھروں میں چکی چولہے کا کام کرنے والی عورتیں اب ان کی باتوں پر کان دھرنے لگی ہیں اور کبھی کبھی وہ خود اپنے علاقے کے دیہات میں اُن حکیموں کی دوکانوں کا دورہ کرتا اور خود اُن سے گفتگو کر کے اپنے کام کے متعلق نتیجہ نکالتا۔ جب وہ اپنے دیئے ہوئے مال کی قیمت فروخت اُن سے وصول کرتا تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا کہ حق بحقدار پہنچ رہا ہے اور دائیاں جو اس مہم کے ہراول دستے کا کام کر رہی ہیں نئے خیالات پھیلا کر حکیموں کے مال کی بکری کے راستے کھول رہی ہیں۔

نثار حسن کاظمی کے افسر اس کے کام سے خوش تھے اور اُس کو ہدایات آ رہی

تھیں کہ اب وہ اپنے علاقے میں اگلا قدم اٹھائے اور قریبی شفاخانے سے مل کر
احتیاطی مردانہ آپریشن کے لیے بھی رضاکار مہیا کرے اور اگر ہو سکے تو اپنے علاقے
کی عورتوں میں زیادہ مستقل احتیاطی تدابیر کو عام کرنے کی کوشش کرے لیکن
نثار حسن کاظمی ابھی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اُسے اِن کاموں
کے لیے کس قدر سخت جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ گاؤں والے ابھی تک اسے ایک
باہر سے آئے ہوئے اجنبی کی طرح ملتے تھے۔ گاؤں کی زندگی اور طور طریقوں کو
اختیار کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے اوپر
جبر کر کے اپنے اندر دیہاتی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاؤں والے نہ
اس کی عزت کرتے تھے نہ اس سے ڈرتے تھے محض اس لیے کہ انھیں معلوم
ہو گیا تھا کہ اس کے پاس دراصل کوئی سرکاری اختیارات نہیں ہیں۔ ایک دن ایک
دیہاتی نے اس سے پوچھا تھا۔ "ڈاکٹر جی یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے سولہ جماعتیں
پڑھی ہیں؟"

اس نے کہا یہ درست ہے تو دیہاتی بے ساختہ بولا۔ "پھر بھی آپ کو تحصیلداری
نہ ملی؟" نثار حسن نے کہا "ہاں مگر میں نے تو تحصیلداری کی کوشش ہی نہیں کی۔"
مگر دیہاتی نے فوراً کہا۔ "یار ڈاکٹر تحصیلداری نہیں ملتی تھی تو گرداوری کر لیتے۔"

نثار حسن کاظمی جب سیر کے لیے نکلتا تو گاؤں کی عورتیں جو سارا دن گاؤں
والوں کے سامنے بغیر گھونگھٹ نکالے اِدھر سے اُدھر پھرتی رہتیں اُسے دیکھ کر
فوراً گھونگھٹ نیچے کر لیتیں اور نثار حسن کو احساس ہوتا کہ وہ اِس گاؤں میں باہر والا
ہے۔ گاؤں والے اس کے پاس آ کر یونین کونسل کے چیئرمین کو لاکھ لاکھ گالیاں دیتے

اُسے ڈکیت اور دستہ گیر کہتے لیکن جب اُس کے سامنے آتے تو اس کی خوشامد بھی کرتے۔ اُس کے پاؤں بھی چھوتے اور گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے محض اس لیے کہ اس کے پاس اختیارات تھے۔ وہ پولیس سے نفرت کرتے مگر تھانے کا ایک سپاہی بھی اگر گاؤں میں آجاتا تو گاؤں کا ہر شخص مؤدب ہو کر اس سے بات کرتا۔

آہستہ آہستہ نثار حسن کاظمی پر اِس کائنات کے اسرار و رموز کھلنے لگے تھے اور وہ سوچتا تھا دیہات میں کام کرنا کسی شہر والے کے صبر اور ذہانت کا آخری امتحان ہے لیکن اسے ایک بات کا ہمیشہ سہارا رہتا تھا اور وہ یہ تھی کہ اُسے اپنے کام کی اہمیت اور ضرورت پر ایمان تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ جو کام کر رہا ہے اس میں اُس کے ملک کی بھلائی ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اِس زندگی کی ہزار مصیبتیں برداشت کرتا جا رہا تھا اور اُس نے گاؤں کی زندگی کی اُداسی کو بھی برداشت کر لیا تھا جو گھن کی طرح اُس کی روح کو کھائے جا رہی تھی۔

گیہوں کے کھیت سنہرے بھورے ہو کر کٹنے شروع ہو گئے تھے اور فضا میں گرمی اور اُداسی پھیلنے لگی تھی۔ فصلیں کٹنے لگی تھیں اور درگاہوں اور مزاروں پر عرس اور میلے لگنے شروع ہو گئے تھے۔

نثار حسن کاظمی یونین کونسل کے صحن میں درخت کے نیچے بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ ساتھ کے گاؤں کا نمبردار اس کے پاس آیا اور رازداری کے لہجے میں اُس سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دم اُس کی آواز میں غصہ بڑھنے لگا اور وہ اونچی آواز میں بولا "دیکھئے میں آپ کو بتا دیتا ہوں سارا گاؤں

ڈانگیں لے کر آپ کے اُس حکیم پر ٹوٹ پڑے گا اور اُس کا سر توڑ دے گا۔ آخر بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

نثار حسن نے نمبر دار کو تسلی دی اور بار بار یہ کہا "آپ گھبرایئے نہیں میں خود آکر اس کی تحقیق کروں گا۔ آج ہی تحقیق کروں گا۔ یہ بھلا ہو کیسے سکتا ہے یہ تو سرکاری مال ہے۔"

سہ پہر کو نثار حسن کاظمی اپنے گاؤں سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے قریبی گاؤں میں پہنچا۔ گاؤں کے میدان میں چھوٹے چھوٹے لڑکے، لڑکیاں کھیل رہے تھے۔ دن بھر لُو چلتی رہی تھی اور اب لُو چلنا تو بند ہو گئی تھی مگر مٹی کے ذرے ہوا میں معلق ہو گئے تھے جس سے گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ میدان میں ہر طرف گرد اُڑ رہی تھی اور گاؤں کے بچے دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز اپنے کھیلوں میں مشغول تھے وہ گرد و غبار اڑاتے اِدھر سے اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ اُن کے پاس آٹھ دس غبارے بھی تھے جنہیں کبھی وہ ہوا میں اچھالتے تھے اور کبھی فٹ بال کی طرح پاؤں سے ٹھوکر لگا کر اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک طرف کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نثار حسن کاظمی نے اُسے محبت سے اپنے پاس بلایا۔ "کیوں پُتر یہ غبارے تم کہاں سے لیتے ہو؟" "حکیم جی کی دوکان سے۔" اس نے بے تکان جواب دیا۔ "کتنے میں آتا ہے۔" نثار حسن نے پوچھا۔ "ایک آنے میں۔" لڑکے نے کہا۔

نثار حسن کاظمی نے جیب سے ایک آنہ نکال کر اُسے دیا اور کہا "لو بیٹا تم بھی ایک خرید لو۔" لڑکا اکنی لے کر گلی کی طرف بھاگا۔ نثار حسن کاظمی جلدی جلدی قدم اٹھاتا

اس کے پیچھے چل کر گلی کے موڑ پر رک گیا جہاں سے حکیم صاحب کی دکان صاف نظر آتی تھی۔ لڑکے نے ایک آنہ حکیم صاحب کو تھما دیا۔ انہوں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا۔ اندر سے ایک ربڑ نکالا اُسے کھول کر منہ کے قریب لے گئے۔ دونوں ہونٹ اُس کے اوپر رکھے اور پھیپھڑوں کی ساری ہوا پورا زور لگا کر اس کے اندر بھر دی۔ نثار حسن کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ کمبخت چیز پھیل کر اتنی بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ اب وہ غبارہ پھول کر ایک اچھے خاصے تربوز جتنا بڑا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب نے اِکنی اپنی صندوقچی میں ڈالی اور غبارے پر دھاگہ باندھ کر بچے کے حوالے کر دیا جو اسے لے کر بھاگتا ہوا آیا اور باقی بچوں میں شامل ہو گیا۔

نثار حسن کاظمی میدان کے کنارے اپنا سر تھامے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کائنات میں ہر طرف غبارہ سے ہی غبارے اڑتے پھرتے تھے — دس پیسے کے بارہ مگر آنے کا ایک ایک!

("نقوش" لاہور)

مسعود مفتی

دو خون

رات تاریک تھی۔ مگر عورت راستے سے واقف تھی۔

سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتی گئی۔ تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ مگر دھیمی رفتار قائم تھی ۔۔۔ اندھیرے میں اسے سامنے بی آر بی نہر کا باٹا پور والا پل نظر آیا۔ نقاہت سے لڑتے ہوئے اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو تاروں بھرے آسمان کی ہلکی روشنی کو ایک مینار کا تاریک ہیولا کاٹ رہا تھا۔

یہ مینار نہر کے غربی کنارے پر ایک یادگار ہے۔

یہ اس خون کی یادگار ہے جو ایک عظیم مقصد کے لیے نہر کے گدلے پانی اور سڑک کے سخت سینے پر فواروں کی مانند اُبلا۔ حمایت علی شاعر نے کہا ہے کہ :۔

"یہ خون رنگِ رخِ چمن ہے .... خوابِ دلہن ہے .... ہر باپ کا بدن ہے .... بھائی کا بانکپن ہے .... ہر ماں کے دل کی دھڑکن ہے .... بچوں کا بھولپن ہے .... کھیت کی پھبن اور مزدور کی لگن ہے ۔۔۔ یہ خون سرمایۂ وطن ہے ۔"

یہ یادگار زنجیروں کے حلقے میں ایستادہ ہے ۔۔ گول فرش پر پہلو دار چبوترہ،

جس کے ماتھے پر پتھر ڈٹا لین کے متاعِ حیات لٹانے والے شہیدوں کے نام
کُھدے ہوئے ہیں — چبوترے کے اوپر جو گول مینار فضا میں ابھرتا ہے۔ جس پر
کندہ ہے

" اُن شہدار کی یاد میں
جو پاک و بھارت جنگ ستمبر ۱۹۶۵ میں کام آئے
اس راہ سے گزرنے والے ہموطنو! اسلام کے ان سپاہیوں
کو خراجِ عقیدت پیش کرتے جاؤ جو اپنا سب کچھ قربان کر کے ہماری بقا کا
سامان کر گئے۔"

مینار کی چوٹی پر ایک گنبد ہے — مسجد کے مینار والا گنبد — اس ماحول کا نمائندہ
جس کی بقا کے لیے خون بہا۔ جو ان جسموں کے چیتھڑے اڑ سے۔ سڈول بازوؤں
اور بھرپور رانوں کی قاشیں کٹ گئیں۔ فولادی ہاتھوں اور نورانی پیشانیوں کے شفق
رنگ ٹکڑوں نے توپوں کی پرہول گھن گرج کے ساتھ سرخ فضا میں ابدیت کا تفس
کیا۔ جن سے مسحور ہو کر دشمن ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ عورت رات کی تاریکی میں اس یادگار کے پاس آکر رکی۔

وہ یہاں پہلی دفعہ نہیں آئی تھی۔ اپنے گاؤں سے سات میل فاصلہ پیدل چل
کر وہ دو چار دفعہ پہلے بھی یہاں آئی تھی۔ کبھی ساتھ والے درخت کے نیچے بیٹھ
کر قرآن پڑھتی رہتی اور کبھی حاشیے والی زنجیروں کو تھام کر چبوترے کو ٹکٹکی باندھے
دیکھتی رہتی جس پہ دینو کا نام درج تھا۔

دینو اس کا ہمسایہ تھا — بچپن اور جوانی کا ہمسایہ — جو بعد میں فوج میں

بھرتی ہو گیا تھا۔

وہ کھیت پر اس کے لیے لسی لے کر جایا کرتی تھی۔ کیونکہ دونوں کی زمینیں ملحقہ تھیں۔ جب وہ اپنے بابا کے لیے روٹی لے جانے لگتی تو دینو کے گھر میں بھی جھانکتی۔

"ماسی، مَیں جا رہی ہوں اُدھر۔ لسی دینی ہے تو دے دو۔"

اور ماسی لگاتار دعائیں دیتے ہوئے اسے ایک پوٹلی اور مٹی کا برتن دے دیتی جو وہ اپنے لچکدار کولھے پر لٹکا کر دھڑکتے دل اور لرزاں قدموں سے دینو کے آگے لے جا کر رکھ دیتی۔

یہ عورت ان دنوں ہلکی پھلکی نازک اور سبک چھبیلی تھی۔ وہ رم جھم کر کے چلتی تو دینو کے دل میں برکھا ہونے لگتی۔ جو گاؤں میں گتکا کھیلنے والا پٹھا تھا۔ کبڈی کا پھرتیلا کھلاڑی تھا۔ اور چاندنی راتوں میں سریلے گلے کی اونچی تان پر ماہیا گانے والا تھا۔

ان کا گاؤں سرحد کے پاس ہی تھا ـــــ

پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ اور ہجرت کی خون بھری داستانیں ابھی تازہ تھیں قافلوں کے لٹنے، معصوموں کے قتل اور بربریت کی گواہیاں ابھی لوگوں کی آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ لٹی ہوئی عصمتوں کی پژمردہ راکھ ابھی سلگ رہی تھی ـــ کشمیر کی جنگ جاری تھی۔ ایسے میں شام کے وقت لوگ حقّے کے کش لگاتے ہوئے ذکر چھیڑتے کہ شاید ہندوستان حملہ کر دے ـــ اور ان کا گاؤں تو سرحد کے پاس ہی تھا۔

کیا وہ ڈراما پھر ہو گا؟ دینو غصّے سے کھول کر سوچتا۔ اور یہی سوچتے سوچتے اس نے ایک دن فوج میں نام لکھوا لیا۔

"یہ زمینداری کرتے کرتے تمہیں فوج کی کیا سوجھی دینو؟" چودھری نے

گلی سے گزرتے ہوئے پوچھا۔

"چودھری جی! دینو نے بڑے جذبے سے کہا تھا۔" ہم لوگ مرنے کو تیار ہوں گے تو گاؤں کی بیٹیوں کی عصمت محفوظ رہ سکے گی — آئیں تو سہی ہندوستانی ادھر۔ چمڑا نہ اُدھیڑ دوں اُن کا۔"

اور دروازے کی اوٹ میں چھپ کر سننے والی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے — اب وہ کس کے لیے لسی لے کر جائے گی؟

دینو چلا گیا —

لڑکی کی شادی گاؤں کے ایک اور نوجوان سے ہو گئی — اور جب ایک دن دینو وردی پہنے گاؤں میں آیا تو اس نے بڑے دکھے ہوئے دل سے اس لڑکی کی شیر خوار بچی کو پانچ روپے اور ایک جھنجھنا دیا تھا۔ اور بڑے بڑے بوٹ بجاتا گھر سے باہر نکل گیا تھا — بچی کی ماں گہری آنکھوں سے جانے والے فوجی کو دیکھتی رہی۔ اور پھر مڑ کر بے اختیار اپنی بچی کو چوم لیا۔ جس کی حفاظت کے لیے اس نے وردی پہنی تھی۔

وہ بچی سولہ سالہ مٹیار تھی۔ اور اس کی ماں ایک بھرپور عورت تھی۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے واقعی حملہ کر دیا۔

مگر دینو کی وردی نے دونوں کی عصمت بچا لی — اور وہ اس کے لیے سراپا تشکر تھیں۔ اس لیے کبھی کبھار اس مینار پہ فاتحہ خوانی کے لیے آتی تھیں — اور ایک دفعہ تو لڑکی بھی آئی تھی۔ مگر آج وہ عورت اکیلی تھی۔ اس کا خاوند جو ایک بڑے زمیندار کا مزارع تھا، پیچھے گھر میں تھا۔

یادگار کے پاس پہنچ کر اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ سخت تھکی ہوئی تھی۔ جب وہ مینار کے پاس پہنچی تو ابلتی ہوئی سسکیاں اس کے سینے میں طوفان مچا رہی تھیں —— زنجیر کی پرواہ کیے بغیر وہ پھلانگی —— اور قریباً لڑھکتی ہوئی چبوترے تک جا پہنچی —— والہانہ طور پر اس نے اپنا چہرہ دینو کے نام پر رکھ دیا۔ اور بازو پھیلا کر اوندھے منہ لیٹ گئی۔

پہلے دبی گھٹی سسکیاں ابھریں —— پھر ہچکیوں کا تار بندھ گیا —— جن سے اس کا سارا جسم جھٹکے کھانے لگا۔

پھر چبوترے پر دونوں ہاتھ بے تابی سے پھیرتے ہوئے بولی۔

"دینو ..... تم کیوں مرے ..... اگر اب بھی ..... زمیندار ....."

سسکیوں کے ریلے نے اسے مزید نہ بولنے دیا —— تب اس نے لپٹی ہوئی چادر ڈھیلی کی —— اور اپنی سو سالہ کنواری لڑکی کی خون آلودہ شلوار دینو کے نام پر رکھ دی .....

پھر وہ بلک بلک کر چیخیں مارنے لگی۔

ایک خون کی یادگار کو، دوسرا —— بالکل مختلف قسم کا —— خون، آنسوؤں میں گھل گھل کر بھگو رہا تھا۔

("ادبِ لطیف" لاہور)

سامانِ شیون

آبنوسی فرش پہ نوعمر کنواری کے گیلے پیروں کے نشان ہیں۔

جب جون کے مہینے کی گرم ہوا انھیں بوسہ دینے کے لیے جھکے گی تو یہ نشان خود بخود اس بوسے میں جذب ہو جائیں گے ـــــ اور سیاہ فرش پہ سے ان کا نشان یوں مٹ جائے گا جیسے مائع گیس بن کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ پھر گیلے پیروں کا نشان جون کا مسموم بوسہ بن کر سیاہ فرش پر آگ برساتا املتاس کے درختوں میں نکل جائے گا اور کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ ہر سیاہ فرش پر کسی نہ کسی نوعمر کنواری کے پیروں کے نشان ہوا کرتے ہیں۔

میری ساری عمر ایسے ہی نشانوں کے تعاقب میں گزری ہے ـــــ میں نے مادہ کو اپنے سامنے حالتیں بدلتے دیکھا ہے۔ ٹھوس سے مائع اور مائع سے گیس ـــــ میری زندگی کا سیاہ فرش بہت چکنا ہے اور اس پہ یادوں کے نشان بہت جلد مسموم بوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میرے کمرے کے سامنے ایک اونچا پیپل کا پیڑ تھا۔ گرمیوں میں اس کی آخری پھننگ پر ایک چیل کا گھونسلا نظر آیا کرتا تھا۔ اس گھونسلے میں انڈہ سیتے والی چیل جون کی دھوپ میں میری طرح تنہا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے اس چیل پر بہت

ترس آیا کرتا تھا۔ بھری دوپہر میں جب مجھے املتاس کے زرد فانوس روشگوفوں سے کوئل کی آواز آتی۔ سرونٹس کوارٹر کی جانب سے کوئی شوخ بچہ پپیہے کی آواز بلند کرتا تو مجھے ایئر کنڈیشنز کی مسلسل گھر گھر سے خوف آنے لگتا۔ ٹھنڈے کمرے میں بسی ہوئی ایئر خس شنز کی خوشبو لیولین کی طرح ناک میں گھسنے لگتی۔ پھر یکدم میری ناک بند ہو جاتی۔ میں سوں سوں کرتا کھڑکی میں چڑھ بیٹھتا اور پردے کی جھری سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر دور دور تک تانبے کی طرح چمکتی روشنی ہوتی اور دیواروں سے، پٹڑیوں سے روشنیوں پر ایسا ہلتا ہوا پانی نظر آتا جیسا گرم سڑک پہ دور سے ایک آبی سا سراب بن جایا کرتا ہے۔

امی ابو کا یہ کمرہ جس میں تین ٹن کا کولر تھا، فرانسیسی وضع کا بیڈروم تھا۔ دیواروں کی جلد صاحب لوگوں کے نوزائیدہ بچے کی طرح صاف، ملائم اور بے داغ تھی۔ سارا فرانسیسی فرنیچر امپورٹڈ تھا۔ امی کی الماریاں، ڈریسنگ ٹیبل، شلف، چیسٹ آف ڈراز سب سفید تھے، جن کی جلد فارمائیکا کی تھی۔ چابی لگتے ہی الماریوں میں ہونے ہونے گھنٹیاں بجنے لگتیں جیسے ککو کی گھڑیوں میں عموماً بجا کرتی ہیں۔ کمرے میں ہر طرف سفید پردے تھے۔ ابریشمی، آبِ رواں سے بے ضرر پردے ——
اسی سفید کمرے میں میری سفید ماں آئرش لنن کی چادر پر سفید پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے تختے ایک دوسرے پہ دھرے گھنٹوں لیٹی رہتی تھی۔

میری ماں بڑی نازک عورت تھی —— ہاٹ ہاؤس کے سفید گلاب کی طرح گرم و سرد سے بے نیاز، وہ آرائش، زیبائش اور نمائش کے لیے بنی تھی۔ کسی قسم کی آزمائش سے اُس کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ میری پیدائش کے بعد اُس کا نازک جسم پھر کبھی بار آور

ہونے کا حوصلہ نہ کرسکا۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن اس محبت کا
اظہار ہمیشہ تحفے لانے تک محدود رہا۔ وہ نہ کسی کو بھینچ کر سینے سے لگا سکتی تھی اور
نہ ہی کسی کی والہانہ گرفت کی متحمل ہو سکتی تھی ــــ میری ماں کو انسانی جسم کی خوشبو سے
نفرت تھی۔ اُسے مجھ سے بو آتی تھی، ملازموں سے بو آتی تھی۔ اُسے میرے گنجے
باپ سے بُو آتی تھی۔ وہ سارا دن اپنے جسم پر، اپنے کمروں میں، اپنے بستروں پر
بدیسی خوشبو چھڑکتی رہتی تھی۔ میری ماں نے جب کبھی کسی سے ہاتھ ملایا، بعد میں اپنے
ننھے رومال سے (جس پر اس کے نام کا پہلا حرف انگریزی میں کشیدہ کیا ہوتا تھا)
اپنا ہاتھ ضرور پونچھا۔ میری ماں جس کمرے میں داخل ہوتی اُس کا پہلا سانس لیا اور
انسانی ہاتھ کی طرح محسوس کرتا نکلتا۔ وہ اُس ایک سانس میں کمرے کے تعفن، اس
کی گھٹن اور اس کے رہنے والوں کی خوش ذوقی کا اندازہ لگا لیا کرتی تھی ــــ اس
لیڈی آف شیلاٹ، اس ہاٹ ہاؤس کے سفید گلاب، اس پلاسٹر آف پیرس کی
میڈونا نے اپنی محبت کی شدت میں مجھے اس طرح پالا جیسے کسی سراپ کے خوف
سے کوئی راج کنیا اپنا بچہ کسی مٹھ میں پال رہی ہو ــــ مجھے اسکول جانے کی اجازت
نہ تھی۔ میرے اتالیق گھر پر آکر مجھے پڑھاتے تھے۔

سرونٹس کوارٹر کی طرف قدم دھرنا تو درکنار ادھر دیکھنے کی بھی ممانعت تھی۔
اس طرح نیلے لہو پر مقامی سیاہ لہو کی پرچھائیں پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ ہمارے
رشتہ داروں سے ماں کبھی کی کٹ چکی تھی۔ وہ اب ایک ایسے سوشل سرکل میں
رہتی تھی جہاں سب روز روز ملتے ہیں لیکن کوئی کسی کو نہیں جانتا ــــ میری ماں
کے اردگرد غیر ضروری مصروفیات کا کچھ ایسا جال پھیلا تھا جیسے گھنی الیر کی باڑ کو

امر بیل نے ڈھانپ رکھا ہو۔ وہ فرصت کے لمحوں میں بیمار رہتی تھی اور غیر ضروری
مشاغل کے وقت چاق و چوبند ۔ میری ماں اُن عورتوں میں سے تھی جنھیں عرب
بدوی اتانہ کہتے ہیں۔ کمزوری اور بیماری کے بہانے انھیں ایک ایسی خود فریبی میں
مبتلا رکھتے ہیں کہ پھر وہ نہ اپنے نہ کسی دوسرے کے کام کی رہتی ہیں ۔

ابو گنجے تھے، خاموش طبع تھے اور دولتمند تھے۔ ہر دن کے ساتھ ساتھ اُن کے
گنجے پن، خاموشی اور دولت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ سردیوں کی لمبی شاموں میں
وہ کبھی کبھی میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے۔ اُن کے ہاتھ میں ہمیشہ اُن کا بریف
کیس ہوتا۔ اس بریف کیس کے کئی خانے تھے اور ہر خانے میں ضروری کاغذات
اور اہم چٹھیاں ہوا کرتی تھیں، پھر وہ زِپ کھول کر کچھ ایسے خط نکال لیتے جن میں
مختلف مشینوں کی لسٹیں موجود ہوتیں۔ اُن کا سر بیرونی ممالک سے آئے ہوئے
خطوں پر جھک جاتا اور وہ خاموشی سے خط پڑھتے رہتے اور جب خط ختم ہوجاتے
تو وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلے جاتے۔ میں اپنے اُن کھلونوں کے انبار میں سے
اُنھیں دیکھتا رہتا جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ خدا جانے کیوں میرا جی چاہتا کہ
میں اُٹھ کر ابو کے چکنے چکنے سر پر ہونٹ رکھ دوں لیکن اُن کے خاموش چہرے
کو دیکھ کر مجھے عجیب سا خوف آتا۔

سردیوں کی طویل راتوں میں جب میرے کمرے میں سرخ ہیٹر جلتے اور گرم
پانی کی بوتل میرے پیروں کو چھوتی، بستر میں سے لیونڈر کے پھولوں کی خوشبو آتی
اور پروں کی رضائی پر میری کامک کی کتابیں بکھری ہوتیں۔ ایسی راتوں میں جب اچانک
کھڑکی پر رات کے وقت بجلی کی چمک سے چانن ہوجاتا۔ میں جاگ اُٹھتا۔ سردیوں

کی بارش کھڑکیوں پر بجتی۔ گرم پانی کی بوتل ٹھنڈی ہو کر قالین پر لڑھک جاتی اور میں جاگتا رہتا اور سوچتا رہتا۔

بہار اور خزاں کے دن تتلیوں اور پھولوں کی وجہ سے تکلیف دہ تھے۔ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت پسند تھیں اور ان دونوں سے میں بہت خوفزدہ تھا۔ ایک دفعہ میں نے ایک زرد رنگ کی تتلی پکڑ کر ایک گلاس کے نیچے بند کر دی تھی۔ اُس کا دل بہلانے کے لیے میں نے دو چار رنگین پھول بھی ساتھ مقید کر دیئے۔ یوں زرد تتلی کو محبوس کر کے مجھے عجیب فرحت سی محسوس ہوئی، لیکن جب میں دوپہر کا کھانا کھا کر لوٹا تو وہ تتلی پھولوں کی قبر میں پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اُسے پانی پلا کر زندہ کرنا چاہا تو اُس کے پروں کا زرد برادہ میری انگلیوں پر اُتر آیا۔ اُس کے خوش رنگ پر زندہ رہے لیکن وہ خود مر گئی — تنہائی کی موت!

میرے تجربے چھوٹے چھوٹے تھے جن کا تعلق روح اور ذہن سے بہت گہرا تھا۔ میں گناہ اور ثواب کے چکر میں دُور تک اتنا دھنس گیا تھا کہ تتلی کے یوں اچانک مر جانے کو میں نے دوزخ میں گھر بنانے کے مترادف سمجھا اور دو دن تک پرائشچت کے طور پر بھوکا رہا — یہ بیکار دن — یہ بیکار راتیں، یہ آسایش کے پالنے میں چاندی کا چمچ منہ میں لیے ساٹن سی جلد والی چھت کو تکنے والا بچہ عجیب کرب کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ تو گرمیوں کی لمبی دوپہریں تھیں۔ ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں ایک امیر بچے کی گرمیوں کی سرد دوپہریں!

امی پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے ٹخنے آپس میں جوڑ کر کسی جاسوسی ناول کو پڑھتی سو جاتیں، اور میں کولر والا کمرہ چھوڑ کر نیچی چھت والے گرم کمروں میں

گھومتا رہتا۔ سارے کمرے یکساں طور پر آراستہ اور گرم ہوتے تھے۔ ان نیچی چھت والے کمروں میں قالینوں کی گرم مہک پردوں کے اندر محبوس ہوا کرتی تھی۔ پھر ان کمروں کو چھوڑ کر میں اپنے کمرے کے سامنے چھوٹے سے لاؤنج میں آجاتا جہاں بیرونی دیوار ساری شیشے کی تھی۔ اس جگہ سے چیل کا گھونسلا بڑی اچھی طرح نظر آتا تھا۔

ایک بار اس گھونسلے کو خوبصورت بنانے کے لیے چیل کہیں سے میری امّی کی جالی دار محرم اُڑا لائی تھی۔ بیل کی آخری پھننگ پر کرخت تنکوں کے گھونسلے کے ساتھ فرانسیسی لیس کی محرم! اگر کسی اشتہار دینے والی ایجنسی کو پتہ چل جاتا تو وہ اس گھونسلے کا کلوز اپ ضرور لیتے۔ گھونسلے میں بیٹھی ہوئی فرانسیسی میڈن جیسی چیل عقابی ناک اور پُرشکوہ پرسنلٹی اور نیچے رقم ہوتا — گرمی ہو یا سردی ہر باذوق خاتون کے لیے — ہر موسم میں —

میں اس گھونسلے کو دیکھتا رہا اور املتاس کے زرد فانوسوں میں سیاہ سپیرا بار بار کوکتی رہتی۔

ٹیوب ویل کے چلنے کی آواز آتی رہتی۔

کوارٹروں میں بچے پیپیے بجاتے رہتے۔

گھونسلا دیکھتے رہنے کے بعد میں جب کبھی کمرے کے اندر دیکھتا تو میری آنکھوں کے آگے ایسے شعلے ٹوٹتے جیسے کمرے میں ویلڈنگ ہو رہی ہو۔ پھر میری کمزور اور بیمار ماں کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ اُٹھ کر ننھے سے رومال سے منہ صاف کرتیں۔ ایسا ہاؤس کوٹ پہنتیں جس میں سے سارے کپڑے اور بھی واضح طور پر نظر آتے۔ اپنے

کٹے ہوئے بالوں کو زرد اور بیمار انگلیوں سے سنوارتی ہوئی وہ مجھے تلاش کرنے لگتیں۔
گرم کمروں میں محبوس گرم فضا میں سانس لیتے ہر کمرے کی خوشبو کا التزام جائزہ
لیتے ہوئے وہ مجھ تک پہنچتیں۔
امّی نے مجھے کبھی نہیں جھڑکا۔
ابّو مجھ پر کبھی ناراض نہیں ہوئے۔
ہم تینوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اس قدر اعتماد نہیں تھا کہ ہم اپنے
دل کی بات کو الفاظ میں ڈھال سکتے۔
امّی کو دیکھ کر میں چپ چاپ اُن کے ساتھ رخصت ہو جاتا اور خوشی کے ساتھ
کولر والے کمرے میں پلنگ پر لیٹ جاتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری ناک بند ہو جاتی۔
امّی ابّو کی ہر اہم بات انگریزی میں طے ہوا کرتی تھی۔ جس طرح تھکے ہارے بڈھے ڈنکا
مار کر گنگنی میں سے گری نکال لیتے ہیں اور چھلکا رہنے دیتے ہیں اسی طرح ان کی گفتگو
کا سارا مفہوم میں چگ لیتا اور پھوگ رہنے دیتا۔
میں اس سفید کوٹھی میں اس طرح پل رہا تھا جیسے کسی ہسپتال کے INCUBATOR
میں ستماہہ بچہ دن کاٹ رہا ہو۔ ایسی زندگی نے مجھے بہت نازک مزاج —
بنا دیا تھا۔ ہر موسم کی تبدیلی میری صحت پر اثر انداز ہوتی۔ میری غذا انتہائی اہتمام
سے تیار ہوتی تھی۔ اس میں سے ذرا سا ردوبدل صحت کی خرابی کا بہانہ بن جاتا۔
بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرنے کے لیے مجھے اتنے ٹیکے لگوانے
پڑتے کہ جاں بلب مریض کو اتنے ٹیکوں کی شاذ ہی ضرورت پڑتی ہوگی۔ ہمارے
گھر کا سارا انتظام گھڑی اور خوف کے تحت چلتا تھا۔ چوروں کا خوف —

بیماری کا خوف ـــــ بڑھاپے کا خوف ـــــ ملازموں کا خوف ـــــ اخبار پڑھ کر انجانے حادثوں کا خوف ـــــ بالآخر آسائش چھوڑ کر مرنے کا خوف! تمام غیر ضروری مشاغل گھڑی کے تابع تھے۔ ہر غیر اہم کام گھڑی دیکھ کر کیا جاتا تھا۔ یہاں ڈنر پر جانے کی جلدی تھی۔ یہاں ڈنر سے لوٹ آنے کی جلدی تھی۔ صبح الارم لگا کر اٹھا جاتا تھا اور پھر الارم بند کر کے نیند کی جاتی تھی۔ ملازموں کو مقررہ وقت پر ناشتہ لگانے کا حکم تھا اور پھر ناشتہ کی جگہ صرف گریپ فروٹ کھایا جاتا تھا، ہر لباس اہتمام سے پہنا جاتا تھا اور اہتمام سے پہننے کے بعد اُسے اتار پھینکنے کی جلدی رہتی تھی۔ ہمارے گھر میں وقت کی سونے کی طرح قدر کی جاتی تھی اور سونے کی قدر اس لیے ختم ہو چکی تھی کیونکہ یہ مایا داس کا گھر تھا۔ اس میں جس چیز کو ہاتھ لگاؤ کھٹ سے سونے کی بن جاتی تھی۔

اکیلی چیل سے متاثر ہو کر ایک بار میں نے بلّی پالنا چاہی تھی۔ ننھی سی سفید بلّی۔ وہ چھوٹی سی گلابی ناک والی بلّی خدا جانے کیوں کر ہمارے گھر آ گئی تھی۔ شاید اُسے چیل نے بھیجا تھا جو بھری دوپہر میں عقابی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی تھی ـــــ گچھے وار دم والی ننھی سی سفید بلّی بڑی چٹوری اور بڑی کھلنڈری تھی۔ پہروں اپنی دم کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ گلابی زبان سے اپنے پنجے چاٹتی۔ رتی بھر مٹی لگ جاتی تو پہروں اپنا جسم زبان سے دھوتی۔ اس بلّی کو میں نے اپنی زندگی میں داخل کر لینا چاہا لیکن میری امّی نے اس بات کی اجازت نہ دی کیوں کہ انھیں جانوروں کے بالوں سے، پرندوں کے پروں سے اور چڑیوں کے گھونسلوں سے الرجی تھی۔ ایسی کوئی چیز کوٹھی کے احاطے میں ہوتی تو انھیں چھینکیں آنے لگتیں اور وہ بیمار پڑ جاتیں۔ جس

روز ننھی سفید بلی کو بوری میں بند کر کے چوکیدار روانہ ہوا میں سو رہا تھا۔
اگر میں جاگ بھی جاتا تو میرا ردِ عمل وہی ہوتا۔
اپنے گنجے باپ کی طرح میں بہت خاموش ہوں۔
سر پر الو کے مرکبات ملتے رہنے کے باوجود اُن کے گنجے پن میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔
ذہانت کی کمی کے باوصف اُن کی دولت گوندنی کے پیڑ کی طرح لدی چلی جا رہی تھی۔
میرا باپ بہت شفیق تھا۔ وہ جس کسی ملک میں جاتا میرے اور امی کے لیے وہاں کی مہنگی ترین سوغاتیں لاتا۔ میرے باپ کے سوٹ کیس پر اُن گنت ایئر ٹریول کی پرچیاں چپکی ہوئی تھیں۔ وہ رومانیہ، بلغاریہ، بلجیم، پولینڈ، روسی ترکستان کی باتیں اس طرح کرتا جیسے کوئی بوری بازار، لوہاری مارکیٹ یا انارکلی کی بات کر رہا ہو۔
اس ماحول سے نکل کر جب میں بالآخر سکول میں پہنچا تو میں نے اپنے اردگرد ایک ایسا حصارِ باوقار تعمیر کر لیا تھا کہ ہم جماعت تو در کنار اُستاد تک مجھ سے الگ تھلگ رہنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ سکول میں مجھے کوئی ہم سطح لڑکا نہ ملا۔ کچھ مجھ سے اوپر تھے کچھ نیچے ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ دو چار لڑکوں نے محبت کے برمے لگا کر میرے دل کی فصیل میں سوراخ کرنا چاہا۔ سوراخ ہو بھی گئے، فصیل ٹوٹ بھی گئی لیکن اُن لڑکوں کو علم نہ ہو سکا کیونکہ میں اپنے باپ کی طرح خاموش تھا۔
خدا جانے اصلی وجہ کیا تھی۔ لیکن جب میری امی ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مئی کے وسط میں مری چلی گئیں تو پہلی بار میں نے کھلی فضا میں سانس لیا۔ ان

دنوں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور پہلی بار امی سے بچھڑا تھا۔

ہمارے گھر میں جہاں ہر طرف ماؤتھ واش ڈیوڈورنٹ اور ایئر فرشنر کی خوشبو تھی ایک تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔

اچانک ، بلا تکلف اور آزادانہ —

یہ پہاڑوں کی ہوا گلو تھی۔

ہزارے کی یہ لڑکی چکی کی طرح تکلیف دہ اور مزیدار تھی۔ اُس کا ہیموگلوبن کسی آئرن ٹانک کا محتاج نہ تھا۔ ہر وقت تمتمایا سا چہرہ گڑھل کے پھول کی طرح سرخ رہتا۔ چہرے مہرے سے کسی سپیرے کی لڑکی لگتی تھی۔ جسم دیکھ کر کاٹھ کی لڑکیاں یاد آتیں جن کی جوانی تنی کمان جیسی اور سادہ میز ڈھیلے جھولے جیسی ہوا کرتی ہے۔ چال ڈھال میں کنجاہ کی چاشنی تھی۔ باتیں کرتی تو سوئی ہوئی لگتی۔ چپ ہو جاتی تو یوں لگتا بولے جا رہی ہے۔

میرا وجود ان دنوں تھرموس سے مشابہ تھا۔ ایک بار جو بھی جذبہ اندر ڈال کر کارک لگا لیتا ، دیر تک اُس جذبہ کی حدت و حرارت ویسے ہی برقرار رہتی۔ اس تھرموس میں سب سے پہلے میں نے گلو کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کا گرم گرم لاوا بند کر لیا۔

گلو بیرے جہاندار خاں کی بہن تھی اور ایک ماہ کے لیے جب جہاندار کی ٹانگ کو پلستر لگا تھا، بیراگیری پر مامور ہوئی تھی۔

غالباً اس سے زیادہ اُجڈ، گنوار اور بے تمیز بیرا پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ پہلے ہی دن جب وہ میز پر غلط سلط برتن لگا کر سوپ لائی تو رکھنے رکھانے

میں اُس نے آدھا سوپ مجھ پر اور آدھا سوپ اپنے اوپر انڈیل لیا۔
میرے لیے یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا۔ سوپ کبھی گر بھی سکتا ہے میں اس کے لیے تیار نہ تھا میں نے ابھی سرویٹ تک ہاتھ پہنچایا ہی تھا کہ وہ اپنے دوپٹے کی گدی سی بنا کر بڑی بے تکلفی سے میری قمیص اور پتلون پونچھنے میں مشغول ہوگئی۔
"تم رہنے دو ——" میرے گنجے ابا بولے۔
"کوئی بات نہیں جی میرا دوپٹہ گندا ہے —— ۔"
یہی تو میں کہہ رہا ہوں —— "گندا ہے رہنے دو۔" میرے امیر ابو بولے۔
وہ لمحہ بھر مشکل۔ سمجھنے کی کوشش میں اس نے ابو کی جانب دیکھا اور پھر باز نیر نو بھر کی طرح چاروں طرف گھوم پھر کر سوپ سکھانے میں مصروف ہوگئی۔
گلو کی آنکھیں مہاتما بدھ کی آنکھیں تھیں۔ لمبی لمبی کنپٹیوں تک تیری ہوئی —— کچھ خوابیدہ سی، کچھ محتاج جیسی —— آنا س ہوتے ہوئے ذرا ذرا مسکراہٹ نے والی آنکھیں مجھے ان آنکھوں کو قریب سے دیکھنے کی ایسی شدید تمنا کا سامنا کرنا پڑا کہ میں پوش پوش کرتا اپنے کمرے میں بھاگ گیا۔
اس عمر کی محبت میں انسان بہت زیادہ پُر اعتماد ہوتا ہے۔ اس اعتماد کی کیفیت اس گیس بھری بوتل سے مشابہ ہے جس کا کارک ابھی کھولا نہ گیا ہو۔ ساری کھڑ موس فقط احساسِ لذت سے بھری ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کا احساس، کسی کو شدت سے چاہنے کا احساس۔ سارا ماحول، موسم باتیں ایک پُر رزم سے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اچانک آنکھوں کے آگے ایک زوم لنز لگ جاتا ہے اور ہر چیز ہر لمحہ محبوب کی شکل اختیار کر کے کھٹ سے آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔

پہلے ہی دن جب میں کھانا کھائے بغیر میز سے اُٹھ آیا تو گلّو میرے کمرے میں آئی ۔ خدا جانے وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی کہ چھوٹی، بہرکیف قد ہم دونوں کا برابر تھا۔

"آپ کا کھانا یہاں لا دوں جی —— صاحب جی؟"

جس طرح کچھ لوگ مچھلی کھانے کے بعد دودھ پینے سے ڈرتے ہیں - میں اسی طرح اُس کی محبت سے آشنا ہو کر اُس کے وجود سے خوف کھانے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"خانساں مجھے ناراض ہو رہا ہے جی —— لا دوں جی کھانا؟"

میں نے احمق پن سے کاغذ کی کتابیں چھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے ——"

"وہ جی —— مجھے ناراض ہو رہا ہے جی خانساماں ——"

"اچھا لے آئیے ——"

گلّو کمرے میں آتی تو میں جونکیں جانور کی طرح اپنا سارا بوجھ پنجوں پر محسوس کرتا۔ وہ چلی جاتی تو میں دیر تک اُس خواہش کو دباتا رہتا جو مجھے اس کے پیچھے جانے پر اکساتی رہتی تھی۔ مری میں میری امی اپنی صحت کو درست کرنے کے لیے بہت جتن کر رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کے بل ادا کرنے، کیمسٹوں کی دو کانوں کے چکر کاٹنے اور اپنے نظام زندگی پر تاسف کرنے میں اُن کے دن بسر ہوتے تھے۔ میں سارا دن اُس قلمی آم کی طرح جو کھوس لپٹا پک جانے کی راہ دیکھ رہا ہو اندر ہی اندر میٹھے رس سے بھرا جا رہا تھا۔ میرا رنگ زرد اور میرے ہاتھ پیر

جلنے لگے تھے۔ اُس کی آہٹ پاکر ہمیشہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ میں اُس ایل پٹھے کی طرح تھا جو ابھی اصیل مرغے کی عمر کو نہ پہنچا ہو اور خواہ مخواہ لڑنے کی آرزو میں مرا جاتا ہو۔

یہ دن یہ راتیں عجیب طرح بسر ہوئیں۔

نویں جماعت کا پہلا عشق ـــــ مون سون بارش کا پہلا ریلا۔ نرگس کے ڈنٹھل میں اولین پھول میمنے کے منہ میں دودھ کی پہلی دھار ـــــ

گلّو بیرے کی بہن تھی۔ اُس کے میرے درمیان لامحدود فاصلے تھے اور سب سے بڑا فاصلہ اُس حجاب کا تھا جو قدرتی طور پر مرد میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ میں چپ چاپ دم سادھے بہانے بہانے اُس کی آنکھیں دیکھتا رہتا اور میرے منہ سے کبھی کوئی بات نہ نکلتی جیسے میں بندوق کی لبلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور بندوق داغنے کی ہمت نہ تھی۔

پھر اچانک ایک دن اس لبلبی پر بوجھ پڑ گیا ــــ آپی ـــ

میں امی کے کمرے میں کبھی نہ جاتا تھا۔ لیکن اس روز میں باتھ سالٹ لینے امی کے کمرے میں گیا تو میں دروازے میں کھڑا رہ گیا۔ گلّو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر گہرے سُرخ رنگ کی لپ سٹک تھی اور وہ اس وقت امی کی ایک لمبی سی مالا پہننے کے عمل میں تھی۔ یہ لمبی سفید مالا امی کبھی کبھار سلک کی فیروزی ساڑھی کے ساتھ پہنا کرتی تھیں۔ اس مالا کے نیچے بڑا سا فیروزی لاکٹ لٹکا کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ یوں گھبرائی جیسے جھاڑ بندر کھیلتے پکڑی گئی ہو۔ وہ دوپٹے سے لپ سٹک پونچھتی میری طرف بڑھ آئی "صاحب جی خدا کی

قسم جی ..... میں جی صرف دیکھ رہی تھی یہ ہار ..... خدا قسم جی میں نے بیگم صاحب کی کوئی چیز نہیں چرائی ۔ آپ کوارٹر چل کر دیکھ لیں جی ۔۔۔ آئیں جی میرے ساتھ .....“

میرے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا ۔ میں صرف اُس کے چہرے کو تک رہا تھا ۔ ہونٹوں سے اُتری ہوئی لپ اسٹک ۔ کو گھور رہا تھا اور وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی ۔ ”میں چور نہیں ہوں جی ۔ بھائی مجھے جان سے مار دے گا ..... میں چور نہیں ہوں صاحب جی ۔“

میں بجلی کے کھمبے سے لگا رہا تو وہ یکدم میرے پیروں میں بے بس جھکا کر بیٹھ گئی ۔ کھٹ سے فیروزے کا لاکٹ میرے بوٹ سے جا ٹکرایا اور اس کے دونوں ہاتھ میرے تسموں سے چپک گئے ”خدا کے لیے جی مجھے معاف کر دیں ..... میں جی ..... چور نہیں ہوں آپ کوارٹر میں جا کر دیکھ لیں ۔“

پتہ نہیں گلو مجھ سے عمر میں بڑی تھی کہ چھوٹی ، بہرکیف قد ہم دونوں کا برابر تھا ۔

جب میں نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر اُٹھایا تو میری انگلیوں کا بوجھ اس پہ اتنا ہلکا تھا جیسے وہ گلاس تلے اوندھی بیٹھی ہوئی تتلی تھی اور مجھے خوف تھا کہ اُسے چھوتے ہی اُس کے پروں کا رنگ میری انگلیوں پہ اتر آئے گا ۔

اُس کے سانس میں لونگ کی خوشبو تھی ۔

”مجھے معاف کر دیں میں چور نہیں ہوں جی ۔۔۔“

”یہ مالا تم اپنے گاؤں لے جانا ۔۔۔“

"میں جی ـــــ یہ مالا ـــ!" اُس نے مٹھی میں لاکٹ بھینچ لیا۔
اُس کا چہرہ حیرانی، خوشی "جا چھوٹا" قسم کے جذبات سے گلنار ہو گیا۔
"پکّی ـــ لے لوں میں ـــ"
"ہاں ـــ پکّی ہمیشہ کے لیے ـــ"
نقلی سفید موتیوں کو اپنی انگلیوں سے بوسے دیتی وہ بھاگ گئی اور میں وہیں کھڑا رہا۔
یہ میرا اور گلّو کا رومان تھا ـــ اسے میں نے اس لیے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تاکہ وہ الزام آپ کی سمجھ میں آسکے جو سارا نے مجھ پر لگایا۔
گلّو مجھے پھر نظر نہ آئی۔ شام کو اُس کا بھائی جاندار ڈیوٹی پر موجود تھا اور وہ واپس ہزارے جا چکی تھی۔
میرے دل کے آبنوسی فرش پر نو عمر کنواری کے پیروں کے نشان پڑ گئے اور پھر روز مرہ کی زندگی اسے گرم ہوا بن کر چاٹ گئی۔
میں اس واقعے سے کچھ ایسا محتاط، کچھ ایسا خود سر، کچھ ایسا اذیت پسند ہو گیا کہ پھر کبھی کسی لڑکی کے قریب ہونے یا کسی لڑکی کو اپنے قریب کرنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ یوں سایۂ زلفِ بتاں سے بھاگتا میں ـــ بزنس کی چار دیواری میں محبوس ہو گیا۔ دولت کو میرے والد نے جس دُخانی انجن کی سپیڈ سے جمع کرنا شروع کیا تھا میں نے اس کی رفتار میں راکٹ کی قوت سمو دی میں راجہ مایا داس بن گیا جس چیز کو ہاتھ لگاتا، سونے کی بن جاتی۔ میرے بلیو پرنٹ، میرے پلان، میری اسکیمیں کو دولت کی بد دعا لگ چکی تھی۔ میں گھاٹے کے سودے کرتا اور وہ چند سو چند

منافع کی صورت میں مجھ تک لوٹ آتے۔ خدا جانے میرے پاس کرناٹیکا کی وہ مشین کہاں سے آگئی تھی جو ہر لمحہ سونا اگلتی تھی۔ مارکو پولو کی طرح میری ہر سکیم کامیاب اور سونے میں تلتی تھی ۔۔۔ میں کامیابی کا سمبل، خوش بختی کا آئیڈیل اور ترقی کی معراج تھا۔

یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ممی ڈیڈی کی وفات کے بعد میں پہلی بار یورپ گیا۔

یہاں میری ملاقات سوئٹزرلینڈ کی پڑھی ہوئی سارا سے ہوئی ۔۔۔ سارا کا والد میرے مرحوم باپ کی طرح بہت امیر آدمی تھا۔ اور اُس نے سارا، اپنی اکلوتی بن ماں کی بیٹی کو بہت لاڈ سے پالا تھا۔ وہ اپنے نام کو ہمیشہ انگریزی میں لکھتی تھی اور ایچ کے ساتھ ختم کرتی تھی۔ جس طرح بائیبل میں حضرت اسحٰق کی بیوی کا نام لکھا ہوتا ہے۔

ہماری شادی کراچی کے ایک ایسے ہوٹل میں ہوئی تھی جس کی لفٹیں کھٹاکھٹ سات منزلیں چڑھتی اُترتی تھیں۔ ہماری شادی کراچی شہر کے لیے عرصہ تک ایک ٹاپک بنی رہی۔ ہماری شادی کی تصویریں مختلف فیشن ایبل رسالوں میں چھپیں اور ہم ہنی مون منانے مری چلے گئے۔

آسائش کے ہاٹ ہاؤس میں پلے ہوئے دو گنی پگ ۔۔۔

شادی کی پہلی رات جب میں ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو میری دلہن فرل وار نائیٹی پہنے پلنگ پہ اوندھی لیٹی تھی۔ کمرے سے ماؤتھ واش، سپرٹ، اور ایئر فریشنرز کی ملی جلی خوشبو آرہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے امی یاد آگئیں۔ آنکھ کی جھری سے اُس نے میری جانب دیکھ کر کہا ۔۔۔ "ایکس کیوز می ۔۔۔ میری عقل داڑھ نکل رہی ہے ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے ۔۔۔"

نہایت غیر رومانوی طریقے سے میں نے اُس کا منہ کھلوایا اور عقل داڑھ

کی پھولی ہوئی ہتھیلی ٹارچ کی روشنی میں دیکھی۔
یہ ساری رات سارا ہائے ہائے کرتی رہی اور میں اس کی تیمار داری میں مصروف رہا۔

ہنی مون شادی شدہ جوڑے پر معاشرے کا سب سے بڑا ظلم ہے۔ دو انسان جو راکٹ کی سی تیزی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہوں انہیں بار بار ٹکرانے کی ترغیب دینا شکست و ریخت کی داستان مرتب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ شروع شادی میں اٹھ چینیں شادی کو صیقل کرتی ہیں، مکمل آزادی سے اس مشک نافے کی خوشبو غائب ہو جاتی ہے — ایک طرح سے ہمارا ہنی مون بھی ہر ہنی مون کی طرح پہلے ہفتے میں ہی فیل ہو گیا اور ہم اسے وہ باکس آفس ہٹ نہ بنا سکے جس کی توقع لے کر ہم دونوں مری گئے تھے۔

مجھے سارا کی ہر بات سے اتفاق تھا اور خدا جانے وہ کیوں سمجھتی تھی کہ اعتراض نہ کر کے میں اُس کے ساتھ محبت کے فقدان کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہوں اسی لیے ہم نے محبت کرنے کا ایک ایسا اسلوب ایجاد کیا جس میں اذیت دینے اور اذیت سے حظ اُٹھانے کی قوت تھی۔ جونہی بن ماں کی اکلوتی سارا، باپ کی لاڈلی، دولت کی پروردہ یہ محسوس کرتی کہ میں اُس کی طرف متوجہ نہیں اور ہماری باتوں کا اسٹاک ختم ہو رہا ہے — وہ میرے پاس گریہ پائی سے آتی۔ اس کے جسم سے خاص کر اُس کی آستینوں کے قریب سے نیم کے کسیلے پتوں کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ اسی لیے اُسے ہر قسم کے (DEODORANTS) سے عشق تھا۔ وہ مجھ پر جھک کر انگریزی میں پوچھتی — " آپ کے خیالوں کے لیے ایک پینی — "

"میں چپ رہتا۔
ساری زندگی یورپ میں گزار آنے والی کنواری پوچھتی — "بتائیے ناں
کون یاد آرہا ہے —؟ بولیے —"
"کچھ بھی نہیں سارا۔"
میں نے گلّو کے بعد زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو قریب سے دیکھا تھا۔
جب میں نے سارا سے شادی کی تو یہ ایک بزنس مین کی شادی تھی لیکن رفتہ رفتہ
آہستہ آہستہ سب کچھ میں نے سارا کی تحویل میں دے دیا۔ لیکن سارا اُن لڑکیوں
میں سے تھی جو OCTOPUS کی طرح اپنے محبوب کو اپنی گرفت میں لے لینا
چاہتی ہیں جو آدم خور درخت کی طرح حیوانی لہو سے سیر نہیں ہو پاتیں۔ وہ میرے
اُن خیالات پر بھی پہرے بٹھانا چاہتی تھی جو نہاتے میں، دانت برش کرتے وقت،
جرابیں پہنتے ہوئے میرے دماغ پر بدلی بن کر چھا جاتے تھے۔
ہمیں وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی کوئی انسان آرزو کر سکتا ہے۔ ہمیں وہ
محبت بھی حاصل تھی جس کی تمنا میں لوگ گھل گھل کر مر جاتے ہیں۔ لیکن اس محبت میں
بھی خرابی کی اک صورت موجود تھی۔ اس محبت کو بھڑکانے کے لیے ہمیشہ اذیت
کی دیا سلائی روشن کرنا پڑتی۔ سارا کے ٹھنڈے سنگِ مرمر جیسے جسم کو انگارے
کی طرح دہکانے کے لیے مجھے ہمیشہ اُسے ذہنی طور پر اپنے آپ سے کمتر ثابت
کرنا پڑتا۔ اُسے ایسے دکھ عطا کرنے پڑتے جن پر وہ علیحدگی میں رو سکے جن کی
بدولت وہ اپنے آپ پر ترس کھا سکے، اپنے آپ کو بدنصیب سمجھ سکے۔
یہی ہمارا اسلوبِ محبت تھا جسے میں نے مجبوری کے تحت اختیار کر لیا

تھا کیونکہ سارا تک پہنچنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔

میرا جی چاہتا کہ میں کلاوہ بھر کر اُسے اپنی گود میں بٹھا لوں اور اُس کی ہنسلی کی ہڈی پہ اپنا گال رکھ کر ہمیشہ کے لیے منجمد ہو جاؤں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہم دونوں پتھر کے زمانے میں پہنچ جائیں اور "ڈانی نامورہ" جیسے ناپید جانوروں کی طرح، ہمارا شمار بھی ایسی نوع انسانی میں ہو جائے جس کا اب سراغ بھی نہیں ملتا۔ ہم دونوں دو سانگمی کی طرح جڑے ہوئے ناپید جانور —

لیکن سارا سلور فوکس کی طرح بے قرار رہتی تھی وہ کرکرسنیل کی طرح ہمیشہ آبدیدہ اور خوفزدہ رہ کر خوش رہ سکتی تھی۔

اُسے اپنے قریب لانے اور قریب تر رکھنے کے لیے میں نے اذیّت کا ایک ایسا باب کھول لیا جس کے انجام سے میں خود بھی بے خبر تھا۔

"بتائیے کیا سوچ رہے ہیں آپ — آپ کے خیالات کے لیے ایک پینی۔"

اُسے اپنے کندھے پر رلانے کے لیے میں اپنے سابقہ عشق کی کوئی من گھڑت داستان شروع کر دیتا۔ اس داستان کی حسینہ کے لیے مجھے ایسے ایسے الفاظ تلاش کرنے پڑتے، ایسی ایسی تشبیہیں، ایسے ایسے استعارے وضع کرنے پڑتے جن کو سن کر سارا کے کان جل اُٹھتے۔ میں اُس کے کان کی لو سے اپنے ہونٹ لگا کر کہتا۔ "وہ وینس کے مجسمے کی طرح سڈول تھی۔ اگر اُس کے کندھوں پہ چادر ڈال دی جاتی تو عرب عورتوں کی طرح یہ چادر صرف اُس کے سینے اور سر ہی کو چھوتی اور باقی جسم کے کسی حصّے کو نہ لگتی کیونکہ اُس کا سینہ اور

کو ٹھے اس کے جسم سے بہت دور نکلے ہوئے تھے "

سارا اب بلے پتلے جسم کی لڑکی تھی مجھے اُس کا دُبلا پتلا جسم پسند بھی تھا لیکن یہ بات سُن کر اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ دکھ کے ساتھ اپنے بازوؤں پر ہاتھ مل کر کہتی ــــ "اُس کے بعد۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ اس کے بعد تو۔۔ ۔۔۔۔ آپ کو میں بہت بُری لگتی ہوں گی ــــ ہے نا ــــ ؟"

میری جانب سے اب شدت کا اقرار ہوتا اور اُس کی جانب سے شدت کا انکسار۔ اسی شدت سے محبت کی شمع جل اٹھتی اور ہم والہانہ طور پر ایک دوسرے کی جانب بڑھتے۔ وہ میری پچھلی محبتوں کی تلافی کرنے کے لیے حسن کی دیوی بن جاتی اور میں اُس سے اٹل محبت قائم کرنے کے لیے دکھ دے دے کر اسے اپنے پاس لاتا۔

سارا کے آنسوؤں نے، اُس کی اذیت پسندی نے ایک رمبا سمبا ناچنے والی لڑکی کو بستر کی زینت بنا دیا۔ وہ پہروں لیٹی رہتی۔ خدا جانے ان لمحوں میں اُس کی نظروں کے سامنے وہ بیلے ڈانسر قسم کی قدآور عورتیں گھومتی رہتی تھیں جو مجھ سے عشق کر چکی تھیں یا وہ اپنی بدنصیبی اور محرومیوں پر آنسو بہایا کرتی تھی۔ بہر کیف یہ ہیجانی دور ہم دونوں کے لیے عجیب دور تھا۔

اپنے آپ پر ترس کھاتی سارا کا چہرہ مدقوق سا ہو چلا تھا۔ وہ یورپ میں رہنے کے باوجود کنوارے جسم اور کنوارے دل کی مالک تھی۔ اُسے کھو بیٹھنے کے خوف نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ایک طرف میں اُس کی محبت کو اکسیں مار مار کر اٹھاتا تھا اور دوسری جانب اُسے لیٹا دیکھ کر مجھے اتنی کوفت

ہوتی تھی کہ سارا سے مجھے بچے کی خواہش بھی باقی نہ رہی تھی۔ اسی تناؤ میں اسی کھینچا کھینچی میں فیملی پلاننگ کے ہفتے مناتے ہوئے ہماری شادی کو چار ماہ گذر گئے۔

ایک روز میں کالا شاہ کاکو سے واپس لوٹا تو سارا قالین پر اوندھی لیٹی تھی۔ قریب ہی امریکی رسالے بکھرے تھے۔

میں نے فائیلوں کو اُس کے پاس رکھا اور اُس کا چہرہ اپنی جانب موڑا۔ اُس نے جدید ترین فیشن کے تازہ تازہ بال سیٹ کروائے تھے اور اُس سے نیم کے پتوں کی کسیلی کسیلی خوشبو آرہی تھی۔

"تم پھر رو رہی ہو سارا ـــــ"

"کچھ نہیں" اُس نے چہرہ پونچھ کر کہا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے سارا ـــــ؟"

"کوئی تکلیف نہیں ـــــ کوئی تکلیف نہیں ـــــ" وہ انگریزی میں بولی۔ رونے چہرے پر مسکراہٹ نے دھوپ چھاؤں کا سا منظر پیدا کر دیا۔

"خوش تو ہوں ..... خوش تو ہوں لیکن ..... میرے ساتھ ..... کوئی اور بھی تو ہو اس گھر میں ..... میں سارا سارا دن ..... کھڑکی میں کھڑی چیلوں کے گھونسلے نہیں دیکھ سکتی ـــــ مجھ سے تو وہی خوش نصیب ہے ..... انڈے تو سینتی ہے چاہے دھوپ ہی میں بیٹھی رہے ....."

اس رات میں نے عجیب سا دکھ محسوس کیا۔ چیل کے گھونسلے کو تکتے رہنے کا دکھ۔ اسی احساس تلے پہلے میں نے سارا کو الیکٹرک کمبل میں لپیٹا۔ پھر اُس کے ٹھنڈے پیر اپنے سینے سے لگا کر اُسے گلو کے متعلق بتایا۔ اس رات سارا کی

آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ جھلملایا۔ وہ بہت بنی گلّو کا ذکر سنتی رہی اور پھر تکیے پر اوندھی لیٹ کر سو رہی۔ پہلی بار میری داستان کا ردِّ عمل اُلٹا پڑا۔ اُس پر وہ محبت کا شدید دورہ نہ پڑا، جو ایسی باتیں سننے کے بعد اُس پر پڑا کرتا تھا۔ وہ ساری رات جب بھی جاگتی بند بند سی آہ بھرتی اور پھر تکیے میں منہ دے دیتی۔

دو چار ماہ جب سارا گربھ وتی تھی، ہماری زندگی کے بہترین دن تھے۔ ہم دونوں آسائش کے پالنے میں پوڈل کتوں کی طرح سیر چشمی کے ساتھ ایک دوسرے پر تھوتھنیاں جمائے پڑے رہتے۔ وہ سارا دن چھوٹے چھوٹے پالنے، ننھی ننھی فراکیں، ڈونلڈ ڈک قسم کی کڑھائی کے کمبل چادریں، نیلی ارگنڈی سے مڑھے ہوئے کریب پلاسٹک کے ٹب، فلالین کے پوتڑے اور رنگ برنگے کھلونے خریدنے اور اُس بچے کا کمرہ سجانے میں مشغول رہتی جس کی آمد میں ابھی بہت دیر تھی۔ کٹے ہوئے بالوں والی سارا زندگی میں پہلی بار اس قدر بارونق زندگی بسر کر رہی تھی۔ بچے کے کمرے سے نکل کر وہ دن میں کئی بار وزن تولنے والی مشین پر چڑھ جاتی اور بار بار کہتی —— پچھلے ہفتے میرا وزن ایک سو سولہ پونڈ تھا۔ اب ایک سو ساڑھے سولہ پونڈ ہے۔ پورا آدھا پونڈ وزن بڑھا ہے بے بی کا —"

بچے کی کائنات میں کھو کر وہ میرے عشق کی داستانیں بھی بھول چکی تھی لیکن کبھی کبھی مجھے شک گزرتا کہ جب میں اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا ہوتا تو وہ آنکھوں کی جھری سے مجھے دیکھا کرتی ہے۔ ایسے جیسے جہاز میں سوار دُور ہوتے ہوئے جزیرے کو دیکھا کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک لمحے میں نے اُسے پکڑ لیا —— "تمہارے خیالات کے لیے ایک پینی ——"

"کچھ نہیں، میں دیکھ رہی تھی کہ تمہاری شیو بہت بڑھ گئی ہے ـــــ تمہیں دن میں تین مرتبہ شیو کرنا چاہیئے۔"

"سچ نہیں بولو گی مجھ سے تو میں تمہارے بے بی کو کبھی نہیں اُٹھاؤں گا۔"

وہ بے بی کا واسطہ درمیان میں برداشت نہ کر سکی۔ آہستہ سے اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہنے لگی ـــــ "پتہ نہیں گلّو کی باتیں سُن کر مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میرا تمہیں چاہنا ایک PUTILE EFFORT ہے ـــــ میں.... تمہاری زندگی میں ہمیشہ رنر اپ رہوں گی .... ایسا گھوڑا جو فرسٹ آنے والے گھوڑے کی گردن کے ساتھ پہنچتا ہے..... میں بڑی حاسد عورت ہوں ..... میں نے زندگی میں آج تک کوئی چیز کسی کے ساتھ SHARE نہیں کی....."

پھر ایک دم جیسے اپنے خیالات کو کسی پر ظاہر کر کے اُسے ندامت سی ہوئی۔ جھٹ انگریزی میں بولی ـــــ "لیکن اب تو میرا بے بی ہو گا ـــــ میں گلّو کی کیا پرواہ کرتی ہوں۔ اپنا بے بی تو میں کسی کے ساتھ SHARE نہیں کرونگی ـــــ کبھی نہیں ..... کبھی نہیں۔"

میں سکتے میں آ گیا۔ اس سارا سے میں ناواقف تھا۔ وہ تو بڑی بے ضرر قسم کی بوجھ نہ اُٹھا سکنے والی لڑکی تھی۔

اس واقعے کے باوجود میں سمجھ رہا تھا کہ ہماری شادی میں تخریب کا کوئی ٹائم بم چھپا ہوا نہیں ہے حالانکہ اندر ہی اندر فیوجی یاما پہاڑ میں لاوا جمع ہو رہا تھا۔

شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اگر ایک رات اچانک سارا کی طبیعت خراب نہ ہوجاتی۔

باہر بارش کے آثار تھے۔ سارا آتشدان کے پاس بیٹھی بے بی وول کے ساتھ ایک لمبوتری سی ٹوپی بُن رہی تھی پہلے وہ کروٹیں بدلتی رہی پھر نیم دراز ہوگئی اور جب اُس سے برداشت کرنا مشکل ہوگیا تو وہ لب کاٹنے اور مٹھیاں بھینچنے لگی۔

"کیسی طبیعت ہے سارا ——؟"

وہ خاموش رہی ——

"تم ٹھیک تو ہو سارا ——؟"

وہ آنسوؤں سے بہت قریب تھی۔

"میں ڈاکٹر کو بلاؤں ——؟"

میری باتوں کا جواب دیئے بغیر وہ چپ چاپ کمرے سے چلی گئی۔ جب میں اُس کے تعاقب میں تھوڑی دیر بعد اُس کے کمرے میں پہنچا تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ درست کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے پرس اٹھایا اور آہستہ سے بولی —— "کار نکالیے —— مجھے ہسپتال جانا ہے ——"

اتنی سرخ لپ اسٹک اور ایسی بھڑکیلی سرخی کے باوجود اُس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

"سارا ——!"

"جلدی چلیے - میں اور میرا بچہ ...... ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے ہیں ـــ"

میں اُسے بازوؤں میں لے کر بولا ـــ "اچھا ہی ہے سارا ـــ تمہارے ہاں کبھی بچہ نہیں ہونا چاہیے ...... کبھی نہیں .... کبھی نہیں ..... میں تمہیں کسی کے ساتھ SHARE نہیں کر سکتا ـــ"

اسقاطِ حمل کے دوسرے دن جب ابھی اس کا چہرہ ANESTHEGIA کے اثرات نلے تھا، ہم دونوں ملاقاتیوں کے اوقات میں ملے - ہم دونوں خاموش تھے - بڑی دیر خاموشی طاری رہی - پھر وہ آہستہ سے بولی ـــ "آپ کو ڈاکٹر نے بتا دیا ـــ؟"

"ہاں ـــ"

"پھر؟ ـــ"

"پھر کیا ـــ کچھ نہیں ـــ"

وہ آہستہ آہستہ رونے لگی ـــ "ڈاکٹر کم از کم دو چار دن ٹھہر کر مجھے بتا سکتا تھا - میں .... پتہ نہیں تعلیم یافتہ امیر لڑکی کو لوگ اس قدر پتھر دل کیوں سمجھتے ہیں ...... یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ شاید .... وہ بھی اَن پڑھ جاہل عورت کی طرح ADJUST ہونے کے لیے وقت چاہتی ہے ـــ"

"سارا ـــ مجھے بچہ نہیں چاہیئے ـــ امیر گھرانے میں بچہ ہمیشہ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے - اُسے عجیب عجیب COMPLEXES ہو جاتے ہیں -

وہ خاموش ہو گئی۔

سپرٹ کی خوشبو سے بوجھل بڑی لمبی خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ مسکرا کر بولی

— "آپ کو گلو یاد آ رہی ہے ناں؟ —— وہ صحتمند لڑکی تھی ناں"

ہسپتال سے واپس آ کر سارا کراچی چلی گئی۔ اُس کی صحت اتنی گر چکی تھی کہ ڈاکٹروں کے مشوروں کے پیش نظر میں مدافعت نہ کر سکا۔ سارا کے جانے کے قریباً دو ہفتے بعد مجھے سارا کا خط ملا۔ اُس میں اُس کے وکیل کا خط بھی ملفوف تھا۔ جس میں خُلع کے جملہ کوائف اور شرائط لکھی ہوئی تھیں۔ سارا کے خط میں مرقوم تھا:

"میں آزادی چاہتی ہوں کیسی بانجھ عورت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک بار اور مرد کے ساتھ اپنی زندگی گزارے"

اس کے بعد میں نے مصالحت کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سُود۔ وہ مجھ سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ وہ میرے خطوں کا جواب نہ دیتی تھی۔ صرف اُس کا وکیل نہایت پابندی کے ساتھ میرے پاس پہنچ جاتا تھا۔

طلاق وصول کرنے کے بعد مجھے جو خط سارا سے ملا اُس میں لکھا تھا:

"آپ کے پاس گلو ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ لے بی کے وہ کپڑے جنہیں وہ پہن نہ سکا۔ خدا جانتا ہے میں نے آپ کے سب AFFAIRS سُنے اور کبھی ایک دن بھی مجھے اُن عورتوں پر رشک نہ آیا۔ اُلٹا میں نے اُن پر ترس کھایا —— لیکن گلو کے وجود کے ساتھ میں صلح نہیں کر سکتی وہ اور میں ایک ہی گھر میں نہیں رہ سکتے —— اُس کے ہوتے ہوئے میں محروم رہوں گی —— سارا"

میری زندگی میں صرف ایک عورت آئی اور بانجھ ہو کر چلی گئی ۔

یہ جنگ کے دنوں کا ذکر ہے ۔ میں ان دنوں کراچی میں ایک بہت بڑے ہوٹل میں مقیم تھا ۔ بزنس جنگ کی وجہ سے کچھ معلق سا ہو چکا تھا ۔ سارے شہر پر ایک جذبہ ایک ولولہ طاری تھا ۔ اخبار اور ریڈیو کے علاوہ اور کسی چیز سے تسلی نہ ہوتی تھی ۔ میں سارا دن کمرے میں مقید رہتا اور سوچتا رہتا کہ کاش کوئی بم اس ہوٹل پر گرے اور میں اُس تنہائی سے چھٹکارا پالوں جو ہر لمحے مجھے شکنجے میں کستی رہتی ہے گیارہ ستمبر کی رات کو پچھلے پہر میرے فون کی گھنٹی بجی کسی نے مدھم سی آواز میں کہا ۔ "کیا آپ کمرہ نمبر گیارہ میں آ سکتے ہیں ۔۔۔"

"گیارہ ۔۔۔؟"

"جی ایک ایک اور دو گیارہ ۔۔۔ والا گیارہ ۔۔۔"

مجھے جرائم سے پُر ، وہ امریکن فلمیں یاد آ گئیں جو میں ہمیشہ شوق سے دیکھتا تھا ۔ وہ جاسوسی ناول نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے جن میں قتل و غارت کا باب کھلا رہتا ہے ۔ جنگ کا زمانہ تھا ۔ جی میں سوچا زندگی کا تو ویسے ہی کچھ بھروسا نہیں کم از کم مرنے سے پہلے ایک ADVENTURE سے مجھے بھی دو چار ہونا چاہیئے ۔

تین بار کمرے پر دستک دینے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ اندر ضرور کوئی قتل کا واقعہ ہو چکا ہے تو میں نے لوٹ جانے کے لیے قدم موڑے ۔ سلفٹ تک پہنچنے کے بعد خدا جانے کیوں میں لوٹ گیا اور بغیر دستک دیئے میں نے ایک طاقا کھول دیا ۔

اندر سارا ڈبل بیڈ پر آڑے رُخ لیٹی ہوئی تھی اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میری نبض تیز تیز چلنے لگی۔

"سارا ـــــ"

"ہوں ـــ"

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں ـــ"

"میں نے تمہیں لفٹ سے اُترتے دیکھا تھا ـــ کل شام ـــ" وہ اُسی طرح لیٹی رہی۔

کمرے میں اتنی ساری خوشبوؤں کے باوجود کڑوے نیم کے پتے تیر رہے تھے۔

"تمہاری نئی شادی کیسی رہی ـــ؟"

"so ـــ so ـــ" وہ آہستہ سے بولی۔

"تمہارے میاں کہاں ہیں؟"

سوئٹزرلینڈ گئے ہیں کسی بینک سے گفت وشنید کرنے ـــ"

"اچھا ـــــ میرو ـــ"

"اگر جنگ نے کوئی مثبت صورت اختیار نہ کی اور .... ہمارا اثاثہ پاکستان میں بلاک ہو گیا تو اُن کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

"تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ میرا تو سب کچھ پاکستان میں ہے اور میں تو اپنا بینک بیلنس کہیں تبدیل نہیں کرانا چاہتا ـــ"

اُس کی نگاہوں میں بڑی شوخ سی دعوت تھی۔

مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے ـــ"

اُس کے چہرے کو دیکھ کر خدا جانے کیوں ایک دبی سی سسکی میرے سینے میں اُٹھی۔ میں اُس پر جھک گیا اور اُسے چھوئے بغیر بولا "تمہیں معلوم ہے سارا کہ...... نہ تم سے پہلے اور نہ تمہارے بعد...... میری زندگی میں.... میں نے کبھی کسی عورت کو چھو کر نہیں دیکھا — اور تم جانتی ہو اس کی وجہ کیا تھی؟"

"نہیں —"

"جب دنیا کی ہر نعمت مجھے بلا قیمت مل گئی تو میں نے خود اپنے آپ کو محروم کر لیا، کوئی انسان احساسِ محرومی کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ احساس خوشی سے زیادہ ضروری ہے۔"

اُس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔

"مجھے تمہارے سوا اور کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی بدقسمتی سے —"

"اور گلّو......؟"

"وہ تو تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔ زندگی کا اوّلین احساس تھی۔"

وہ امریکن ایکٹرسوں کی طرح ٹانگوں کو بل دے کر بیٹھ گئی۔

"اگر ایک مینی دو تو میں تمہیں بتاؤں کہ اِس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

اُس نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"میرا ایمان اتنا مضبوط نہیں کہ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے سے اجتناب کر سکے۔ میں پروہت کے بنائے ہوئے قانون کا بھی ایسا احترام نہیں کرتا کہ ایک معمولی طلاق نامے کو اہمیت دے سکوں ——"

سارا کا سینہ احساسِ گناہ کی لذت سے تن گیا۔

"کبھی کبھی تنہائی میں میں سوچتا تھا کہ اگر سارا مجھے ملی، اگر وہ کسی دوسرے کی بیوی بن کر مجھے ملی تو کیا اُس کا جسم میرے لیے اجنبی ہو سکے گا۔ کیا میری نگاہیں کپڑوں کے آر پار نہ دیکھ سکیں گی۔ کیا ہماری نگاہیں اُس خلوت کی غمازی نہ کریں گی جو ہم دونوں کے درمیان ایک بوسے کی طرح شیریں رہی ہے ——"

سارا کانپنے لگی —

"کیا ہم ایک دوسرے کے لیے کبھی بھی اجنبی ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے، نہیں پہچانتے ——؟" وہ خاموش رہی۔ "میں نے صدیوں کی تنہائی کاٹی ہے اور تم نے سارا مجھے باعصمت ہونے کا کیا صلہ دیا۔ میں جانتا ہوں تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ تم احساسِ گناہ پیدا کرنا چاہتی ہو۔ جب تک تمہیں کوئی غم اندر ہی اندر زخمی نہ کرتا رہے تم خوش نہ رہ سکوگی۔"

اُس نے نظریں جھکا لیں۔

"تم اور میں ..... اور ہمارے جیسے سب امیر آدمی ..... ہم من وسلویٰ کھاتے کھاتے تنگ آ چکے ہیں۔ ہمیں خوش رہنے کے لیے غم چاہیئے۔ لیکن یہ غم بھی ہمارا خود ساختہ ہونا چاہیے۔ اس پر ہمارے ذاتی کارخانے، ہمارے اپنے مل کی مہر ہونی چاہیئے —— امیر آدمی SELF - PITY کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ..... اتنی ساری آرائشیں، اتنی ساری راحتوں کا ایک ہی جواز ہے ...

SELF - PITY -"

سارا اُکھڑ اُکھڑ سی ہو گئی۔

"تم پاکباز اور باحیا عورت ہو ..... لیکن خوش رہنے کے لیے ایک دکھ

پالنا چاہتی ہو۔ احساسِ گناہ کا دکھ ۔"

یکدم میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا ۔ "اور میں تمہیں خوش نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ جو دکھ میں نے اپنے لیے وضع کیا ہے اُس کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنا صحیح دکھ کبھی تلاش نہ کر سکو۔ تم بھٹکتی رہو غموں کی تلاش میں اور غموں سے گریزاں رہیں ۔"

وہ دروازے کے سامنے بازو پھیلا کر کھڑی ہو گئی ۔ "مت جاؤ.... مجھے ڈر لگتا ہے ۔"

" مجھے جانے دو سارا ۔ مجھے بھی جینے کا حق پہنچتا ہے ۔ میں بھی تمہاری طرح امیر آدمی ہوں، مجھے بھی اپنا خود ساختہ دکھ چاہیے ۔"

اُس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے ۔

" میں بھی دکھ کا پیراہن تو تا پالنا چاہتا ہوں۔ میں بھی احساسِ شکست اور احساسِ محرومی کی تلاش میں ہوں۔ میں بھی اپنے فرصت کے لمحوں میں اپنی خوشیوں کے بازو گودگود کر اُن میں پچھتاوے کا سرمہ بھرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہوئے سوچا کروں ۔ سب کچھ مجھ سے بالشت بھر دور تھا میں ہاتھ بڑھاتا تو سب کچھ میری گرفت میں ہوتا۔ میں امیر آدمی ہونے کے باوجود باحیا اور باعصمت آدمی تھا ..... کیسی دکھ کی بات ..... تم مجھ سے میرا دکھ کیوں چھیننا چاہتی ہو ۔ ؟ بھلا دکھ کے بغیر خوشی کا احساس کیوں کر رہے، بھلا دکھ کے بغیر زندگی کا احساس کیوں کر ہو؟"

اپنی متروکہ بیوی کے عشق کو رومال والی جیب میں عین سینے کے اوپر رکھ کر

میں باہر نکل آیا۔ اب مجھے موت کی خواہش نہ رہی تھی۔
وہ دیر تک مجھے کاریڈور میں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔
پہلی بار اُس کے چہرے پر آنسوؤں کے باوجود خوشی چھائی تھی ——
وہ جینے کا قرینہ سیکھ چکی تھی ——

("فنون" لاہور)

خان فضل الرحمٰن

گوری گوری۔ گوری گوری

(۱)

جھڑ بوندی کے دن کل ہی ختم ہوئے تھے کیونکہ مہاوٹیں کھل کر برس چکی تھیں۔ اب اُوپر آسمان کی طرف، جدھر بھی دیکھو، نیل ہی نیل پھیلا ہوا تھا۔

ایکھ کی نوبین بتاؤ آنے پر مزید تیار کی جانے والی تھی۔ تارکھول کی لمبی سڑک کے اُتر میں کوئی نصف میل کے فاصلے پر موروں والی گاؤں تھا جہاں پکتے گڑ کی خوشبو پھیل رہی تھی اور بیل کے دھونلے سے دھوُاں تھمک تھمک نکل رہا تھا۔ یہاں ڈنگوار میں نصیبو چوہان کی باری آئی ہوئی تھی۔

نصیبو چوہان اتنا عاقل تھا کہ اس نے اپنا جھوک مہاوٹوں میں آلا نہیں ہونے دیا تھا۔ تو اسی سبب گڑ کی پکائی بھی جھڑ بوندی ختم ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ تارکھول کی لمبی سڑک کے اُتر اور دکھن میں جو سوا نے کا سوانا لمبی بالوں والے گیہوں سے بھرا کھڑا تھا جن میں سے ہر ایک میں پچھتر بڑے بڑے دانے تھے، اس کے رواج دینے کی ابتدا بھی نصیبو چوہان نے ہی کی تھی۔ آج مہاوٹیں کھلنے کے بعد ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں ان لمبی لمبی، بڑے بڑے شربتی دانوں والی بالوں کے ہلنے اور ملنے جلنے سے جو خوشگوار سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی وہ چھوٹی بالوں کے ہلنے اور ملنے جلنے سے کبھی نہ پیدا ہو سکتی۔

نصیبو چوہان ہی موروں والی میں وہ تنہا کسان تھا جس کے اُپلے نہ تھپتے تھے اور وہ گوبر کو بطور کھاد استعمال کرتا تھا۔ بڑگاؤں میں جو مویشیوں کی نمائش ہوئی تو اس میں اسی کے بچھڑے اور بھینس نے انعام پائے تھے۔

لیکن باوجود اتنا چاتر ہونے کے وہ اپنی ہنسوکرٹ، ہمیشہ لٹک کر چلنے والی، کتاب رو، بھری جوانی والی لڑکی حندو کو قابو میں نہ رکھ سکا تھا۔ پچھلی برسات میں جب پانی چڑھے ہوئے تھے، باغوں میں ٹپکے کے آموں کی گدگداہو رہی تھی اور گاؤں میں زیادہ بر کھا سے جنگی پرنالوں کی دھاریں دور دور پڑ رہی تھیں، شاخ بید ایسی لچکیلی اور کبری کی بجلی ایسے پھسلتے سفید گھیا پنڈے والی حورو پٹرول پمپ کے سلونے لٹو سیے بابو کے پاس ڈرائنی اور بھوزانی رات میں گولی پینے کے لیے جوتیاں ہاتھوں میں لیے، کپڑے بھگوئے آکر نگاہ لڑاتے ہوئے کہنے لگی تھی :

”ارے صمد، میں تو تگڑی نگوڑی پانی ماں سے نکل کے آئی ہوں۔ گولی لگتے اتیں آپ سوکھی سوکھی کوٹھڑی ماں کیسی ترال کی جگہ گیس کی لالٹین بالے سو رہا ہے۔ بتا کھنوئے جانے میں کہاں سوؤں ؟“

”گولی لگتی ! تیرے واسطے تو میرے دل کی چندن کھڑکیا کھلی ہوئی ہے، چاہے جہاں آن بیٹھ۔“ صمد نے اسے جواب دیا تھا۔

”ارے میں تو تیرے صدکرڑے جانیاں، میں تو سوعن آئی ہوں، بیٹھن نہیں آئی ہے۔“

”تو پھر سو بھی جانا، پہلے کپڑے تو دوسرے پہن لے۔ یہ کیا کہہ رہی تھی، میں تیرے صدقے جانیاں ؟“

"وا جو پنجابی مہارے گھر کے لوے ٹکے ہوئے ہیں، جنھوں نے بہار باگ کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے، ان کی چھوکریاں اودیا کے یہی گیت گایا کریں ہیں۔"

"تو تجھے یہ بول اچھے لگے؟"

"بہت اچھے، جدھی تو یاد بھی کر لیے۔"

جب حمیدو بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر صمد کا تہبند اور سینڈو فیشن بنیان پہننے لگی تو صمد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "تنیک تولیے سے پنڈا خشک کر لینے دے، پھر پہننا۔ اور تو نے یہ کیسری کے رنگ ایسی کرتی تو اتار پھینکی، ست خصمی انگیا میں اتار ڈالوں۔"

"ارے گدار یو کون سی آلی ہے۔"

"آلی نہ ہو پر اس میں آل تو ضرور ہے۔"

"ارے بدنیت! مجھے اتنی ادھیں نہ جان، میں تو سمجھوں تھی تیں ہانسی کر رہا ہے۔ یہ کھبے سجے ہاتھ آگے تو نہ لپکا، نئیں تو تیری میری ٹھن جائے گی۔"

"تیری میری تو روز ہی ٹھنتی رہتی ہے۔"

"ارے میری منسا اس طروں ٹھنتے کی نئیں۔ تیری میری لام باجی (لام بازی) ہو جاگی۔ جھگڑا، رادا، جنگ، کلیں، بلوہ، پھوجداری۔ اپنے یار کے منہ پہ کاٹ کے چکتا ڈال دوں گی۔"

"چاہے تیرے ساتھ پانی پت کی تین لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں ہیں جب بھی نہیں مانوں گا۔"

اب حمیدو کی لیچی کی گٹھلی کے ہم رنگ تیلیوں والی آنکھیں لطف، مزے اور

ادھنتا میں آکر ہنر کے اس پانی کی طرح جھلمل کرنے لگیں جیسے چودھویں کے چاند نے
چاندی بنا کر رکھا ہو۔ پھر وہ صلابت کیسے دکھاتی۔
لبے لباس میں وہ گھڑ چڑھی اور تڑاک پڑاک سی، لقمہ تر معلوم ہوتی تھی۔ گھڑ
چڑھی وہ اس لیے معلوم ہوتی تھی کہ قدیم قزاقستان کے گھڑ چڑھوں کی طرح
اس کا کمر سے نچلا جسم بہ نسبت بالائی حصے کے زیادہ تنومند تھا۔ رانیں
اور پنڈلیاں قد سے زائد بھاری بھاری، قصائی کے بتّے کی مانند چکاراسی تھیں۔
قدیم قزاقستان کے گھڑ چڑھوں کا یہ حصۂ جسم اس لیے تنومند ہو جاتا تھا کہ بچپنے
سے اسپ سواری میں مشغول ہو جاتے کے سبب زیادہ مشق اور مشقت میں رانیں
اور پنڈلیاں ہی آتی تھیں۔ حوروکو حسنِ زریں قدرت نے بلا مشق و مشقت ہی عنایت
کر دیا تھا۔ اس کی رانیں ضرورت سے کچھ زیادہ لمبی، توانا اور بھری بھری دکھائی دیتی
تھیں، کمر اور پیٹ منحنی اور لاغر سے۔ یہ جانکاری صرف صمد کو ہی تھی، ورنہ اس
کی لوچ دیکھ کر ہر ایک اسے ابلا پری کہتا۔ وہ کم عمر تھی، لیکن الہڑ۔ اس کے
منہ پر چڑھتی جوانی کے دو مہاسے بھی نکلے ہوئے تھے اور اس کی یہی چڑھتی
جوانی اس کی گات سے ٹسی پڑتی تھی۔ اس کی باہوں میں کانچ کی چار چار، پانچ پانچ
سیاہ چوڑیاں تھیں۔ ناک میں سونے کی کرکی دار نتھ، جس کا قطر ایک سوا انچ ہوگا۔
حورو کا چہرہ رنگت میں اس کے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے بدن کے مقابل
بیٹھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے لوؤں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس کے ڈھکے
ہوئے بدن میں افرنگی سفیدی تھی اور اس میں افرنگی خون موجود تھا۔
جب صمد اس لڑکی پر تولیہ پھیرنے لگا تو کبری کی بجلی ایسے پھسلنے سفید پنڈے

کی تاب نہ لا کر گیس کی خوب جلتی ہوئی لالٹین کچھ مدھم پڑ کر ٹمٹمانے سی لگی تھی۔ صمد نے اس کی رانوں اور پنڈلیوں کو تولیے سے خشک کرنے پر ہی بس نہ کی تھی۔ وہ تو بلا ضرورت انہیں گویا ہلکے ہلکے سہلا رہا تھا اور حورو لطف لے رہی تھی۔ لیکن جب دیر ہوتی گئی تو اس نے کہا: "پانی تو سوکھ گیا اب کھوٹے جانے کھوں سکھانا چاہے ہے، بے بوسے۔"

پھر وہ دُھلا ہوا صاف نہبند اور سینڈ و فیشن بنیان پہن کے چوخانہ کمبل میں اس طرح سے آدبکی جیسے کوئی نئی نئی جوانی میں آئی ہوئی کنیا گھاٹ پر نہانے جائے اور کسی شہدے کو کھڑا دیکھ کر اچانک کپڑے اتارے بغیر ہی پانی میں کود پڑے۔ حورو نے کمبل اس طرح سے لپیٹا ہوا تھا جیسے اسے تپ لرزہ چڑھ رہا ہو اور وہ "ہوں ہوں" کرتی ہوئی کانپ رہی تھی۔ یہ سب یار کو لبھانے کے لیے تھا۔

حورو نے واقعی یار کو اتنا لبھا لیا تھا کہ باہر پیٹرول پمپ پہ ایک بیخینی کار ہارن پہ ہارن دے رہی تھی کہ کوئی آ کر ٹنکی بھر دے لیکن صمد ہمان کو اتنی دیر کے لیے بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ پھر کار کے مالک نے، جو پیٹرول پمپ کا بھی مالک تھا، کوٹھڑی کے دروازے پر دھم دھم کی تو چاتر باپ کی چاتر، طبیعت دار اور چونکیل لڑکی نے ایک دم سے اُٹھ کر گیس کی لالٹین بجھا دی۔ صمد اسی کی نقل میں "ہوں ہوں" کرتا ہوا باہر نکلا تو مالک کی آواز آئی: "صمد تجھے کیا ہوا؟"

"میاں صاحب جاڑے سے بخار چڑھا ہوا ہے۔"

"تو پھر کیوں باہر کیوں نکل آیا، کچھ اوڑھ لے؟"

وہ اندر گیا اور حدود کے اُوپر سے اپنا چوخانہ کمبل اُتارنے کی کوشش کی لیکن اس مسخری ہائی نے کمبل کو اپنے اُوپر ایسا تان رکھا تھا کہ اُسے چھوڑتی ہی نہ تھی۔ مالک نے پکارا: "کیوں کوئی کپڑا نہیں ملتا؟"

"میاں صاحب اندھیرا جو ہے۔"

"گیس کی لالٹین کیا ہوئی؟"

"بجھ گئی تھی، اور مجھے ہوش نہیں تھے کہ پھر جلاتا۔"

صمد نے کار کی ٹنکی پیٹرول سے بھری تو ترشح ہو رہا تھا۔ ویسے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا لیکن آموں کے باغوں میں لالٹینیں اس طرح سے پھرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں جیسے شہابیے پھر رہے ہوں۔ پیٹرول پمپ کے ذرا شمال میں واقع آل جنجال جنگل تاروں بھری رات کو مات کر رہا تھا کیونکہ وہاں بے انت جگنو پتنگوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ آل جنجال کے مغرب میں مولسری کے درختوں کا کنج تھا جس کے چوگردہ کانٹے دار باڑ پر کندوری کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مولسری کے پھولوں کی سباس دور دور تک پھیل رہی تھی۔ مغلوں کی بنائی ہوئی اچھی سے اچھی بارہ دری میں ساون کی ایسی ٹھنڈی ہوا نہ لگتی ہو گی جیسی یہاں۔

اُدھر تو مالک کی کار نے مغرب کی طرف شہر کا رخ کیا، جو یہاں سے پچیس میل ہوگا، اور ادھر صمد نے جا کر کوٹھڑی کھولی۔ اب یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پشت پھیرے ہوئے چپل میں دُہوں ہوں، کر رہے تھے، گویا دونوں ہی کو تپ لرزہ چڑھا ہوا تھا اور سخت سردی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد پیٹرو کی آنچ سے مجبور ہو کر حور دہ نے ہمکتے ہوئے منہ صمد کی طرف پھیر لیا اور کہا: "میری کمر تو

پیر ٹلٹے رہی ہے۔"

"منہ اسی لیے دوسری طرف پھیرا ہوا تھا؟"

"تیں ناں داب دیتا تو ہاتھ ٹوٹ جاتے؟"

"پرلی کروٹ لے لے داب دوں گا۔"

"واکروٹ تو تھک گئی۔ ارے میں تو تیرے سے ملتا چھوٹن والی ہوں پردیسی بلموا کی آس کیا، آج نہیں تو کل گیا۔"

"تو اسی واسطے ملن سمے کو نہ بوجھے رکھ اور جتنی مرادیں اس سے اینچی ہوں اینچ لے۔ بڑھا کا کروپ ڈاکو ڈھاکہ میں دبکی لگائے بیٹھا ہے، کیا خبر کب خوشیوں کی ڈھونڈی پٹھادے۔"

"چپ رہ، چپ رہ۔ میری گردن مروڑ دے پر ایسی باتاں نہ کر۔"

پھر نوشا نوشی کا دور شروع ہو گیا۔

وہ ایک دوسرے کے جسم سے گرمی، لطف اور آسائش حاصل کرنے کو ایک دوسرے کی اس طرح سے اکوار بھر رہے تھے جیسے ایک دوسرے میں سرایت ہی تو کر جائیں گے۔ رات بھر کمبل تو ایک تھا پر اس میں جی دو تھے۔ اور تمام رات ہی بجلی کی چمک، بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بوندا باندی کے ساتھ ساون کی گدلی گدلی اور ستم گر ہوا چلتی رہی تھی۔ صمد جو ساکھے پہ ساکھا اور خنجر پیوستی کر رہا تھا تو بعض دفعہ جورو کہہ رہی تھی: "ارے جھلّے نسے باجوں (نشے بازوں) کی طرح کیا چسکیاں لگا رہا ہے؟" پردے میں لڑکیاں دھوریا ملار کا لہرا لگا رہی

تھیں ادھ مان کے تازہ تازہ گملوں سے نکلے ہوئے بوٹوں کو ٹھنڈی پون کا ہر ایک جھکورا اڑے سے جاؤ کے ساتھ اپنے میں رمائے لیے آ رہا تھا۔ ساتھ کے ساتھ مولسری کے پھولوں کی سباس بھی آ رہی تھی۔

(۲)

صبح کے وقت جب باغوں کی رانی کوئل کوکی تو گھم گھیری میں انیندی انیندی آنکھوں کو پوری طرح سے کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے حورو بولی: "ارے اب تیں مجھے کہاں ٹکا دے گا۔ اس تیرے کٹھگر ماں تو بڑا چاند نا ہوا جا رہا ہے۔"

"تو تیری مرضی یہ تھی کہ سورج بھی نہ نکلے۔"

"نکلے تو نلے نلے دکھن ماں میلوں پھیلے ہوئے کالے آموں کے باگوں (باغوں) کی آڑ لیتا ہوا چلا جاوے۔"

آخری فقرے کے آخری بول ابھی حورو کے چھوٹے سے منہ میں ہی تھے کہ اس کا باپ نصیبو چوہان، جو جیل خانے کے داروغے ایسا تھا، ٹانگی لیے ہوئے داخل ہوا۔ حورو نے اس کی جلّادانہ صورت دیکھتے ہی چیخ ماری: "ہائے!" نصیبو چوہان اس پہ ٹانگی چلانے کو ہوا تو حورو کمبل سمیت پچھلی اُتری کھڑکی میں سے کود کر ہاتھی سونڈے سے چھپا ہوا کھیت عبور کر کے آل جنجال میں جا لگی، جو آڑ کباڑ درختوں، جھاڑیوں اور بیلوں کا چھوٹا سا ایک مربع میل گھنا جنگل تھا۔ جب یہ شہسواروں ایسے نچلے بدن والی اپنے مٹھی بند ہاتھ ست خصمی انگیا تک اُٹھائے کولا مارتی ہوئی کتر داں چال سے بھاگی تو بہت سے مور بھی حرصا حرصی میں بھاگنے لگے۔

جس اڈا ہے میں جورو داخل ہوئی تھی برسات کے دنوں اس میں گھستے ہوئے سبھی ڈرتے تھے کیونکہ یہاں بھیڑوں، تتیتوں ایسے موزیوں کے چھتے تھے اور ہر وقت ان کی بھیں بھیں ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ اومڑی کا پیچھا کرتے ہوئے دو شکاری کتے اس میں چلے گئے تھے تو وہ تلملاتے ہوئے نکلے اور تھوڑی دور جا کر ڈھیر ہو گئے۔ اسی طرح سے عرصہ ہوا فقیریا ڈاکو جمنا پار یا جب موروں والی پر حملہ آور ہوا تو کرنل فورٹ اور بیگم فورٹ مولسری گنج میں ساون کے مزے لے رہے تھے۔ کرنل نے جو یہ گاگا سنا تو پیدل پلٹن کے درجن بھر رائفل بردار گوروں پر ہوّے میں بھیجے اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر ٹڈا بھیڑ پہنچا۔ گورے اس وقت آئے جب ان کے افسر کو ناکہ بندی کرنے والے کسی ڈاکو نے کمین گاہ سے گولی مار کر ختم کر دیا تھا۔ گورا فوج کی ان دنوں بڑی دھاک تھی اس لیے ڈاکو بھاگ کر آل جنجال میں جا چھپتے۔ پھر ایک بٹالین نے جنگل کا گھیرا ڈال لیا اور جو بھیڑوں تتیتوں کھایا ڈاکو باہر نکلتا گورے اسے سنگینوں سے قیمہ بنا ڈالتے۔ فقیریا اندر ہی ٹھیرا رہا اور ڈنکوں کی تاب نہ لا کر آل جنجال میں ہی مر گیا۔

کرنل کی وفات کے بعد بیگم فورٹ گنج میں ہی ٹھیری رہی، یہاں تک کہ اس نے نصیبو جوہاں کے کسی بزرگ سے پول پڑھا لیا۔

تو انسانی جانوں کے لیے اڈا ہے میں بہت ہی خطرے تھے۔ لیکن نصیبو جوہاں پھر بھی اندر داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر میں باہر آ گیا کیونکہ اسے واقعی بھیڑیں اور تتیے لپٹے ہوئے تھے۔ جب جورو کا باپ عاجز آ کر منہ ڈنکوں سے سجائے لیکن جھگیا بابا ہوا پرو ہے کی طرف چلا تو وہ ابھی گوتارہ میں ہی تھا کہ مغرب میں

بھنی ہوئی برساتی ندی کے کنارے ڈنگر چرانے کے لیے گوہر میں سے آتے ہوئے لڑکے اسے دیکھ کر کھلی باڑی میں جکڑ یا مچانے لگے: "ہو رورا، ہو رورا، ہو رورا۔"

اس وقت گاؤں کے ہرے ہرے سوانے پر گھمبیر اور ٹپکاؤ گھٹائیں چوکھونٹ چھائی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں سنی ایسے زرد پھولوں والی پتوار، کہیں لال یا زرد گل عباس، کہیں باتیسے کے سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ امربوں میں کوئلیں کوک رہی تھیں۔ بہت سے بے چین سا کھے خور اور کھلاڑ پرندے مولسری کے کنج میں جنگ زرگری کا پورا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اتنا غدر مچایا ہوا تھا جیسے اس سر پھٹول میں سبھی لہولہان ہو گئے ہوں اور اس پروے کے وہ ہزاروں مور، جن کی حفاظت یہاں حرم کے کبوتروں کی طرح کی جاتی تھی، کھیتوں میں فارغ البال شہزادوں کی طرح خراماں خراماں پھرتے ہوئے بادل کی گرج پر ایک ساتھ جھنگار رہے تھے۔

موروں والی کے چوگرد وہ چاندوں پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں موروں کا شکار یا گزند رسانی منع ہے۔ برطانوی عہد میں کسی انگریز ضلع افسر نے برساتی ندی کے پل پر ایک مور مار لیا تھا تو پروے والوں نے اس کے وہ لٹھ مارے تھے کہ اسے شکرم میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا تھا۔ پھر جب موروں والی پر پانچ ہزار اجتماعی جرمانہ ہوا اور لاڈ میں مال مویشی تک جانے لگے تو ایک ہزار کی بندھی رقم بیوہ کرنل فورٹ نے دی تھی جس کا نصیبو چوہان کے کسی بزرگ سے بلپول تھا۔ خود وہ اس انگریز عورت کی نسل تھی۔

جب ربیع کی فصل گھٹنوں گھٹنوں سے کم ہوتی تھی تو پرسکون سولانے میں ہزاروں موروں کا پھرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن آج چوماسہ میں ان کا جھنگارنا اور بھی اچھا لگتا تھا۔ پر آنکھوں سوجے نصیبو کی تو اس طرفگی کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ جب وہ پرڈے پہنچی تو بشیشر نیبے کی نہ کان پیاسے دیکھ کر کتے بھونکنے لگے تھے اور ساتھ کی ساتھ کاگا رول بھی پڑ گئی تھی۔ جورو کو کمبل نے موزیلوں سے بچالیا تھا۔

بعد عشاء جب لالٹینیں باغوں میں شہابوں کی طرح سے پھرتی ہوئی معلوم ہونے لگیں تو پھر کمبل تو ایک تھا، پر اس میں جی دو تھے۔ اور جب ساون کی گدلی گدلی جانہار اور ستم گر ہوا چل رہی تھی، آسمان نپٹ گھور رہو رہا تھا، گاؤں کی لڑکیاں دھوریا ملار گا رہی تھیں تو نصیبو چوہان کی دہلیز میں پنچایتا جڑا ہوا تھا۔ اس پنچایت میں گنے ہوئے پانچ ہی آدمی تھے: نصیبو چوہان، اس کا بھائی ہبا چوہان، پٹواری رحیم بخش اور جورو کے دونوں ماموں۔ بحث یہ چھڑی ہوئی تھی کہ پمپ والے سے کیسے بدلہ لیا جائے۔

اُدھر ایک ہی کمبل میں دو جی یوں کھسر پھسر کر رہے تھے: "ارے صمد! تم بھی بڑا ماٹھو چند، کاٹھ کا اُلو ہے۔ نصیبو چوہان تو کھونی جھوٹے نوں مارنے کا پنچایتی بھالا لیوں نیرے اس جا کی بہ گے چھلتے ماں گھیو نے آنا ہو گا۔"

"تو تو پٹرول پمپ پہ آ ہ جائی کیوں نہیں چھوڑتی؟"

"یو کمبکھت چھوڑ انیس مانتا۔ اس کی ہر بھنت یو ہی رٹ ہے: 'وہیں چل، وہیں چل۔' سورج چلکارا چھوڑ دے گا تو میں یہاں آنا چھوڑ دوں گی۔"

"جب اس نے نہ چھوڑا تو نہیں؟"

"نہیں، نہیں۔ یوں کہہ پیٹرول پمپ پر جم جم آ، اندھیرے آ، اُجالے آ۔"
"تو آ کے نت یہیں رہے بسے، کبھی گھر نہ جائے۔ اب تو خوش ہے۔"
"دُکھی ہوں۔ جو میں گھر بیٹھے ہوئے سوچا کروں ہوں، پیٹرول پمپ پہ جاؤں گی، تو میرے دل ماں گھنگھروؤں کے مور ناچن لاگیں ہیں۔ ہور جد تیرے دھورے آؤں ہوں تو یوں لگا کرے ہے جیسے سامنے سوانے ماں مور ہی مور ناچ رہے ہوں۔
اور جد میں تیرے دھورے سے جاؤں ہوں تو یوں لگا کرے ہے جیسے ہرے ہرے دھانوں نوں بکھولی کھا رہی ہو۔ جیا کلپس کرے ہے بس ابھی اس کے ساتھ لیکھا جوکھا برابر کر لو۔ یہ چھتیس بھوجن اور پیچ پکوانی کل کے واسطے کیا دھرنا۔ کیا پتا کل دن چلے نہ چلے۔ جو کچھ ہے آج سپٹرالو، پھر ملنا ہو نہ ہو۔ تیرے بنا تو میں ٹھنٹھ سی ہوں۔ تجھے دیکھا ہور منجرائی۔ جو کوئی کسی کی ڈھیر دیر سے باٹ دیکھ رہا ہو پھیر وا آ جاوے ہے تو بڑی قدر ہو ہے۔"
"میرا تو ہر لمحہ ہی تیرے انتظار میں گزرتا ہے۔"
"جس بھنجیرنے بھڑوں کھایا نصیبو جہاں پوڑوں جیسے گال بنائے ڈھر کھایا گھروں آیا تھا اس رات تجھے کیوں نیند آگئی تھی، آسک تو چاندنی رات ماں ٹیٹریاں کی طروں جاگا کریں ہیں۔"
"میں تو تیرے سپنے دیکھنے کے لیے سو گیا تھا۔"
"دیکھے بھی؟"
"ہاں، جانے تیرا میرا بیاہ ہو رہا ہے۔"

"بس تیرا میرا بیاہ ہوگیا۔ سینا اُلٹا ہو ہے۔"

"تو تیرا میرا بیاہ نہیں ہو سکتا؟"

"یو تو میں کدھی نی کہوں گی پر سپنا اُلٹا ہو ہے۔ پر دیکھ نہ مجھے نصیبو جیہان اچھا لگے نہ کوئی دوسرا لگا سکا۔ سعلی گھاؤں، چھاجھ پیوں تیں ہی سامنے رہے ہے۔ جو نواج پڑھی کھڑی ہوں تو میری نواج ہی نہیں ہوتی۔"

"نماز کیوں نہیں ہوتی؟"

"تیں نواج پڑھن دے تو ہو۔"

"کیوں؟ کیا میں تجھے ہنساتا ہوں؟ میں تو تیرے گدگدیاں بھی نہیں اٹھاتا۔"

"نواج پڑھتے ہوئے میرے سامنے دا دا ہو ہے جو ٹھالی بیٹھے ہوئے بھی نی ہوتی۔"

"کیا؟"

"بس پوچھانی کیتے۔ ارے اللہ مارے لٹو ریے، کالیے، بدحواس! تیرے آپ لے ہونٹ پہ تھوڑی تھوڑی سی مونچھاں پھوٹن لاگیں پہ تیرا لونڈا پن نہ گیا۔ جو بات نہیں کہہ سکے ہے بیر بانی تنیں کہہ سکتی۔ میں بڑی گناہ گار ہوں جیسی نیت ویسا پھل۔ اب کے رمجان آیا، میرے روجے (روزے) تنیں ہونے کے۔ جو میں دن ماں تیرے دھورے آئی تو روجا کہاں۔ کھر پانچوں بکھت (وقت) کی نماجاں پڑھوں تیرے دھورے آکے ایک بھی نی پڑھی جاتی۔"

"میں روکتا ہوں؟"

"تیں کیا روکتا۔ بس پڑھی ہی نی جاتی۔ جد میں تیرے کنے آیا کروں تھی

روٹھ جایا کر۔ مناؤں تو منانہ کر۔"

"کیوں؟ تو ہی رُوس جایا کرنا۔"

"میں ہنسو کرٹ ہوں، مجھے رُوسنا نی آئے گا۔"

"تو تیرے خیال میں میں بڑا اکڑ ہوں۔"

"کڑ تو نئیں ہے۔ میں ہی تیرے پاس آئی ہوں، تئیں تو میرے لبوں (ویلے) کدھی برے دے کی ڈھب ڈھائی گدم (قدم) بھی نہیں بڑھایا۔"

"وہاں بلا کے میرا اس فرنگی جیسا حال کرنا چاہتی ہوگی جسے شکم میں ڈال کے ہسپتال لے گئے تھے۔"

"ارے میں تو تیرے ساتھ یوں ہی گیج ماری ہور مجاکھاں کر رہی تھی۔ میں اپنے کالے لٹوریے کے لیوں بھوری بھینس کے دودھ کی کھیر لاؤں گی جس ماں پستہ بدام پڑا ہوا ہوگا ہور ڈھیر سی ملائی، پر لالے! چمچیاں ساتھ ہوں گی۔ ہاتھ نہ تیں ساپنے نہ میں۔"

"میں تجھے موروں پھرتے ہریلے کھیتوں میں دور سے آتی ہوئی دیکھوں گا۔ تو ریشم کے ست رنگی اینڈوے پہ کھیر رکھ کے لائے گی۔ راجہ اندر کے اکھاڑے کی رقاصہ سبز پری ایسا گوکھرو جڑا جھلردار کا کاہی لہنگا اور ست غصمی انگیا پہنے ہوئے۔"

"میں تو کھیر کٹورہ دان میں لاؤں گی۔ جو ہنڈ بھر کے لانا ہوتا تو پھر گنڈوری کی چاہنا تھی، ہور میں تو رات نوں آؤں گی، ایسے ماں پٹ بیجنوں کا چاندنا ہو تو ہو، تیں سب مجھے دور سے آتی ہوئی کیسے دیکھے گا؟"

"ڈیٹھنہار دیکھ لیتے ہیں۔"

اس کھٹے میٹھے مذاکرے کے بعد ان میں دوسری قسم کی خلا ملا ہونے لگی۔ گیس کی لالٹین چاہ رہی تھی بجائے زلجنتا میں دیکھتے دیکھتے بس بجھ جائے، لیکن اس گیس کی لالٹین کے چاہنے سے کیا ہوتا۔ وہ انھیں اپنی دن ایسی روشنی میں سینہ بہ سینہ ہوئے نئے کھیل نکالنے اور ہل چل مچانے سے کیسے روک سکتی تھی۔ آج بھی وہ ایک دوسرے میں گویا سرایت ہوئے جا رہے تھے۔

آسمان پر ایسا کالا چوک ہو رہا تھا۔ برساتی ندی کے طوفان سے جدیل میں مہیب جھاگیں پیدا ہو رہی تھیں پیٹرول پمپ کے دونوں واسی اس کی گنجار سن رہے تھے۔ ایک مربع میل کے آل جنجال جنگل پر تاروں بھری رات کا دھوکا ہو رہا تھا کیونکہ وہاں بے شمار جگنو تیگوں کی طرح اُڑ رہے تھے۔ مینڈکوں نے شور مچا رکھا تھا۔ جھینگر بول رہے تھے اور ٹھنڈی پون کا ہر ایک جھکورا گاؤں میں دھوریا ملار کا لہرا لگاتی ہوئی لڑکیوں کے بولوں کو بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے میں رمائے لیے آ رہا تھا۔ ساتھ کے ساتھ کنج سے مولسری کے پھولوں کی سباس بھی آ رہی تھی۔ جرنیلی سڑک پر جو مزدور ٹرک میں بیٹھے ہوئے گزر رہے تھے ان کے گیت کا یہ ٹکڑا آسمان پر روئی کے پہل ایسے بادل کی طرح فضا میں ٹھہرا رہ گیا تھا:

سن رے پپیہے کل سرے، آدھی رات نہ کوک
میں واری کرتار کی، اُٹھے کلیجے ہوک

گیت کے اس ٹکڑے پر حورو کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے جنھیں محمد

نے اس کے موتیوں ایسے رخساروں سے پھسلتے ہوئے دیکھا۔ پھر اسے ملن کے سمے رنجیدہ خیالات کی مداخلت بے جا ناگوار گزرنے لگی۔ خوشی کے لمحوں کا قصر اسے پسند نہ آیا۔ وہ یک لخت اس طرح سے کھلکھلا اٹھی جیسے کوئی بچہ ضد میں رو رہا ہو، اسے ضد کی چیز مل جائے تو وہ قہقہے لگانے لگے۔ اس نے ٹھمک ٹھمک کر گانا شروع کر دیا :

میری ٹوٹی نتھلیا کی گونج

بدلیسا سے اب نہ بولوں۔ سلام

پھر بوندیں اتر آئیں۔ جھکا ہوا بادل جو زور سے گرجا تو کئی ہزار مور ایک ساتھ بولنے لگے۔ سارنگی کے لہرے ایسے دھورا یا ملار کا کوئی بول اب بھی سنائی دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ جھم جھم، جھم جھم، دھوا دھوں پر ساکہ گاؤں میں جنگی پرنالے چھتوں کا پانی خالی کرنے سے قاصر ہو گئے، جو منڈیروں پر سے بہ نکلا۔ جو نیلی سڑک پانی میں ڈوب گئی تھی اور چوخانے کمبل کے دو جی ایک دوسرے کو جیت رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جان لڑا رکھی تھی۔ اس اشتغال میں تو چور سیندھ لگا کر ان کی ہر چیز کا صفایا بھی کر جاتے تو ان میں سے کوئی بھی مخل نہ ہوتا۔

(۳)

چوپائے کو تو کوئی کھونٹے سے باندھ کر یا پھاٹک نما اڑ گڑے میں بھی روک کر رکھ سکتا ہے لیکن دو پائے کا روکنا بڑا کٹھن ہے۔ دھوپیلا سماں ہو یا بھورا لی رات، یہ جنم بگڑی اچوک بیڑول مپپ پر جا کر مخالطت بازی کرتی تھی۔ اسے

'کونٹل گارڈنگ کے ذریعے روکنا ناممکن تھا۔ اب تو وہ چھپا چھپی نہیں کھلا کھیل رہی تھی۔

پٹواری نے ایک مرتبہ بڑی مناسب تجویز پیش کی کہ صمد اور حورو کا نکاح پڑھا دیا جائے لیکن ایک ڈیوڈھے اور موٹے گنبد، دو سرل سے ملچھڑ میناروں والی مسجد کے امام ملا شبر نے ڈانٹ دی : "یہ دونوں تو سنگسار ہونے کے قابل ہیں، ان کا نکاح نہیں پڑھایا جا سکتا۔ اس مستانی لڑکی نے بیگم فورٹ کا نام خوب روشن کیا ہے۔" اور ملا شبر کے فتوے کو کون مسترد کر سکتا تھا۔

دراصل اس پاکباز پردے کا کوئی بھی مرد حورو ایسی لڑکی سے نکاح پڑھوانے کو تیار نہ تھا، اور تیار تھا تو صرف پٹواری دیپہ کا کڈھیلا جنگیرا۔ یہ اس لیے تیار تھا کہ اس کی شادی کہیں نہیں ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنی ماں ہی کی طرح کالا کالا فندیرے کم قد تھا، لیکن بلا کا طاقت ور۔ پر یہ سب جانتے تھے کہ وہ ماں باپ کی طرح سے کھنگی ہے اور اس کا باپ اب بھی جمنا پار کے موضع منگل پورہ میں چوہانوں کے گھر کمانا پھرتا ہے۔ اس کے منہ میں ہر وقت حقہ رہتا تھا اور پیچھے کتا۔

ایک پھر ساون کے سانجھے میں، جب برساتی ندی ناکوں ناک بہہ رہی تھی اور ٹلی کے پہاڑی جنگلوں سے بہتے ہوئے بجر لٹھے گویا پل کے کھولتے ہوئے پانی میں دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر مہیب آوازیں پیدا کر رہے تھے، پٹواری دیپہ مع نصیبو چوہان، اس کے بھائی ہیبے چوہان اور حورو کے دونوں ماموں پیٹرول پمپ سے دو فرلانگ فاصلے پر، جانب غرب، شہر لے جانے والی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ جب یہ پانچوں شہر جانے والی بس میں بیٹھے تو خوب اندھیرا ہو چکا

تھا اور دھواں دھار قسم کے گاڑھے بادلوں سے ٹم ٹم بوندیں پڑ رہی تھیں۔
موروں والی کے مسافر شہر بعد عشاء پہنچے۔ گو بادل اس وقت تھما ہوا تھا لیکن زمین پر جھکی ہوئی گھٹا سے اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ انھیں بس نے کمپنی باغ کے پاس اتارا تھا۔ یہاں سے "کیٹے گنبدوں والی کوٹھی"، میاں جمعیت کی رہائش گاہ، آدھ میل جنوب میں تھی۔
جب یہ دیہاتی کوٹھی کے پاس پھاٹک پر پہنچے تو اس کے زبر جدی آہنی کواڑوں کے پاس جاکر چوکیدار کو آواز دینے کی قدرت کسی میں نہ تھی۔ چوکیدار نے کچھ سرسراہٹ سی محسوس کر کے آپ ہی ان کی طرف ریلوے گارڈ کی لالٹین ایسی روشنی پھینکی۔ جب انھوں نے اپنا مدعا چوکیدار سے بتایا تو وہ ان کا میاں جمعیت سے ملنے کے لیے معاون ہوا۔ میاں جمعیت نے اپنے ملازم صمد کی کہانی بگوشِ ہوش سنی اور جب ہی موروں والی کے لیے اس طرح روانہ ہوگیا جیسے کوئی مغلِ اعظم اپنے باغی صوبے دار کو سزا دینے کے لیے نکلا ہو۔ بڑی لمبی کار میں ڈرائیور کے پاس تو میاں جمعیت بیٹھا تھا اور پیچھے شکایت کنندگان۔
جب یہ کار پیٹرول پمپ پہنچی تو اندر تلاطم مچ چکا تھا لیکن تاحال صمد اور حور دو دہرے پر اٹھے کی حالت میں ہی تھے اور ان میں یہ محبوبانہ گفتگو ہو رہی تھی:
"اسے لنڈورے کا لیے، تاجی مونچھ نکلے! جو پراٹھے کے دونوں بلڑے یہیں تیل ہی چڑھے ہوئے ایک جگہ رہیں تو اچھی بات ہے۔"
صمد: اچھی ساعت زیادہ دیر نہیں ٹھہرا کرتی۔ جس طرح سیپی کا منہ تھوڑی دیر کو موتی بنانے والی بوند کو لینے کے واسطے کھلے اور پھر بند ہو جائے، بس اس کا

قیام اتنا ہوتا ہوگا۔ اور سن، تو بھی مجھے کالیا نہ کہا کر۔

حورو : سبحان اللہ! کملے نے کالا کہا کر دیا، گورے نے کالا کہا، ہنس دیا۔ سارے گوریے۔

صمد : تو مجھے گوریا بھی نہ کہا کر۔

حورو : تیں چاہے ہے میں تجھے سانولا سانورا سانوریا کہا کروں۔ نیں نی جانتا مجھے سیام برن بڑا ہی اچھا لگے ہے۔

معلوم نہیں بول چال کے یہ شگوفے کب تک کھلتے رہتے کہ میاں جمعیت نے کواڑ دھڑ دھڑائے : "صمد، کواڑ کھولو"۔ چاتر باپ کی چاتر اور چونکیل بیٹی نے گیس کی لالٹین بجھا کر شمالی کھڑکی کھول دی جدھر کھیت میں ہاتھی سونٹا اُگا ہوا تھا۔ ایسا اس نے اس خیال سے کیا تھا کہ مالک پوچھ گچھ کرنے لگے تو وہ کھڑکی سے باہر کود کر دیوار کے پاس چھپ بیٹھی رہے۔ ابھی صمد نے چٹخنی نہیں کھولی تھی کہ کھڑکی کی طرف سے پانچوں دیہاتی اندر داخل ہوگئے۔ پٹواری نے آگے بڑھ کر چٹخنی کھول دی اور میاں جمعیت نے ٹارچ کی روشنی میں کیری کی بجلی ایسے پنڈے والی کو اپنے ملازم کے ساتھ اوپری حالت میں دیکھ لیا تھا۔

پھر میاں جمعیت صمد کو کار میں بٹھائے ہوئے شہر کی طرف لیے جا رہا تھا۔ کار برساتی ندی کے پل سے گزر گئی تو پار سڑک کے دو جانب ڈیڑھ میل تک مسجد کے میناروں ایسے سفید سفیدے کھڑے تھے۔ ان سے صمد کا جی زیادہ ہی خراب ہوگیا کیونکہ اسے مرمریں مینار سی لڑکی یاد آنے لگی۔

وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اب پیٹرول پمپ پر جانے کے خیال سے کسی کے

دل میں خوشیوں کے مور نہ ناچیں گے بلکہ وہ تو پیر پیٹ کر مر جائیں گے۔ اس کی آنکھیں رونے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ پھر جبھی شہر کی طرف سے ٹرک آیا جس میں مزدور گا رہے تھے :

کوٹھے اُوپر میں کھڑی، سبز کبوتر جائے
سیٹی مار بلائے لوں، جوڑا بچھڑا جائے

یہ سن کر اس کے لہر چھوٹ گئی اور ٹیکن کے سبب اتنے گرم گرم آنسو ٹپکے کہ جلد ہی اس کا دامن بھیگ گیا۔ دور گئے کی آس ہوتی ہے، اسے اتنی آس بھی نہ تھی۔

اُدھر حورو کو وہی پانچوں دیہاتی ہلکی ہلکی بوندوں میں گاؤں لے جانا چاہتے تھے جیسے کوئی پہاڑ سے تازہ آئی ہوئی قربانی کی دنبی کو مویشی منڈی سے خرید کر گھر لانا چاہ رہا ہو اور وہ آگے کو نہ چلتی ہو، تو یہی حال اس شاخِ بید ایسی لچکیلی کیری کی بجلی ایسے پنڈے والی کا تھی۔ بجائے حسبِ عادت لٹک کر چلنے کے وہ تو کھڑی تک نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے تو گوڈے گویا بالکل ہی ٹوٹ گئے تھے۔ وہ مجبور ہو کر حورو کو پروسے میں اُٹھا کر لے گئے اور رات بھر اس پر گویا بکٹ کا پہرہ بیٹھا رہا۔ اس نے صبح کو گائے کے مکھن سے بسنی کھا کر ٹھنڈی لسی نہیں پی، جیسا کہ ان کے گھر دستور تھا، کیونکہ صبح ہی سے جنگیرا کڈ ھیلڑ جھاڑ جھلا سا لیکن نئے کپڑے پہنے ہوئے ان کی دہلیز میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا تاکہ اس کا نکاح حورو سے پڑھا دیا جائے۔ اس کا کتا ہر آنے جانے والے کو بھونکتا اور کاٹنے کو لپکتا تھا۔ حورو کے گھر والے اسے دھاڑ کے دے رہے تھے۔

جب مُلّا شبر نے اس نجس لڑکی کا نکاح پڑھنے سے انکار کر دیا تو نزدیکی گاؤں بمبور سے والہ سے ایک لالچی کٹ ملّا بلوایا گیا اور دو بول کے بعد حور و ریڑھو میں بیٹھی ہوئی پل سے گزر رہی تھی۔ اس دلہن کے نہ ہاتھ پیلے تھے نہ اس کے پاس زیور تھا، نہ یہ سجی دھجی تھی۔ جیسے ہر ایک دیکھنے والا ٹڈال کی ٹوٹی کٹیا آج بال کی بکی نظر آرہی تھی۔ نکاح کے وقت جب اس سے پوچھنے گئے: "تجھے جنگیرا قبول ہے؟" تو وہ اسی طرح لاتعداد بار "نہیں نہیں" کہتی رہی تھی جیسے کبھی صمد کے ساتھ۔ لیکن اس پہلی نہیں اور اس بعد کی نہیں میں یہ فرق تھا کہ وہ نہیں مگرے پن، چنچلتا بانری اور چوچلوں بھری ہوئی ترنم خیز تھی اور یہ نہیں کہتے ہوئے وہ بول نہیں رہی تھی بلکہ بلک رہی تھی۔

شرعاً و قانوناً یہ نکاح جائز نہیں تھا اس لیے پٹواری اور کڈھیرا جنگیرے نے نئی دلہن کو قابو میں رکھنے کے لیے سَن کے دو رستے رکھے ہوئے تھے۔ ان رستوں کی ضرورت انھیں کبھی نہ پڑی۔ اس اُفتادگی میں اس سے بھاگا کہاں جاتا تھا۔ وہ تو سسکیاں لے رہی تھی۔ پل کے نیچے کھولتے ہوئے سے طوفانی پانی میں دیواروں سے لگ لگ کر بجر لیٹے مہیب آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ شادیانوں کی جگہ حور کی شادی میں یہ باجہ تھا۔ جنگیرے کی دلہن کی آنکھیں تو رو رو کر ٹیسو سی ہو رہی تھیں اور کھلوان چہرہ جھلسایا جھلسایا سا، جس کی تمام چکاچونت اُڑ چکی تھی۔

اس پانی پڑتے ہیسے سُو میں یہ بیل جمنا کے لانڈے پل کو عبور کر کے ریڑھو کلیسر کی جھلسی ہوئی سیاہ منہ پہاڑیوں میں پہنچانے والے تھے جہاں کبھی سلطانہ اور

فقیرا جیسے ڈاکوؤں نے اپنی آماجگاہیں بنائی ہوئی تھیں، جہاں اناجوں میں اناج اس جھوڑ میں صرف باجرہ ہو سکتا تھا، پھولوں میں پھول آگ پھلی کا زرد پھول اور آوازوں میں آواز گیدڑوں اور لگڑ بھگوں کی۔

کچھ دن بعد موروں والی میں کسی نے آکر کہا کہ نصیبو چوہان کی وہ گجراسی سبک، ہنسی الہڑسی پری مر گئی ہے جس کے منہ میں پیٹرول پمپ سے لوٹ کر نہ ایک پھل گئی تھی نہ ایک قطرہ پانی۔ دلہا اسی اپنی دلہن کے لیے لال رومال میں عروسی پیڑے لے کر گیا تھا لیکن دلہن نے نہ کھائے۔ اس کے پران جنگیرے نے کلیسر کی منہ جیسی پہاڑیوں میں نکال دیئے تھے۔ یہ شبر مرد اس کے ساتھ پہلی ہی رات شام سے طاقت آزما تھا۔ ویسے جنگیرے نے محبت اور لاڈ پیار کی باتیں کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن حور کے منہ سے ہر گھڑی بس "نہیں نہیں" ہی نکلتا رہا تھا۔ پھر گویا اس کی کاتپ اس طرح سے توڑ دی گئی تھی جیسے چری کے ڈنٹھل کے کو پوری پر سے توڑیں تو نشاق سے دو ٹکڑے ہو کر الگ الگ جا گرے۔ پتلی کمر میں یہی بڑا نقص ہوتا ہے۔

اچھا ہی ہوا جو نصیبو چوہان کی کرم پھوٹی جائی زبردستی کے شوہر کے زور ظلم سے ایک ہی رات میں مر گئی۔ عورتیں کو سنا دیا کرتی ہیں: "الٰہی، تو لہلہاتی جائے!" صمد سے بچھڑ کر اس کا زندہ رہنا تو بہر صورت محال تھا لیکن جھر جھر مرنے سے لہلہاتے گزر جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

("سویرا" لاہور)

عفرا بخاری

تیاری

اللہ داد جب تیا صافہ سر پر لپیٹے۔ اجلی قمیض اور دھوتی پہنے پاؤں میں سرخ پوٹھوہاری جوتا ڈالے صحن میں آیا تو خدیجہ کو فوراً بات کھٹک گئی مگر بناوٹی حیرت سے بولی "چاچا کہیں جا رہے ہو؟"

اللہ داد نظریں ملائے بغیر بولا "ہاں بیٹی یہ اپنے ملک جی ہیں نا۔ ماشا اللہ اُن کی بیٹی کی کل رات ہے بس وہیں جا رہا ہوں۔"

"بلاوا آیا تھا؟" خدیجہ نے انجان بن کر پوچھا۔

"ہاں بیٹی۔" اللہ داد نے ذرا ڈھیلے پن سے سر ہلایا تو خدیجہ سر ہو گئی "سچ بتاؤ چاچا کیسا بلاوا تھا؟" اللہ داد قدرے سٹ پٹا گیا۔ پہلے اثبات اور پھر نفی میں سر ہلا کر بولا "دراصل وہ تنا توں کے بارے میں پوچھنے آئے تھے میں نے کہہ دیا کہ بھائی اپنے سامنے لگواؤں گا تمہارا کیا ہے اگر کہیں کسی ٹوبے میں چوب گاڑ دو تو۔"

"تمہیں کیا کہیں گاڑیں چاچا۔ پر تمہیں تو شادی والے گھروں کے گرد منڈلاتے رہنے کی بری عادت ہے۔ بھلا بن بلائے بھی کوئی یوں کرتا ہے۔" خدیجہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"اوہ! بیٹی" اللہ داد کھسیانے پن سے سر ہلا کر بولا "رونق میلہ دیکھ لینے سے کسی کا کیا نقصان ہو جاتا ہے اپنا دل بہل جاتا ہے ذرا خوش ہو لیتے ہیں لاؤ بچوں کو دے دو انہیں ہی تماشا دکھا لاؤں"

"رہنے دو چاچا یہ کوئی بھک منگے نہیں ہیں" خدیجہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تو کیا میں مٹھی بھر چاول ان سے مانگ کر کھاتا ہوں ۔ ۔ ۔ مجھ پر تو ایک دانہ بھی حرام سمجھو" اللہ داد کو غصہ آگیا اُس نے ایک جھٹکے سے گھٹنوں سے لپٹی نیلی کو پرے دھکیل دیا "ہٹ رے بدمعاش تُو بھی" ۔۔ اس نے پپلو کو بھی پیچھے ہٹایا اور ببر کی طرح باہر نکلا چلا گیا۔ پپلو ماں سے ناراض منہ لسوڑتا پیچھے آیا اور ڈیوڑھی میں آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر خدیجہ بھی نیلی کو کولہے پر لادے آئی اور پپلو کے ساتھ کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگی۔

اللہ داد اپنے لمبے بازوؤں کو آگے پیچھے جھلاتا سامنے گراؤنڈ میں جا گھسا تھا اور سفید براق کپڑوں کے باوجود قناتیں لگانے والوں میں گم ہو گیا تھا۔ خدیجہ نے پپلو کا ہاتھ پکڑا اور بولی: "چل رے۔ اندر چل۔ کسی کا بیاہ اور بتاشے کوئی بانٹے۔ وہ تو اب دو دن نظر نہ آئے گا۔ دکان بھی نہ کھولے گا۔ گُچی میں سے پیسے نکال کر تندور سے دال روٹی کھائے گا۔ چل تو اندر چل اسے تو بیاہ دیکھنے کا سودا ہے۔ جہاں لال پیلی جھنڈیاں نظر آئیں وہیں کا ہو رہا۔ تو بھی اس کے ساتھ سودائی ہو جائے گا۔ چل اندر چل" وہ اسے گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

اس وقت اللہ داد تنی ہوئی قناتوں کے نیچے خالی گراؤنڈ میں اپنے ہاتھ خمیدہ پشت پر باندھے گھوم رہا تھا۔

اوکاڑے میں جب اللہ داد اپنی دکانداری اُجاڑ بیٹھا اور اس کی جیب خالی ہو گئی تو وہ لوگ جو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتے تھے وہ بھی غائب ہو گئے۔ اب وہ خالی دکان پر بیٹھا مکھیاں مارا کرتا اور ان لوگوں کے لیے ترسا کرتا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے اسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

"اللہ داد تیرے لیے بہت اچھی لڑکی ڈھونڈی ہے پر تین سو روپے لگیں گے۔"

"تین سو روپے کی کیا بات ہے میاں تم بات چلاؤ۔" وہ مڑ کر دیکھتا اور اپنی اکیلی آواز کی گونج سنتا۔ شادی کے بہانے لوگوں نے اس سے خوب روپیہ بٹورا تھا اور اسے دودھ کے کٹورے پر ٹرخا دیا تھا۔ مگر وہ تو اب بھی دھوکا کھانے کو تیار تھا۔ مگر اب اس کی خالی جیب سے کسی کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے دکان بند کی اور اپنا کل اثاثہ دری میں لپیٹ کر لاہور آ پہنچا۔

خوش قسمتی سے وہ ٹھیک اس دن لاہور پہنچا جس دن چودھری منظور بی ڈی ممبر منتخب ہوا تھا۔ اور گلی کے جوان اسے کندھوں پر بٹھائے ہُرّے ہُرّے کے نعرے لگاتے گھر کی طرف لا رہے تھے۔ اور گلی کی ساری فضا چودھری زندہ باد اور مخالف ممبر کی مردہ باد سے گونج رہی تھی۔ دری میں لپٹے اپنے کل اثاثے کو سر پر رکھے اللہ داد نے یہ سارا تماشا گلی میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ پھر جب شیخ جی کے گھر کے سامنے چودھری کو دستار بندی کے لیے کندھے سے اتارا گیا تو وہ دل میں اپنی برادری کے اس ہونہار سپوت پر صد آفرین کہتا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

بے حد مضطرب مگر خوش خدیجہ نے اس کی آمد کو نیک فال سمجھا۔ یوں بھی دل کی وہ اچھی تھی اس لیے فوراً ہی برادری کے اس اجڑے پچھڑے بے یار و مددگار آدمی کو چاچا کے خطاب سے نواز دیا۔

یوں وہ یہاں آباد ہوا۔ ڈیوڑھی سے متصل ایک کمرہ اسے دے دیا گیا جس کا ایک دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔ اسی کمرے میں چودھری سے سو روپے ادھار لے کر اس نے پرچون کی دکان کھول لی۔ اگلا حصہ دکان کا تھا اور پچھلے حصّہ میں اس کی کھاٹ، بستر، چند المونیم کے برتن، ایک چھوٹا سا ٹین کا بکس رکھا تھا۔ اس کے آنے سے چودھری اور خدیجہ کو بڑا آرام ملا تھا۔ ایک طرف سودا سلف لانے، بچوں کو کھلانے بہلانے کا انتظام ہو گیا تھا دوسری طرف چودھری کی ممبری کی تشہیر کا ذریعہ بن گیا تھا۔ چودھری سے بالا بالا وہ اس کی ممبری کا رعب محلّے والوں پر آزماتا رہتا تھا۔ ہر بات شروع کرنے سے پہلے وہ یہ ضرور کہتا :

"بھئی ہم تو حکومت کے آدمی ہوئے"۔۔۔۔ اور اسی رعب میں اس نے گلی اور گلی سے متصل کوئی پندرہ سولہ گز چوڑی اور بیس گز لمبی گراؤنڈ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ گراؤنڈ کو موجودہ شکل بھی اسی نے دی تھی۔ پہلے یہاں دھول اڑتی تھی۔ اور گوبروں کی غلاظت بکھری رہتی تھی۔ چھٹی والے دن لڑکے گیند بلے پیڈ اور دستانے لیے وہاں آجاتے۔ ان کی گیندوں سے نہ راہ چلنے والوں کے سر محفوظ تھے نہ مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازے کے شیشے۔ کئی بار تو گیند اس کے پاس سے یوں زنّاٹے سے گزرتی کہ وہ اپنی ناک ٹٹولتا رہ جاتا۔۔۔ پھر یہاں تاش

کھیلنے والوں کی منڈلیاں بھی جمتی تھیں جو اونچی آواز میں گالم گلوچ کرتے، بڑی بیہودگی سے ہنستے تھے۔ مگر اب یہ سارے سلسلے بند ہو گئے تھے۔ اب گراؤنڈ میں سبز مخملیں گھاس کا فرش بچھ گیا تھا۔ پھولدار پودے لہلہانے لگے تھے۔ اور موٹی باڑھ کے گرد نوکدار تار لگا دیئے گئے تھے۔ اب لوگ گرمی کی شاموں میں اور سردی کی دوپہروں میں وہاں بیٹھتے مولیاں اور سنگترے نمک لگا کر کھاتے اور گنڈیریاں چوستے تھے۔ البتہ کرکٹ اور تاش کھیلنے والے اللہ داد کے دشمن ہو گئے تھے وہ ان سے کئی بار نبرد آزما ہو چکا تھا۔

وہ کھاٹ پر بیٹھا اطمینان سے حقہ پی رہا ہوتا کہ کوئی لڑکا چپکے سے کان میں آ کر کہہ دیتا۔

در چاچا گراؤنڈ میں تاش ہو رہی ہے پر تم آج ادھر نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے صبور خاں بہت غصے میں ہے۔"

آخری فقرہ محض اسے چیلنج کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلتا۔ اللہ داد فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اپنا کھیس کوٹ اور ٹوپی اتار کر کھاٹ پر رکھ دیتا۔ پھر دبے قدموں گراؤنڈ کی طرف بڑھتا۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور قد کی نسبت بازو بہت لمبے تھے چلنے میں وہ یوں آگے پیچھے کی طرف جھولتے کہ کبھی تو اس سے بہت آگے نکلتے نظر آتے اور کبھی بہت پیچھے رہتے دکھائی دیتے۔

کمر کے قدرے خمیدہ ہو جانے سے اس کا قد باڑھ کی اونچائی کے برابر رہ گیا تھا۔ یوں اندر بیٹھنے والوں کو وہ اس وقت تک دکھائی نہ دیتا جب تک وہ

بلّی کے سے قدموں سے چلتا ان کے سروں پر نہ جا پہنچتا۔
"کیوں بے حکومت کے آدمیوں کے سامنے یہ کام کرتے ہو۔ دس دس سال کے لیے اندر کروا دوں گا۔"
لڑکے بونے کو یوں آناً فاناً سروں پر چھایا دیکھ کر گھبرا کر کھڑے ہو جاتے اور عام طور پر مزاحمت کی بجائے مصالحانہ رویہ اختیار کرتے۔
"چاچا چاچا معاف کر کھیل جما ہوا ہے آدھ گھنٹے بعد اُٹھ جائیں گے۔"
"ابے حکومت کے آدمی کو جھانسہ دیتے ہو۔" اللہ داد جھپٹ کر پتّے ہاتھ میں دلوچ لیتا۔
"جاؤ گھروں میں ماؤں کے پاس بیٹھ کر کھیلو وہاں کیا ڈر ہے۔"
اب کسی نہ کسی لڑکے کو طیش آجاتا اور وہ لپک کر اللہ داد کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیتا۔
"آج تو حکومت کے آدمی کی ایسی کی تیسی ہی کر دوں گا۔"
"ابے جا۔" اللہ داد آگے کو گھسٹتا ہوا ہاتھ چلاتا۔ دو چار دھولیں کھاتا کچھ ہاتھ مارتا بھی۔ پھر اس دوران وہ بندر کی طرح اس طرح چیختا چلاتا اور شور مچاتا کہ لڑکے بدحواس ہو کر اسے چھوڑ دیتے اور باڑھ پھلانگ کر باہر نکل جاتے۔ پھر اپنی اس کم ہمتی پر مشتعل ہو کر خوب گالیاں دیتے۔
"خنزیر کے بچے، کمینے کسی دن اپنے ہاتھ سے تیرا جنازہ اس گراؤنڈ میں گاڑ دوں گا۔"
دوسرا کہتا۔ "چودھری کا لحاظ ہے نہیں تو انتڑیاں ڈھیر کر دیتا۔"

تیسرا پھنکارتا ۔ " بڈھا خبیث مرتا بھی نہیں محلے بھر کو آگے لگا رکھا ہے۔"
چوتھا مذاق اڑاتا " ابھی کیسے مرے ابھی تو یہ مُنہ کی اولاد دلہن ڈھونڈ رہا ہے۔"

پہلا پھر پلٹ کر جواب دیتا " اس مردود کی دلہن اب موت بنے گی اور دونوں کا نکاح میں پڑھاؤں گا میں۔"

اللہ داد کمر پہ ہاتھ رکھے خاموشی سے یہ باتیں سنتا اور فاتحانہ تمسخر سے مسکراتا۔ یہ مسکراہٹ لڑکوں کے لیے چیلنج کا اثر رکھتی وہ دانت پیس پیس کر گالیاں دیتے۔ "کل نئے تاش لے کر آئیں گے دیکھیں گے کون روکتا ہے ہمیں۔"

" تو تاش کیا لائے گا تیرے تو بیاہ کے تنبو بھی یہاں گاڑنے نہ دوں گا۔" اللہ داد مسکرا کر کہتا۔

" ابے جا منحوس نہیں تو ابھی تیرا بیڑا غرق کر دوں گا۔" لڑکا دور سے غُراتا۔ یہ تو تکار لڑکوں کے ٹل جانے سے ختم ہو جاتی۔ اللہ داد مالکانہ انداز سے گراؤنڈ کے دو چار چکر کاٹتا پھر اپنی کھاٹ پہ آ کر بیٹھ جاتا اور حقہ پیتے ہوئے خود بخود ہنستا رہتا۔ " ابھی تو دو بیسی عمر ہوئی ہے ابھی کہاں مروں گا۔" وہ ہنستے ہوئے اونچی آواز میں بڑبڑاتا۔ قریب لڑکوں کی ٹولی کھڑی سن لیتی تو کوئی لڑکا چھیڑنے کو کہہ دیتا۔

" چاچا مقبول کہتا ہے تیری عمر دو بیسی نہیں ہو سکتی۔"
" پھر کیا ہو سکتی ہے۔" وہ حقے پہ ہاتھ رکھے آنکھیں سکیڑ کر لڑکے کی طرف دیکھتا۔

"یہی کوئی چار بیسی ہو گی۔"

"کر لو بات۔" وہ حقے پر جھک کر بے یقینی سے سر ہلاتا۔

"میرا بھی خیال ہے چاچا تمہاری عمر زیادہ نہ ہو گی ابھی تو تم بالکل جوان نظر آتے ہو بس تم جلدی سے شادی کر لو تو سب کی زبانیں بند ہو جائیں۔"

اللہ داد بڑے انداز سے مسکراتا۔

"اسی وجہ سے تو وہاں سے بھاگا تھا۔ بیسیوں لوگ پیچھے پڑے تھے۔ کوئی کہتا دو سو۔ کوئی کہتا تین سو۔ کوئی کہتا پانچ سو دو شادی کروا دیں۔ میں نے بھی خوب پیسہ لٹایا۔ پر اتنی لڑکیوں سے کون بیاہ کرتا یہاں بھاگ آیا ہوں۔ پیچھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے مجھے۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے چاچا کوئی لڑکی ورڑ کی ڈھونڈی یا نہیں۔"

اللہ داد بے پرواہی سے حقے پر جھکا حقہ گڑ گڑاتا رہا۔ پھر بغیر سر اٹھائے کہتا۔ "بیلو کی ماں سے کہہ رکھا ہے۔ وہ کوشش کر رہی ہے۔ دیکھو کیا بنتا ہے۔"

"ہاں چاچا کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا ابھی ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" لڑکے ہنسی سے بے تاب ہو کر اِدھر اُدھر بکھر جاتے اور وہ حقے پر ہاتھ رکھے اپنے ڈھلکے ہوئے اٹھا کر انہیں پیچھے سے دیکھتا اور سوچتا۔ ان لڑکوں کے بیاہ کب ہوں گے۔

محلے کے تقریباً سارے لڑکوں کا حساب لگا رکھا تھا اور جب کسی گھر کے سامنے سبز، سرخ جھنڈیاں لگنی شروع ہوتیں۔ تو اس کے پاؤں خود بخود زمین سے اوپر اُٹھ جاتے۔ اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے کندھوں پر پر نکل

آئے ہیں اور وہ چڑیوں کی مانند ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا سرد خون بھی گرم ہو جاتا اور اس کے چہرے کی جھریاں دہکنے لگتیں۔ جب سے گراؤنڈ میں تنائیں لگنے سے پہلے لوگوں نے رسمی طور پر اسے اطلاع دینی شروع کی تھی، تب سے اس کی اہمیت خود اپنے آپ میں بڑھ گئی تھی۔

اس دن بڑا جاڑا پڑا تھا۔ موسم بھی ابر آلود تھا۔ اور سہ پہر میں ہی شام کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

اللہ داد پرانے کوٹ پہ موٹا کھیس لپیٹے اور سر پہ اونی ٹوپی پہنے دکان کے اندر چوکی پہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ جبھی تین تانگے آگے پیچھے کھڑ کھڑاتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے اور گھوم کر گراؤنڈ کی پرلی طرف چلے گئے۔ اللہ داد نے چونک کر سر اٹھایا پھر ٹوہ لینے کے لیے وہ گردن اونچی کر کے سامنے دیکھنے لگا تینوں تانگے گراؤنڈ کی پرلی طرف کونے کے ایک مکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے مردوں، عورتوں اور بچوں کی سواریاں اتر رہی تھیں۔ اللہ داد آج دن بھر دکان سے باہر نہ نکلا تھا اور بغلوں میں ہاتھ دبائے بیٹھا اونگھتا رہا تھا۔ اب اسے حیرت سی ہوئی۔ اس مکان کے سامنے کافی چہل پہل سی نظر آ رہی تھی۔ مگر کچھ پھیکی پھیکی اور بے جان سی۔ مردوں کی دو تین ٹولیاں مکان کے آس پاس کھڑی تھیں۔ چند بچوں نے ایک چھابڑی والے کو گھیر رکھا تھا اور وہ اس سے مونگ پھلی، ریوڑیاں اور شکر قندی خرید رہے تھے۔ چند عورتیں بچوں کو کولھوں پہ دبائے دروازے میں اور چند باہر نکلی کھڑی تھیں۔ اور مسکرا مسکرا کر ایک دوسری سے باتیں کرنے کے علاوہ خریداری میں بچوں کی رہنمائی بھی کر رہی تھیں۔ اللہ داد

آنکھیں جھپکاتے ہوئے سامنے دیکھتا رہا۔ کچھ دنوں پہلے اس مکان میں نئے کرایے دار آکر رہے تھے۔ اور اس نے اس گھر سے صرف ایک سفید براق سی داڑھی اور پٹوں والے آدمی کو نکلتے دیکھا تھا۔ وہ آدمی فالج زدہ تھا۔ اور چند بار چیونٹی کی چال چلتا اس کی دکان کے سامنے سے بھی گزرا تھا۔

'لڑکی کا بیاہ ہوگا' ـــــ اللہ داد سوچتا ہوا کچھ بے چین سا دکان سے باہر نکلا اور باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے ایک سمت میں چکر لگایا پھر وہ گراؤنڈ کے اندر چلا گیا۔ گھاس موسم سرما کی وجہ سے بھوسلی ہو چکی تھی۔ نوعمر اور ننگے یونکے سے پودے بھی بے برگ کھڑے تھے۔ اللہ داد نے پاؤں سے روڑھوں کو ادھر اُدھر لڑھکایا پھر کچھ ٹوٹی ہوئی کانٹے دار ٹہنیوں کو اٹھا کر باڑ کے پاس پھینکتا رہا۔ پھر وہ گراؤنڈ سے باہر نکل آیا۔ اچانک عورتوں اور بچوں کی ہیڑ کی ہیڑ آئی اور پرلی طرف نکل گئی۔

پھر ایک آدمی بڑا سا دیگچا اٹھائے گھر کے اندر چلا گیا۔ اللہ داد ٹھٹھک کر سامنے دیکھتا رہ گیا۔

اس دیگچے میں الائچیوں اور موٹی تہہ دار ملائی والی میٹھی چائے پکے گی۔ اور خستہ باقر خانیوں کے ساتھ پی جائے گی۔ اس نے گھر کے اندر عورتوں بچوں کے ہجوم اور ان کے خوش کن شور کو اپنے تصور میں دیکھا اور سنا۔ پھر اس نے اس گرمی کو محسوس کیا جو انگیٹھیوں میں دہکتے کوئلے پیدا کر رہے ہوں گے۔ پھر اس نے مہندی اور گوٹے کی خوشبو کو سونگھا۔ پھر اس نے ان عورتوں کے متعلق سوچا جو چھوٹے گدگدے بچوں کو گرم کپڑوں میں لپیٹے ایک دوسرے میں گھسی بیٹھی گپیں اڑا رہی

ہوں گی۔ اچانک ڈھولک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اداس ہو گیا۔ اس نے سردی سے کپکپاتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ اس بھری پڑی کائنات میں بے حد اکیلا اور تنہا ہے۔ مگر دوسرے لمحے اس نے اپنی اداسی کو جھٹک دیا۔ اور ساری رونق اور گرما گرمی کو اپنے اندر محسوس کیا۔ ساری بات تو روح کے اندر کی تھی۔ اتنے میں پیلو باہر نکل آیا اور بولا ”چاچا سردی میں کیا کر رہے ہو؟“

اللہ داد نے جھک کر اسے کندھوں پر بٹھا لیا۔ پیلو نے بھی چہل پہل کو محسوس کیا اور بولا۔

”چاچا وہ کیا ہے؟“

”بیاہ“ اللہ داد نے سرگوشی کی۔

”اور تمہاری چلم کے لیے بڑے بڑے سرخ انگارے“ وہ دونوں ہنس پڑے باڑھ کے ساتھ اس نے پیلو کو دو تین چکر دیئے پھر جب اس کی سانس پھول گئی تو پیلو کو نیچے اتار دیا اور بولا۔

”تم یہیں کھڑے رہنا ابھی کوئی قتاتوں کو پوچھنے آئے گا میں کپڑے بدل کر آیا“

وہ دکان کے اندر گیا اور دروازہ بھیڑ لیا۔ جب وہ دوبارہ باہر آیا تو پیلو نے بغور اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اجلے کپڑوں پر وہی پرانا کوٹ اور کھیس تھا۔

”چاچا تیرا بیاہ کب ہوگا؟“ پیلو نے معصومیت سے پوچھا۔

اللہ داد ہنس پڑا ”اپنی ماں سے کہو نا ذرا جلدی کام بنا دے“

”اچھا چاچا“ پیلو نے اثبات میں زور سے سر ہلا دیا۔

رات کا اندھیرا تیزی سے اترتا آرہا تھا۔ اور گھر کے سامنے ابھی تک روشنی کا انتظام نہیں کیا گیا تھا نہ ہی کوئی دوسرا سامان دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ مکان سے باہر مردوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ضرور ہوگیا تھا۔

معاً اللہ داد کو جنگلی کیکر کے گھنے اور پھیلے ہوئے درخت کی اوٹ میں ٹرک کی باڈی دکھائی دے گئی۔ " اچھا تو سامان ٹرک میں آیا ہے۔ پھر تو ابھی ساری تیاری ہو جائے گی۔ قناتیں، کرسیاں، میزیں سب کچھ لگ جائیں گی اور روشنی بھی ہو جائے گی۔" اس نے پُر مسرت اضطراب سے پیلو کے ایک دھول لگائی۔ "دشمن دوزخی جب تیرا بیاہ ہوگا تو اس گراؤنڈ میں تیرے بیاہ کی قناتیں میں لگاؤں گا۔ اور تیرے سر ابھی میں باندھوں گا۔ اور گھوڑی پر بھی میں ہی تجھے بٹھاؤں گا، سنا تم نے؟"

پیلو اللہ داد کی اس فیاضی پر جھینپ گیا پھر احسان چکانے کی خاطر بولا۔

" چاچا جب میں دولہا بنوں گا تو اپنا شہ بالا تجھے بناؤں گا کیوں چاچا؟"

"ہاں"۔۔ اللہ داد نے قہقہہ لگایا ایک اونچا بے فکرا اور جوان قہقہہ جس کی آواز بلاشبہ گراؤنڈ کی دوسری طرف سنی جا سکتی تھی۔ مگر ادھر ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ اور جب اللہ داد نے قہقہہ لگا کر سامنے دیکھا تو اس کا منہ کھلا رہ گیا اس نے ایک ایسی چیز دیکھی جسے وہ سناٹے میں دیکھتا رہ گیا ٹرک اب گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وہ خالی تھا بالکل خالی۔ اور گھر کے دروازے میں سے کوئی چیز بہت سے سروں کے درمیان نہایت خاموشی سے باہر لائی جا رہی تھی۔ شام کا دھندلکا اور رات کی تاریکی گلے مل رہے تھے۔ اور فاصلے کی وجہ سے واضح طور پر کچھ نظر نہ آرہا تھا۔

"چاچا کیا ہوا؟" پیلو اس کے اچانک خاموش ہونے پر حیرت سے بولا، پھر وہ بھی اسی سمت دیکھنے لگا۔

"ٹرک ؟" وہ اس کی توجہ کا سراغ لگا کر خوشی سے بولا اور اپنی انگلی اسی سمت میں اٹھا دی۔ مگر اللہ داد خاموش رہا۔ اور بنا پلک جھپکے آنکھیں پھاڑے اُدھر دیکھتا رہا۔ بہت سے سروں کے درمیان وہ چیز ٹرک کی جانب رینگ رہی تھی تب اسی لمحے اس نے اس تاریک خاموشی میں سے ایک وحشت ناک چیخ کو ابھرتے سنا۔ ایک آدمی گیس لیمپ کو لیے مجمع میں شامل ہو گیا تھا۔ اور اس کی زرد روشنی میں آگے کو متحرک چہرے پُر اسرار اور ہیبت ناک دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ وہ آواز تھی تھکن سے چور لرزتی آواز جس میں ساری کائنات کا دکھ سمٹا ہوا تھا جو شاید بیتے دنوں کی خوشیوں پر نوحہ خواں تھی۔ جو ماضی کی آواز تھی اور جس کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ جو برسہا برس کے ساتھی کی جدائی کے غم سے کانپ رہی تھی۔ جو نہ اونچی تھی نہ نیچی تھی جو ایک ہی کمزور اور لرزاں سُر میں گلے سے نکل تھی، اور ٹوٹ گئی تھی۔ اکیلی اور تنہا آواز جیسے کوئی موت خود اپنی موت پر رو رہی ہو۔

اللہ داد نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اس کا سر جھک گیا۔ اس وقت اس نے محسوس کیا جیسے اس کا وہ بے فکر اور اونچا قہقہہ خلا میں معلق ہو گیا ہے اور وہ اس کی روح کو پامال کر دینے والی بے سُری آواز کو اب اور اس کے بہت بعد بھی سن سکتا ہے۔

("ماہِ نو" کراچی)

ذکاء الرحمٰن

ڈپٹی کمشنر

انہوں نے یہ تمام سفر ایک نقرئی رنگ والے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں طے کیا تھا۔ اس طرح وہ سفر کی تمام دقتوں سے بچ گئے تھے۔ بھاری سامان تو خیر بُک کروا دیا گیا تھا۔ البتہ ایک ہولڈال، ایک سوٹ کیس جس میں کچھ کپڑے اور زیورات وغیرہ تھے۔ ایک ٹفن باسکٹ اور ایک ٹوکری جس میں مختلف قسم کے پھل وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس ہی رکھ لیے تھے۔ ہولڈال نے مسعود جمال کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ وہ جب بھی سفر کی طوالت سے گھبرا جاتا اور نزہت کی باتیں بھی ختم ہو جاتیں تو وہ دھیرے سے اٹھتا اور ہولڈال میں گھس جاتا۔ گھستے ہی نجانے اس کے ذہن پر کیسا جادو سا چھا جاتا کہ اس کی آنکھیں خود بخود مندنے لگتیں۔ پپوٹے نیند کے بوجھ سے بھاری ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ خوابوں کی طلسماتی وادی میں نکل جاتا۔ نزہت کو تو کبھی سفر کے دوران نیند آتی ہی نہ تھی۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر بعد سوٹ کیس کھول کر دیکھ لیتی۔ پھر پھلوں کو ٹوکری میں سے کوئی گدرا سا امرود نکال کر اسے گلہری کی مانند کترنے لگتی۔ اور ٹفن باسکٹ کے استعمال کی پورے سفر میں نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ چونکہ ان دونوں کو سفر میں بھوک کم ہی لگتی تھی۔ بھاری سامان جو بُک کروا دیا گیا تھا۔

بڑے بڑے بھاری ٹرنکوں اور ایک لکڑی کی بڑی سی پیٹی پر مشتمل تھا۔ ان ٹرنکوں میں سے آدھے ٹرنک کتابوں اور تصویروں سے پُر تھے۔ بقیہ ٹرنکوں میں گرم کپڑے، لحاف اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تھیں۔ لکڑی کی پیٹی میں پیانو بند تھا۔ اس قدر کتابیں اور تصویریں مسعود جمال نے بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔ اس کی آدھی تنخواہ اسی مد پر خرچ ہوتی تھی۔ اسے کتابیں اور تصویریں جمع کرنے کا جنون تھا۔ وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور ہر قسم کی تصویریں جمع کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی کتابوں کے ذخیرے میں سیفو کے مجموعوں اور ارسطو کے مقالات سے لے کر ہر قسم کے کوک شاستر تک شامل تھے اور اگر تصویروں کے انبار میں مائیکل اینجلو کے شاہکاروں سے لے کر گھٹیا قسم کے امریکن رسالوں کی اشتہاری تصویریں تک مل سکتی تھیں، تو یوں بھی ہوا تھا۔ مائیکل اینجلو کی بنائی ہوئی ایک شائع شدہ تصویر حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی پوری تنخواہ خرچ کرنا پڑی تھی۔

وہ بہاول نگر کو ہمیشہ کے لیے اپنے پیچھے، بہت دُور چھوڑ آئے تھے۔ روانہ ہوتے وقت مسعود جمال نے حسبِ عادت اپنے سرکاری چپڑاسی کو بہت سا انعام دیا تھا۔ الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے معززینِ شہر اور سرکاری افسران سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ معانقہ کیا تھا۔ بک اسٹال سے ڈھیر سارے رسالے اور اخبار خریدے تھے۔ اور پھر گاڑی چلنے پر وہ دیر تک کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا اپنا سفید رومال ہلاتا رہا تھا۔ حتّٰی کہ جب بہاول نگر کا زرد اینٹوں والا سٹیشن بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اور پلیٹ فارم پر ہلتے ہوئے الوداعی ہاتھ اور لہراتے ہوئے رنگ برنگے رومال بھی دکھائی دینے بند ہو گئے۔ تب بھی وہ

کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا اپنا رومال لہراتا رہا۔ لہراتا رہا۔ اور آخر تھک ہار کر واپس اپنی برتھ پہ آکر بیٹھ گیا۔ اس کے سانولے ہونٹوں پہ پھیلتی ہوئی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس کے چہرے کی شگفتگی اور چمک دمک میں اضافہ ہوگیا۔ اور پھر ہنستی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیوی نزہت کے شعلہ و شبنم آسا چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جو کمہلائے ہوئے پھول کی مانند اداس اداس دکھائی پڑ رہا تھا۔ "یہ میرے خوابوں کا چہرہ غمزدہ سا کیوں ہے؟" یہ پوچھنے کے لیے وہ لبوں کو جنبش دینے ہی والا تھا کہ نزہت بول پڑی۔

"یہ تم اتنے رسالے اور اخبار بھلا کیوں خرید لائے؟"

"چونکہ میں ان کو خریدنا چاہتا تھا۔"

"سفر بہت لمبا ہے؟"

"ہوں۔"

"کیسے کٹے گا؟"

میں تو اتنا طویل سفر بس اسی خوشی میں کاٹ لوں گا کہ کل آنے والی صبح تک میں اس ضلع سے بہت دور نکل چکا ہوں گا۔ اور کل کا سورج مجھے اس ضلع کے فضول اور رذیل قسم کے لوگوں میں الجھا ہوا نہیں پائے گا۔ نزہت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور وہ اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔ اور دوبارہ کمپارٹمنٹ کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ کبھی کبھی مڑ کر نزہت کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مسرت آگیں مسکراہٹ بکھر بکھر جاتی تھی۔

اور جب ان کی ریل نے دریائے ستلج کا مہیب آہنی پل عبور کیا اور دھڑ دھڑاتی ہوئی پنجاب کی سرحدوں میں داخل ہوئی۔ تو نزہت کے ذہن کو یکبارگی جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے دوزخ کے لپکتے شعلے یکدم جنت کی فرحت بیز ہواؤں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ لیکن اسے یہ فرحت بیز ہوائیں اچھی نہ معلوم دیں۔ جب دل شعلوں میں جلتے جلتے ایک انجانی سی لذت محسوس کرنے لگے۔ اور پھر اس سے وہ لذت چھین لی جائے۔ تو بڑی ناخوشگواری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ احساس نہ تو فرحت بیز ہواؤں سے ختم ہو سکتا ہے اور نہ شاداب جھونکوں سے۔ یہ ہوائیں یہ جھونکے اس احساس کو اور زیادہ بھڑکاتے ہیں، اور ان ہواؤں، ان جھونکوں کو ٹھکرا کر دل اپنی انھیں دوزخوں میں جلنا چاہتا ہے۔ جن کے شعلوں نے اسے وہ انجانی سی، اجنبی سی لذت بخشی تھی!

مسعود جمال، ہولڈال میں گھسا نیند کے گہوارے میں جھول رہا تھا۔ نزہت نے اپنا سنہرے رنگوں والا چہرہ سیٹ کے ساتھ والی کھڑکی سے باہر نکال کر دیکھا تو اکتوبر کے نیلے کانچ آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ دور تک کھیتوں میں ہرے مخملیں قالین بچھے ہوئے تھے۔ پل عبور کرنے سے پہلے وہ جو کبھی کبھی ریت کے ٹیلوں کا دور تک چلا گیا سلسلہ دکھلائی پڑ جاتا تھا۔ وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ گرد و غبار دب گیا تھا۔

تو اب ریت کے ٹیلے کبھی دکھلائی نہ پڑیں گے۔ اب گرد و غبار چہرے پر کبھی ریت کی تہیں نہ جمائے گا۔ اب وہ صحراؤں سے اُٹھنے والی آندھیوں کے

ناچتے ہوئے نگوڑوں کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس نے بے حد اداس ہو کر سوچا اور پھر کھڑکی بند کر کے مسعود جمال کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بچوں کے ایسے معصوم چہرے پر نیند کے پُراسرار سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے خوبصورت گھونگروالے بال ابھی تک گھنے تھے۔ اس کے چہرے پر ابھی تک جوانی کی چمک باقی تھی۔ اس کی سنولاہٹ میں ابھی تک سرخی کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس کی گردن دیکھ کر اب بھی خیر پور ٹامیوالی کی نازک نازک صراحیاں یاد آجاتی تھیں۔ اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ اس کے پورے وجود کے خطوط اور نقوش بے حد باقاعدہ اور منظم تھے۔ جیسے ان خطوط اور نقوش کی تراش خراش میں اللہ میاں نے خاص احتیاط برتی ہو۔ اس کی پلکیں اور خوبصورت سیاہ آنکھیں دیکھ کر خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہوتا تھا۔ جیسے وہ ایک غنائی شاعر ہے۔ جو شعر و نغمہ کے شاداب راستے سے بھٹک کر سی۔ ایس۔ پی کی بنجر وادیوں میں نکل آیا ہے۔ جب نزہت کی اُس سے منگنی ہوئی تھی۔ تو وہ سی۔ ایس۔ پی کا امتحان پاس کرنے کے بعد کسی دُور افتادہ ضلع میں ٹریننگ کا عرصہ گزار رہا تھا۔ لیکن جب بھی نزہت کی سہیلیاں اس کے بارے میں کچھ دریافت کرتیں۔ تو وہ فخر سے یہ بتلانے کی بجائے کہ اس کا منگیتر ایک سی۔ ایس۔ پی افسر ہے۔ ہولے سے سرگوشی کے انداز میں کہا کرتی۔ "اس کی شکل تو بالکل شیلے ایسی ہے۔" اس کے اس جواب پر اس کی کوئی چنچل سہیلی جب اونچا کر شیلے کا کوئی شعر پڑھ دیتی تو اس کے چہرے پر گلاب کی کچی کلیوں کی رنگت پھیل جاتی۔ اور اس کا پورا وجود شیلے کی کسی خواب آلود نظم میں ڈھل جاتا۔

اس کے دیکھتے دیکھتے مسعود جمال نے ہولے سے اپنی پلکوں کے پردے

اٹھا دیئے۔ ان پردوں کے عقب میں روشن چراغ عُریاں ہو گئے۔ اور اس کے ہونٹوں کو اسی گہری مسکراہٹ نے ڈھانپ لیا۔ اور اس نے خواب ناک آواز میں نزہت سے کہا۔

"منٹگمری ابھی کافی دور ہے؟"

"ہوں۔"

"تم رات بھر جاگتی رہی ہو؟"

"ہوں۔"

"کیوں؟" اس کی موٹی موٹی آنکھیں پھیل گئیں۔

"بہاولنگر یاد آ رہا ہے۔"

"ہشت۔ اس وقت اس منحوس ضلع کا ذکر نہ کرو۔"

"کیوں۔" کیا اس لیے کہ ع "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے؟"

"اس میں بے آبروئی کی کیا بات ہے۔ کمشنر بھی پاگل ہے اور لوگ بھی پاگل ہیں۔"

نزہت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسعود جمال ہولڈال سے باہر نکل آیا۔ گاڑی چھکا چھک اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ سورج کی چمک تیز ہوتی گئی۔ دھوپ کی کرنیں کٹیلی ہوتی گئیں۔

"ہم دس بج کر بیس منٹ پر منٹگمری پہنچ جائیں گے۔ پہلے سیدھے ڈی۔سی ہاؤس جائیں گے۔ وہاں نہائیں گے، دھوئیں گے۔ میں آفس جا کر چارج لے

لوں گا۔ اس کے بعد تمہارے امی ابو کے ہاں جائیں گے اور پھر ذرا شاپنگ کے لیے چلیں گے۔ بہت عرصے کے بعد شہر میں شاپنگ کرنے کا موقعہ نصیب ہوا ہے۔ وہ ذرا رسالہ دینا مجھے۔"

اس نے رسالہ دے دیا "تم بھی لے لو کوئی رسالہ۔"

"نہیں۔"

"تھک گئی ہو؟" وہ مسکرایا۔

"نہیں۔"

"میکے پہنچنے کی خوشی ہے؟"

جواب میں نزہت نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ مسعود جمال نے رسالہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کتابوں اور دوسرے قسم کے اشتہارات تک پڑھ رہا تھا۔ نزہت جان رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ اتنا کہ اپنی خوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ یہی رسالے وہ بہاول نگر میں بھی پڑھتا تھا۔ لیکن مسرت کی وہ روشنی جو خطِ مطالعہ کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر کبھی نہ بکھری تھی۔ بلکہ بہاول نگر کے قیام کے دوران تو وہ ایک حد تک مطالعے ہی سے گریزاں ہو گیا تھا۔ لیکن اس سمے وہ رسالے کا ایک ایک لفظ پڑھنا چاہ رہا تھا۔ اور اس کی حالت اس بچے کی مانند ہو رہی تھی جو اپنے نئے کھلونوں کی ایک ایک کل سے چند لحظوں میں ہی واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

گاڑی ملتان کے اسٹیشن کو دو گھنٹے ہوئے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اور اب وہ منٹگمری کے گرد و نواح میں داخل ہو رہے تھے۔ مٹیالی اینٹوں والے چھوٹے چھوٹے

گھر ناچتے ہوئے نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ منٹگمری شہر کی نواحی آبادی شروع ہو چکی تھی۔ شہر کے کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیوں میں سے بل کھا کر نکلتا ہوا کثیف دھواں اب فضا میں اٹھتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا بد رنگی ہو گئی تھی۔ اس میں شہر کی مختلف اقسام کی بدبوئیں گھل مل گئی تھیں۔ نزہت نے گھبرا کر ناک کو رومال سے ڈھانپ دیا۔ مسعود جمال نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور کھڑکی میں سے سر نکال کر باہر جھانکنے لگا۔

"بس اب پانچ منٹ تک ہم پہنچ جائیں گے!"

اس نے اپنا فلیٹ سر پر ٹکا لیا۔ ریک میں سے ٹفن باسکٹ اور پھلوں کی ٹوکری نکال کر برتھ پر رکھ دی۔ ہولڈال کو تہہ کر کے باندھ دیا۔ پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے نزہت کو دیکھنے لگا۔ اور اس کے متناسب ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے۔ اب شہر کے ہنگامے کی ملی جلی آوازیں بھی سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں۔ پھیرے والوں کی آوازیں، قلیوں کے لڑنے جھگڑنے اور چھینا جھپٹی کے مناظر، پلیٹ فارم پر چھجے دار ٹوپیاں پہن کر ٹہلنے والے ریلوے افسر، اسٹیشن کے جنگلے کے پرلی طرف تانگوں کی قطاریں، اب سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ تھا، شور تھا، جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو، ایک جھٹکا سا لگا۔ انجن ایک طویل سسکاری لے کر رک گیا۔

"منٹگمری۔" مسعود جمال نے کہا اور پھر دروازے میں لٹک کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ان معززین شہر اور ضلعی افسروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا، جو اس کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے، اور پلیٹ فارم پر ادب سے صف

باندھے کھڑے تھے۔ وہ معززین شہر اور ضلعی افسروں کے جلو میں اسٹیشن کی عمارت کی حدود سے باہر نکل آئے۔ مسعود جمال نے ایک لمحظے کے لیے رُک کر طمانیت کا ایک گہرا سانس لیا۔

"شکر ہے۔" اس نے کہا۔ نزہت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعتاً خوفناک حد تک پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ سامنے سڑک پر ایک آپا دھاپی مچی ہوئی تھی۔ اس شور و غوغا کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد چیرتی ہوئی ٹریفک سپاہی کی سیٹیاں نزہت کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ ایک آرام دہ کار میں بیٹھے ڈی۔ سی۔ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے "شکر ہے، اجاڑ جنگلوں سے نکل کر ایک بستی دنیا میں تو پہنچے۔ بڑے عرصے کے بعد ایک شہر کی خوشبو سونگھی ہے۔" مسعود جمال نے سیٹ کی پُشت پر بڑے اطمینان سے سر ٹکا کر کہا۔ شام ہو رہی تھی۔ شہر کے ہنگامے جاگ رہے تھے، بازاروں میں کھوے سے کھوا چھِل رہا تھا۔ دُکانوں پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔

لوئر باری نہر کا پُل عبور کرنے کے بعد مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے وہ ڈی سی۔ ہاؤس پہنچ گئے۔ اردلی نے ان کا سامان کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی مسعود جمال تو باتھ رُوم میں گھُس گیا اور نزہت نے ایک آرام کرسی میں دھنس کر آنکھیں میچ لیں۔ ساری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے اس کے پپوٹے اس قدر بھاری ہو گئے تھے کہ یوں لگتا تھا، جیسے ان پر سیروں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور خیالات میں کھو گئی۔ تھوڑی دیر بعد مسعود جمال نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد باتھ روم سے نکل آیا۔ وہ اب پہلے سے

کہیں زیادہ مطمئن معلوم ہو رہا تھا۔

"مَیں آفس جا رہا ہوں۔ تم یہ سامان کھول لو اور نہا دھو لو۔ تم شام کی چائے پر میرا انتظار نہ کرنا۔ مجھے شاید دیر ہو جائے۔ البتہ رات کے کھانے کے بعد شاپنگ کرنے ضرور جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے!"

"سو لانگ، ڈارلنگ!"

اور وہ چلا گیا!

اس کے جانے کے بعد وہ آہستہ سے اُٹھی۔ گھنٹی بجا کر اردلی کو بلایا اور ایک ٹرنک، ایک سوٹ کیس اور دو تین ٹوکریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا!

"انہیں لے جاؤ اور باہر برآمدے میں رکھ دو۔ مَیں جاتے ہوئے لے جاؤں گی۔ اور سنو میرے کیے بغیر شام کی چائے لے آنا۔"

"بہت اچھا۔"

بوکھلائے ہوئے اردلی نے سامان اٹھا لیا۔ اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ نزہت کی غزالی آنکھوں سے چند آنسو ٹپکے اور بڑی خاموشی کے ساتھ سُرخ رُخساروں پہ ڈھلک گئے۔ شاید یہ آنسو ایک دھارے کی مانند پھوٹ بہتے، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ رومال سے نم آلود پلکوں کو خشک کیا۔ اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر پھر آرام کرسی میں دھنس گئی۔ اسے اس وقت مکمل سکون کی ضرورت تھی۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ وہ چلا گیا تھا۔ اب سوچنے کے لیے اس کے پاس کافی وقت تھا۔ اب وہ معاملات پہ ذرا ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر سکتی تھی۔

اب اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا تھا۔ جو کئی دنوں سے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پرورش پا رہا تھا۔ اب وہ تمام تلخ باتیں مسعود جمال کے سامنے اگل دینا چاہتی تھی۔ جو بہت دنوں سے اس کے دل و دماغ میں بس گھول رہی تھیں۔ اب وہ اس زہر کی تلخی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ اس کڑواہٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کڑواہٹ میں اپنے وجود کو گھلاتے رہنے سے بہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا پا لیا جائے۔ چھٹکارا جو عارضی نہیں بلکہ دائمی ہو۔ وہ ایک عرصے سے یہ سب کچھ مسعود جمال سے کہہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ان زہر بھرے الفاظ کو آپ ہی آپ کئی بار دہرایا تھا۔ لیکن ان کو کہنے کے خیال سے اس کا دل ڈوبتے سا لگتا تھا۔ نیچے، نیچے، اتھاہ گہرائیوں میں۔ اگر یہ سب کچھ اس سے کہہ دیا گیا، تو وہ کیا کہے گا۔ وہ، جو اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اور جب وہ محبت کے میٹھے رس میں زہر کی بوندیں ٹپکتے دیکھے گا تو اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔

"نہیں، نہیں" وہ کرسی میں دھنسے دھنسے چلا اٹھی۔ وہ ایک انجانے سے خوف سے یوں کانپنے لگی، جیسے کسی جھیل کی سیال، مرتعش سطح پر چاند کا عکس کانپتا ہو۔ اور اس خوف کی لہروں پر بہتی ہوئی وہ بہاول نگر والے بنگلے میں چلی گئی۔ بنگلہ، جس کے عشق پیچاں کی بیلوں میں لپٹے ہوئے صدر دروازے کے باہر ایک سپاہی رائفل تھامے کھڑا رہتا تھا۔ جس کے محرابی دریچوں پر صحرائی پھولوں کی شرمائی شرمائی، لجائی لجائی بیلوں نے گھونگٹ کاڑھ رکھے تھے۔ جس کے اونچے اونچے قدِ آدم دروازوں پر لٹکتے ہوئے ہلکے گلابی پردے، صحرا کی کوکھ سے اٹھ

کر آنے والی آہستہ خرام ہوائیں ہولے ہولے ہلکورے کھایا کرتے تھے۔ جس کے سامنے والے لان میں گلاب کی کچی کلیاں دیہاتی دوشیزاؤں کی طرح اٹھلایا کرتی تھیں۔ اور جس کے عقب سے گزرنے والی سڑک پر سے کوئی منچلا شتر سوار ترنگ میں آکر کوئی گیت الاپتا ہوا گزر جایا کرتا تھا۔ گیت جس میں معصوم دیہات کا الہڑ پن ہوتا تھا۔ جس میں صحرا کی گھمبیرتا اور تپش ہوتی تھی۔ جس میں میٹھے پانیوں والی نہروں کا بہاؤ ہوتا تھا۔ اور جس کے البیلے بول ایک تپش آلودہ ٹھنڈک بن کر سینے میں اُترتے اُترتے چلے جاتے تھے۔

"پھل وکنے آئے وے رانجھنا سوار ہیئے جوڑی
پھل سانوں لے دے وے رانجھنا ماں بہن توں چوری"
"پھل تینوں لے دیاں گانی گودیے.....!"

اور پھر وہ بنگلے کے شفاف برآمدے میں آکر مسعود جمال کی راہ تکنے لگتی۔ یہ اس کے دفتر سے واپس آنے کا وقت ہوتا تھا اور وہ اس احساسِ طمانیت سے آنکھیں موند لیتی کہ مسعود جمال جب آئے گا، تو اپنے کو ایک پُرسکون دنیا میں پائے گا۔ اس کی تکان اُتر جائے گی۔ اس کی زبان جو مقدمات کے فیصلے اور انتظامی احکامات صادر کرتے سوکھ چکی ہو گی۔ اس طویل ٹھنڈے برآمدے میں داخل ہوتے ہی اپنی نوک پر ایک خوابناک پُرسکون اور میٹھی موسیقی کا ذائقہ محسوس کرے گی، اس کے کان جو فریقین کے بیانات اور شکایات سنتے سنتے پک چکے ہوں گے۔ یہاں آکر اس کی ترنم ریز باتیں سنیں گے۔ پھر وہ مسکرا اٹھے گا۔ اس کا رومانی شاعروں ایسا معصوم چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔ اس کی باہیں خود بخود پھیل جائیں گی۔

اور وہ خود بخود اس کی گرم آغوش میں سمٹ جائے گی۔ برآمدے کے پرلی طرف پھولوں پر پانی چھڑکتا ہوا بوڑھا مالی دُزدیدہ نظروں سے ان کو دیکھے گا۔ اس کے سوکھے ہوئے بوڑھے ہونٹوں پر ایک شفیق مسکراہٹ بکھر جائے گی اور پھر وہ باہوں میں باہیں ڈالے طویل برآمدے کے نم آلود سناٹے میں سے سایوں کی طرح گزرتے ہوئے گالی پردوں والے ڈرائنگ روم میں چلے جائیں گے۔ مسعود جمال حسبِ معمول ضد کرے گا کہ کھانا ڈرائنگ روم میں ہی کھایا جائے۔ لیکن وہ اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ڈائیننگ روم میں لے جائے گی۔ وہاں کھانا کھاتے سمے وہ ادب، آرٹ اور موسیقی پر گفتگو کرے گا۔ چھٹی لے کر جنوبی فرانس کے نیلے ساحلوں کی سیر کرنے کا پروگرام بنائے گا۔ کھانا ختم کرکے اس کے گدرائے ہوئے بازو پر ایک بھرپور چٹکی بھرے گا۔ ملازم یہ دیکھ کر صافے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگے گا۔ پھر وہ واپس ڈرائنگ روم میں آجائیں گے۔ وہ پیانو پر کسی البیلے گیت کی دُھن چھیڑ دے گا۔ اور وہ اپنی ممتاز جبیں پر سُروں کی ماہتابی کرنیں بکھرائے موسیقی کے تاج محل میں کھو جائے گی۔

نزہت کو اپنے گھر پر فخر تھا، غرور تھا۔ اگرچہ ایک ایک دو دو سال کے وقفے کے بعد مسعود جمال کی مختلف ضلعوں میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ انھیں ضلع در ضلع ایک اعتبار سے بھٹکنا پڑتا تھا۔ لیکن ہر جگہ نزہت اپنے گھر کو پُرسکون، خوبصورت اور آرام دہ بنا لیتی تھی۔ گھر کی سجاوٹ کے لیے وہ نئے نئے طریقے سوچتی۔ اس نے ایک آرٹسٹ کا ذہن پایا تھا۔ اس کے گھر میں کسی کیوبک تصویر کے خطوط کی ایسی ترتیب اور شفقی رنگوں کا حسین متناسب امتزاج، سجیلا پن

اور سکون ہوتا تھا۔

مسعود جمال کی سانگھڑ سے ضلع بہاول نگر کی ٹرانسفر ہوئی تھی۔ تو کئی دوستوں اور ملنے والوں نے زور دیا تھا کہ ٹرانسفر رکوانے کی کوشش کرو۔ لیکن نزہت نے ان سب لوگوں کی زبردست مخالفت کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ سرکاری ملازم اور جوگی میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ جوگی اپنی سیلانی فطرت سے مجبور ہو کر کسی ایک جگہ ہمیشہ کے لیے ڈیرے نہیں ڈالتا۔ اور سرکاری ملازم اس لیے ہمیشہ کے لیے ایک مقام پر تعینات نہیں رہ سکتا کہ حکومت اسے چند شرائط کے تحت ملازم رکھتی ہے۔ اور ملک کے کسی بھی گوشے میں ٹرانسفر کرنے کی شرط ان میں سے ایک بنیادی شرط ہے۔ آج یا کل سرکاری ملازم کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت کرنی ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ٹرانسفر رکوانے کی کوشش حماقت ہے۔ دوستوں اور ملنے والوں کی جدائی، کچھ عرصے تک شاق گزرے گی۔ پھر نیا ماحول اور نئے لوگ اپنے میں جذب کر لیں گے۔ اور یوں وہ بہاول نگر آ گئے تھے۔

بہاول نگر ایک دور افتادہ اور پُراسرار سا ضلع تھا۔ اس کی سرحدیں ہندوستان کی ریاست بیکانیر سے ملتی تھیں۔ اور یہ سلیمانکی ہیڈ ورکس سے لے کر صحرائے مروٹ کے آخری گوشوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ستلج ویلی پراجیکٹ کے تحت اگرچہ اس ضلع کا غالب حصّہ زرعی کاشت کے قابل بن گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں ریت کے اونچے اونچے ٹیلے، میلوں تک پھیلے ہوئے چٹیل اور بنجر میدان، سرکنڈوں کے گھنے جنگل، سرکیاں بنا کر اپنا پیٹ پالنے والے خانہ بدوش، لمبی لمبی ایالوں والے گھوڑوں پر چڑھ کر

ڈاک کے ڈاک لینے والے دُبلے پتلے لیکن دلبر ڈاکو، تیز رفتار ڈاچیوں پر میلوں کا صحرائی سفر طے کرنے والے "لاڑ[1]" اب بھی اس دَور کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ جب یہ ضلع لق و دق ریتیلے صحرا کا حصّہ تھا۔ جنوب کی طرف اس ضلع کا آخری قصبہ فورٹ عباس تھا۔ یہ قصبہ ریت کے مہیب ٹیلوں کے درمیان آباد تھا۔ اس کے چاروں طرف چار چار میل تک ریت کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کے بعد شاداب کھیتوں اور ہنستے بستے گاؤں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جو ہندوستان کی سرحد پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ بہاول نگر شہر سے (جو ضلع کا صدر مقام تھا اور جس کے نام پر ضلع کا نام رکھا گیا تھا) ریل کی ایک برانچ لائن فورٹ عباس تک جاتی تھی۔ اس لائن پر پورے دن میں صرف دو گاڑیاں چلتی تھیں۔ جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ناکارہ ترین انجنوں اور ڈبوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس لائن پر چلنے والی ان گاڑیوں کی اوسط رفتار دس میل فی گھنٹہ ہوتی تھی۔ اس لائن پر بہاولنگر شہر سے تیس میل کے فاصلے پر ہارون آباد کا قصبہ آباد تھا۔ یہ قصبہ پورے ضلع کا حسین ترین اور سب سے زیادہ بارونق قصبہ تھا۔ دراصل ہارون آباد کے گرد و نواح میں گندم، کپاس اور گنّے کی کاشت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی، کہ اس کی تجارتی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ یہاں کی غلّہ منڈی مغربی پاکستان کی سب سے بڑی غلّہ منڈی تھی۔ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے گاؤں بے حد آباد اور خوشحال تھے۔ یہاں کی خوبصورت مستعد اور فعّال میونسپل کمیٹی، جس کا آدھے سے زیادہ اسٹاف خوش گو شاعروں پر مشتمل تھا

---

[1] ایک قدیم صحرائی قوم جو اب تک بہاولنگر کے ضلع میں آباد ہے۔

یہاں کے چوڑے چکلے، صاف ستھرے بازار جہاں رونقیں جاگتی اور ہمہمے انگڑائیاں لیتے تھے۔ یہاں کی سیدھی سادی معصوم معصوم سی گلیاں جہاں مکانوں کے دریچے گداز چہروں سے آباد رہتے تھے۔ یہاں کی وسیع و عریض چمکتی ہوئی سڑکیں جو دور دراز دیہاتوں سے آئی ہوئی کسان لڑکیوں کی چوڑیوں کے چھناکوں کی امین تھیں۔ یہاں کی چھوٹی سی "ہارون کلب" جہاں خوش اخلاق شہری، افسر اور پڑھے لکھے زمیندار گئی شام تک گیس کے ہنڈے جلا کر ٹینس کھیلتے اور تاش کی بازیاں بدتے تھے۔ غرضیکہ اس قصبے کی ایک ایک چیز سے نزہت کو گویا پیار ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی دورے پر مسعود جمال کے ساتھ اس علاقے میں آتی تو اسے تین چار دن یہاں ٹھہرنے پر ضرور مجبور کرتی۔ فور آر (R-4) نہر کے پرلی طرف، راؤ حفیظ کے گاؤں کے قریب کھیتوں کے درمیان شیشم اور شریں کے اونچے اونچے گہرے سبز اور گھنے درختوں سے گھرا ہوا ایک کینال ریسٹ ہاؤس تھا۔ جو باسٹھ ہزار بنگلے کے نام سے مشہور تھا۔ باسٹھ ہزار فور آر (R/4) نہر کی ایک برجی کا نمبر تھا۔ جو نہری سڑک کے کنارے پر ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی نصب تھی۔ وہ جب بھی ہارون آباد آتے تو عموماً اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا کرتے تھے۔ یہاں قیام کے دوران میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام ہارون کلب کے لان میں ایک نہ ایک مشاعرہ ان کے اعزاز میں ضرور منعقد ہوتا۔ جس کی صدارت مسعود جمال کرتا تھا۔ اور جس میں میونسپل کمیٹی کے تقریباً تمام ملازمین اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ میونسپل کمیٹی کے یہ شاعر ملازمین اپنی شکلوں اور اپنے اشعار کے اعتبار سے بڑی عجوبہ روزگار قسم کی ہستیاں تھے۔ ان کا سرغنہ ایک

ایسا شاعر تھا۔ جس کا عارفانہ کلام فن کی ناقدرشناسی کے سبب ابھی تک کسی اچھے رسالے میں بار نہ پاسکا تھا۔ اور نہ ہی اس کی آیندہ کوئی امید تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ان "میونسپلٹی" شاگردوں میں بڑا ہردلعزیز تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کے عارفانہ کلام کی اشاعت کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ تو اپنے شاگردوں سے چندہ اکٹھا کر کے اس نے ایک مجموعہ شائع کیا جس کے سرورق کا کاغذ غالباً کاغذ کی ان اقسام سے تعلق رکھتا تھا، جو دنیا میں پہلی بار بطور تجربہ ملک چین میں تیار کی گئی تھیں۔ اس دھان پان سے مجموعے میں اس کے شاگردوں کی تو شاید ایک ایک دو دو چیزیں شامل تھیں اور وہ بھی چندے کے طفیل، لیکن اس کی اپنی کم وبیش چھ عدد عارفانہ تخلیقات اس مجموعے کی زینت تھیں۔ اس کے بعد اس نے مشاعروں کا اتنا طویل چکر چلایا تھا کہ ہارون آباد والوں کا دم محض ناک میں ہی نہیں بلکہ ناک کے آخری سروں تک آگیا تھا۔ اور وہ اپنی ناکوں کو ڈھانپے رہتے تھے کہ سانس کہیں زیادہ تنگ آکر موقعہ پاتے ہی نکل نہ بھاگے۔ چنانچہ ہارون آباد کے قیام کے دوران جب کسی شام وہ شاعر مشاعرے کی اطلاع دینے اور مسعود جمال سے صدارت کی منظوری حاصل کرنے ریسٹ ہاؤس آنکلتا تو زینت جلدی سے اندر بھاگ جاتی اور بیٹری سیل والا ریڈیو پوری آواز سے لگا دیتی۔ پھر تھوڑی دیر بعد مسعود جمال تو جھنجلاتا ہوا مشاعرے کی صدارت کرنے چلا جاتا اور وہ کتنی دیر تک باہر لان میں بیٹھی شب کی پُراسرار تنہائیوں میں شاخوں اور پتیوں کا، کبھی دھیما اور کبھی تیز رقص دیکھا کرتی۔ گرم صحرائی ہوا کے جھونکے اس کے اوپر سے تیرتے

ہوئے گزرتے رہتے۔ سن، سان، سر، سر، تم کس کی اور جارہے ہو، صحرا کی آوارہ ہواؤں کے گرم جھونکو! تمہیں کس نے بلایا ہے؟ اس کے رگِ گل کے ایسے باریک ہونٹ استفہامیہ انداز میں کھلنے کو ہی ہوتے کہ پاں، پاں، پوں اور موٹر کی ہیڈ لائیٹیں اس کی آنکھوں کو چندھیا دیتیں۔

"بیڑا غرق کر دیا ان لوگوں نے تو میرے ذہن کا۔ ایسے ایسے شعر سنائے ہیں کہ دل و دماغ کی چولیں ہلا ڈالی ہیں۔" مسعود جمال موٹر سے اترتے ہوئے کہتا۔

نزہت چڑ جاتی۔

"جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ یہ لوگ شعروں کا جھٹکا کرتے ہیں۔ پھر کیوں ان کے مشاعروں کی صدارت کرتے ہو؟" وہ کمبخت مکھی مار کر مونچھوں والا شاعر......" مسعود جمال نکٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے ہولے سے ادھورا جواب دیتا۔ پھر کوئی قصہ چھیڑ دیتا۔ اور بات ٹل جاتی۔

اسی ہارون آباد کے مغرب میں تین چار میل کے فاصلے پر ایک اور نہر تھی۔ جو تھری آر (3/R) نہر کہلاتی تھی۔ دراصل ہارون آباد کا قصبہ فور آر (4/R) نہر اور تھری آر (3/R) نہر کے درمیان واقع تھا۔ تھری آر (3/R) نہر پر بھی ایک ریسٹ ہاؤس تھا۔ جو قاضی والا ریسٹ ہاؤس کے نام سے مشہور تھا۔ قاضی والا ریسٹ ہاؤس کے مشرقی جانب اگر چار میل تک نہر کے کنارے کنارے چلتے چلے جائیں تو ایک بڑا پُر اسرار سا گاؤں آتا تھا۔ جس کا نام "پکا" تھا۔ تمام لوگ اسے "پیروں کا پکا" کہا کرتے تھے۔ دراصل اس گاؤں کے مالک گدی نشین پیر تھے۔ جو اپنے کو آلِ رسولؐ بتاتے تھے۔ اس گاؤں میں ان

پیروں کے تین خاندان آباد تھے۔ یہ خاندان دراصل ایک باپ کے مختلف بیٹوں کی اولاد تھے اُن میں سے دو خاندان تو روائتی پیروں ایسی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا کام اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ مریدوں سے نذرانے جمع کرتے تھے۔ سال کی نوجوان لڑکیوں سے رات کی تنہائیوں میں اپنے بستر سجاتے تھے۔ قوالیاں اور مجرے کرواتے تھے۔ چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنے ہاں پناہ دیتے اور ان سے آس پاس کے گاؤں میں چوریاں کرواتے تھے، اور پھر دن کے اجالوں میں پگڑیوں کے اونچے اونچے طرّے لہراتے ہوئے اپنے مریدوں کے حلقے میں بیٹھ کر انھیں اسلام کی مختلف تعلیمات سے آگاہی بخشا کرتے تھے۔ لیکن ان پیروں کا ایک خاندان شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس خاندان کے افراد اپنی تمام تر توجہ زمینداری کے انتظام و انصرام کی طرف مبذول رکھتے تھے۔ ظاہر بات تھی کہ اس صورت میں دوسرے دو خاندان ان لوگوں سے کیسے نباہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس خاندان کو زک پہنچانے کی تاک میں رہتے اور جب بھی موقع ملتا، وار کرنے سے نہ چوکتے۔ چنانچہ "پکا" پر پولیس والے بڑی عنایت کی نظر رکھتے تھے۔ اور ان خاندانوں کے باہمی لڑائی جھگڑے کی وجہ سے ان کا اُلّو ہمیشہ سیدھا رہتا تھا۔ وہ خاندان جو بیچارہ سیدھی سادی و شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا، ہر اعتبار سے مظلوم تھا۔ اس کی کھڑی فصلوں میں آگ لگا دی جاتی تھی۔ ان کے ڈھور ڈنگروں کو مار دیا جاتا تھا۔ ان کے مزارعوں کو مختلف متشددانہ دھمکیاں دے کر ان کا عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ افرادِ خاندان پر قاتلانہ حملے کئے جاتے تھے۔ غرضیکہ ان کا جینا دوبھر کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بیچارے خوش رہتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اور ان کی طرف سے اب تک کوئی انتقامی کاروائی نہیں ہوئی تھی۔

اس مظلوم خاندان کا سربراہ ایک تیس پینتیس سال کا نوجوان تھا۔ اس کا نام صاحبزادہ احمد شاہ تھا۔ یہ مسعود جمال کا بڑا گہرا دوست تھا۔ لیکن اس کی دوستی غرض مندی اور مطلب پرستی سے کہیں بالا تھی۔ اس نے مسعود جمال سے بحیثیت ڈپٹی کمشنر کے اپنا یا دوسرے کا کبھی کوئی کام نہ نکلوایا تھا۔ وہ کبھی اس کے پاس کوئی سفارش نہیں لایا تھا۔ اس نے اپنے رشتے دار دو خاندانوں کے مقابلے کے لیے یا ان کو زک پہنچانے کے لیے کبھی مسعود جمال سے مدد نہ چاہی تھی۔ غرضیکہ وہ بس دوست ہی تھا۔ اور ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے اپنے ان دوستانہ تعلقات سے اس نے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ جب بھی بہاول نگر آتا تھا مسعود جمال کے ہاں ہی ٹھہرتا تھا۔ وہ صرف مسعود جمال کا دوست ہی نہیں، بلکہ زہرہ بھی اسے پسند کرتی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سُرخی مائل تھا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ بھیگا بھیگا سا رہتا تھا، جیسے ابھی ابھی نہا کر آیا ہو۔ سَر کے بال چھدرے چھدرے اور گہرے سیاہ تھے۔ وہ قطعی اَن پڑھ تھا۔ لیکن بے حد خوش مزاج اور زندہ دل۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ ہر سمے مسکراتے رہتے تھے۔ اور چھوٹی چھوٹی، بٹن نما آنکھوں کے عقب میں ہر وقت جیسے موم بتیاں سی فروزاں رہتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے ہونٹ سسکیوں سے نا آشنا ہیں۔ اور آنکھیں، ان آنکھوں نے تو غالباً رونا سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ مسعود جمال کا نجانے کیسے دوست بن گیا تھا۔ حالانکہ مسعود جمال اپنے ضلع میں قطعی ہر دلعزیز اور مقبول نہ تھا۔ ضلع کے لوگ نہ صرف اس سے خوف کھاتے تھے، بلکہ ایک حد تک اس سے نفرت بھی کرتے تھے۔ اس کی بد دماغی اور بدعنوانیوں کے بارے میں پورے ضلع میں عجیب و غریب قسم کی افواہیں گشت

کیا کرتی تھیں۔ اس بارے میں ایک دو بار ڈویژنل کمشنر نے بھی اپنی گفتگو میں سرسری اشارے کیے تھے۔ لیکن مسعود جمال کا خیال تھا کہ کمشنر بہت تنگ نظر شخص ہے۔ اور ذہنی اعتبار سے بھی اس سے کہیں کمتر ہے۔ اس نے ایک بار تو کمشنر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جناب مَیں نے آپ سے کہیں زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ مَیں آرٹ کو بھی آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ضلع کے اَن پڑھ، تنگ خیال اور جاہل عوام مجھے اچھا نہیں سمجھتے تو آپ کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری قابلیت پر شبہ کریں۔" اور کمشنر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔ یہ بات نزہت کے سامنے ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے بھی اس کو محسوس کیا تھا۔ اور کھانے پر مسعود جمال کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن اس نے جواب دیا۔ "ذہنی طور پر مَیں ان سب لوگوں سے اونچا ہوں۔ اس لیے یہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ مَیں محض ان لوگوں کے لیے اپنے ذہن کو اِن کی سطح پر نہیں لا سکتا۔"

ان تمام باتوں کے پیش نظر نزہت حیران تھی، کہ صاحبزادہ احمد شاہ جو قطعی جاہل تھا۔ مسعود جمال کا دوست کیسے بن گیا۔ پورے ضلع میں صرف ایک وہی شخص تھا جو دل سے مسعود جمال کی تعریف کرتا تھا اور اسے پسند کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

"اگر بد دماغی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی مسعود صاحب میں ہے۔ تو اللہ ہر شخص کو بد دماغ بنا دے۔" یہ خوشامد تو ہرگز نہیں تھی۔ چونکہ نزہت جانتی تھی کہ احمد شاہ کو اگر خوشامد کرنا ہی مقصود ہوتی۔ تو وہ اس سے بہتر طریقے استعمال کر سکتا تھا۔ جو کہ اس نے کبھی استعمال نہیں کیے تھے۔ اس کی بھی بے لوث دوستی تھی۔ کہ اُس وقت تک

نزہت کے ذہن میں اپنے شوہر کی طرف سے کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور اگر ہوئی بھی تھی تو یقین کے درجے تک نہ پہنچنے پائی تھی۔ لیکن اب وہ مرگیا تھا۔ صاحبزادہ احمد شاہ مرگیا تھا۔

اور تب منٹگمری کے اس ڈی۔سی۔ ہاؤس کے نیم خنک کمرے کی مدھم تاریکی میں نزہت نے خوف کے مارے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ باہر شہر پر شام کے فرشتوں کا نزول ہو رہا تھا۔ لیکن کمرے میں ابھی سے رات کا سماں تھا اور صاحبزادہ احمد شاہ کی موت کے خیال نے اس کے جسم کو کپکپا دیا تھا۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر آنکھیں بھیچ لیں — بند آنکھوں کے سامنے بھی خوف کے بھوتوں کا رقص جاری رہا۔ اور اسے ہارون آباد کے باسٹھ ہزار ریسٹ ہاؤس میں پناہ لینا پڑی۔

وہ دو دن کے دورے پر ہارون آباد آئے ہوئے تھے۔ ہارون آباد کے گردو نواح میں جرائم بہت بڑھ گئے تھے۔ قتل کی وارداتیں عام ہوگئی تھیں۔ چنانچہ باسٹھ ہزار بنگلے کے لان میں، مسعود جمالی ہارون آباد کے ایس۔ایچ۔او سے تند و تلخ لہجے میں گفتگو کرتا رہتا تھا۔ چونکہ جرائم کی زیادتی کی وجہ سے اخبارات اس پر بڑی لے دے کر رہے تھے۔ اور اس کا ضلع بدنام ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مکھی مار کٹ مونچھوں والا شاعر بھی دانت نکوستا ہوا آجاتا تھا۔ اور موقعہ ملنے پر اپنا کوئی نہ کوئی شعر سنانے سے نہ چوکتا تھا۔ مسعود جمالی کے دورے کا پروگرام تو دو دن کا تھا۔ لیکن علاقے کی غیر معمولی صورتِ حال کی وجہ سے اس نے ہارون آباد میں اپنے قیام کی مدت بڑھا دی۔ دو ایک بار وہ تھانیدار اور پولیس کے کچھ

سپاہیوں کے ہمراہ چند بدنام گاؤں کے معائنے کے لیے بھی گیا۔ تاکہ صورتِ حال کا اندازہ لگا سکے۔ ایک شام وہ معائنے سے لوٹ کر آیا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ اگلے دن اس نے مکمل آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور سلیپنگ گاؤن پہن کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چپڑاسی آیا۔

"جناب! پکے سے صاحبزادہ صاحب آئے ہیں۔"

"بلا لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد صاحبزادہ احمد شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ ہلدی کا ایسا پیلا ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں جو ہمیشہ مسکرایا کرتی تھیں، خوف کی سیاہ لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔

"آیئے صاحبزادہ صاحب۔ کہیے طبیعت کیسی ہے؟" مسعود جمال نے پوچھا۔

"بس جی دعا ہے، آپ کی۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اور کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں نزہت بھی آگئی۔ احمد شاہ کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ایک لحظے کے لیے دروازے میں رکی۔ اور پھر آگے بڑھ آئی۔ احمد شاہ اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہیے بھائی صاحب طبیعت کچھ ناساز ہے کیا۔ بیٹھیے نا آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟" نزہت نے جلدی سے کہا۔

"بس جی دعا ہے آپ کی۔"

"پھر بھی بات کیا ہے۔ آج آپ بہت اداس دکھائی دے رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں جی بات کیا ہونی تھی۔ آپ جانتی ہیں خاندانی جھگڑے جب حد سے بڑھ جائیں تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"آہو جی۔ یوں تو خیر ہی ہے۔ لیکن آج کل میرے دونوں بھائی ذرا زیادہ بگڑے ہوئے ہیں۔ مَیں بھی جی آخر بندہ بشر ہوں نا۔ بھائیوں سے لڑائی وغیرہ سے طبیعت ذرا ڈھیلی ہو گئی ہے۔"

مسعود جمال اور نزہت کو معاملات کا تو پہلے سے ہی علم تھا۔ لیکن آج سے قبل احمد شاہ نے کبھی ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کے تایا اور چچا زاد بھائی اس سے برسرِ پیکار ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اس کے ماتھے پر کبھی ایک شکن تک نہ دیکھی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ کبھی اداس نہ دکھلائی دیا تھا۔ لیکن آج احمد شاہ جیسے ٹوٹ سا گیا تھا۔ مسعود جمال اور نزہت دونوں نے اپنی اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کہ اس بار صاحبزادہ احمد شاہ غیر معمولی حالات سے دوچار ہے۔

"آپ کی بیوی کہاں ہیں صاحبزادہ صاحب؟" ایک انجانے اندیشے کے تحت نزہت نے دریافت کیا۔

"یہیں گاؤں میں ہی ہے۔" احمد شاہ نے جواب دیا۔

"اللہ نہ کرے۔" نزہت ہولے سے بڑبڑائی۔

"جی مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟" احمد شاہ نے پوچھا۔

"نہیں تو۔ مَیں تو یونہی نجانے کیا کہہ رہی تھی۔" نزہت بولا گئی۔

اس کے بعد احمد شاہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے اٹھنے اور جانے کے انداز سے کچھ ایسے اضطراب کا اظہار ہوا تھا کہ مسعود جمال اور نزہت میں سے کوئی بھی اسے ٹھہرنے یا رکنے کے لیے نہ کہہ سکا۔

کچھ دیر وہ دونوں بے جان پتھروں کی مانند خاموش بیٹھے رہے۔ چند اذیت رساں لمحے ایک انجانی سی تکلیف دہ سرسراہٹ کے ساتھ ان کے اوپر سے تیرتے ہوئے گزر گئے۔

"میرے خیال میں احمد شاہ کے معاملات بے حد خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں، حتیٰ کہ اب اس کے اپنے بس میں کچھ نہیں رہا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ آج اس کے چہرے پر میں نے موت کی زردی کھنڈی دیکھی تھی۔ اللہ اپنا رحم کرے"۔ نزہت نے معاً چونکتے ہوئے گڑبڑا کر مسعود جمال سے کہا۔

"ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ احمد شاہ بہت عقلمند اور دلیر آدمی ہے۔ وہ ان تمام خطرناک حالات سے بخوبی خود نپٹ لے گا۔ باقی رہا یہ اندیشہ کہ وہ اسے قتل کر دیں گے۔ تو یہ اندیشہ بھی بے بنیاد ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ احمد شاہ میرا دوست ہے۔ وہ اکیلا نہیں۔ اسے حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ اس کی جان لینے کی جرأت نہیں کر سکتے"۔

مسعود جمال مسکرایا۔ "احمد شاہ لوہے کے ہاتھوں کی حفاظت میں ہے"۔

باہر شام کے مٹیالے سائے، رات کی گہری ہوتی ہوئی سیاہیوں میں مدغم ہو رہے تھے۔ مسعود جمال کچھ دیر ریسٹ ہاؤس کے باہر لان میں ٹہلتا رہا۔ اور پھر رات کا کھانا کھا کر سونے کے لیے چلا گیا۔ اگلے دن اسے بہت کام کرنا تھا۔

علی الصبح اُٹھ کر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے سول ہسپتال اور تھانے کا معائنہ کرنا تھا۔ کئی درخواستوں پر فیصلے دینا تھے۔ پھر کچھ گاؤں اور سرحدی علاقے کا ہنگامی دورہ کرنا تھا۔ غرضیکہ کام کا اتنا ہجوم تھا کہ کل گئی رات تک ختم ہونے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ آج جلدی ہی سو گیا تھا۔

اگلے دن وہ سویرے ہی بیدار ہو گیا۔ شیو وغیرہ بنا کر وہ نزہت کے ہمراہ ناشتے کی میز پر آکر بیٹھا ہی تھا، کہ باہر ایک شور برپا ہو گیا۔ پھر بھاری بوٹوں کی دھمک اور کچھ لوگوں کے رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔

"کیا مصیبت ہے؟" مسعود جمال جلدی سے کرسی سے اٹھا۔ اور برآمدے میں آگیا۔ نزہت بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ پرلے لان کے قریب کئی کسان جمع تھے۔ جو اپنی میلی پگڑیوں کے پلوؤں سے بار بار اپنی آنکھیں خشک کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے قریب پولیس کے چھ سات سپاہیوں کا جمگھٹا تھا۔ یہ سپاہی تعداد میں پانچ سے زیادہ نہیں تھے۔ ان سپاہیوں کے عقب میں ہارون آباد کے سول ہسپتال کا نوجوان میڈیکل آفیسر کھڑا تھا۔ اس نے سفید قمیض اور خاکی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ وہ رہ رہ کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ سوائے اس میڈیکل آفیسر کے سب لوگ شور مچا رہے تھے۔ بلکہ کسانوں میں سے کچھ آدمی تو عورتوں کی طرح بَین کر رہے تھے۔

"ہائے اوئے، توں تے ساڈا مائی باپ ہی۔ توں سانوں چھڈ کے کدھر چلا گیا۔"

"کیا بات ہے۔ اوئے کی گل اے؟" مسعود جمال نے چلا کر پوچھا۔

دو تین کسانوں نے بیک وقت چلا کر اس کے سوال کا جواب دیا۔ جسے مسعود جمال نہ سمجھ سکا۔

"مجھے نہیں سمجھ آئی، ایک آدمی جواب دے۔" مسعود جمال ایک بار پھر حلق کا پورا زور صرف کر کے چلایا۔ اس پر میڈیکل افسر نے چونک کر اس کی اور دیکھا اور ہجوم کو چیرتا ہوا مختلف لوگوں کو ایک طرف دھکیلتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ پولیس کے سپاہی بھی اب چوکنے ہو چکے تھے۔ اور انہوں نے کسانوں کے ہجوم کو ایک طرف ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ جب یہ لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے تو مسعود جمال کی نظر سامنے والے لان پر پڑی۔ وہ بے اختیارانہ لان کی طرف بھاگا۔ اور وہاں پہنچ کر ایک لحظے کے لیے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ اور ہونٹ جو خشک ہو چکے تھے، کپکپانے لگے۔ اس کے سامنے بان کی ایک کھُرّی چارپائی پر خون آلود چادر میں لپٹا ہوا صاحبزادہ احمد شاہ کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کا بایاں حصہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ قمیض بھی سرخ سرخ لہو سے بھیگ گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے جسم کو خون کے دریا میں غوطے دیئے گئے ہوں۔ لیکن مسعود جمال کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اس نے میڈیکل افسر کو کہتے سُنا۔

"سانسیں ابھی چل رہی ہیں۔"

اور اس کی انگلیاں جلدی سے احمد شاہ کی نبضوں کو ٹٹولنے لگیں، جو بڑے بے معلوم انداز میں چل رہی تھیں۔ اور لحظہ بہ لحظہ ڈوبتی جا رہی تھیں۔ کسانوں کا ہجوم ان کے چاروں طرف جمع ہو گیا۔ لاش میں ایک غیر محسوس سی حرکت پیدا ہوئی۔

اور موت آسا بیہوشی کے عالم میں یہ الفاظ اس کے لہو میں لت پت ہونٹوں سے لڑھک گئے۔

"میرے..... بیوی ..... بچے..... بچاؤ..." اور ساتھ ہی وہ باریک سا پردہ بھی ہمیشہ کے لیے پھٹ گیا۔ جو اب تک احمد شاہ کی زندگی اور موت کے مابین حائل تھا۔ کسانوں کے ہجوم سے یکبارگی کلمہ شہادت کی ٹوٹی ہوئی صدا اٹھی اور پھر ان کے بین شدت اختیار کر گئے۔

"او ئے کتھے چلیا ایں، سانوں چھڈ کے، اوئے پیر اموتیاں والیا"

"مسعود جمال نے آنسوؤں کو رومال میں جذب کر لیا۔ نزہت جو برآمدے میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی۔ یہ ہولناک منظر نہ برداشت کر سکی اور بُری طرح روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ریسٹ ہاؤس کے ڈرائینگ روم میں میڈیکل آفیسر مسعود جمال کو بتا رہا تھا۔

"جب یہ لوگ احمد شاہ کو ہسپتال میں لائے تو شدید چوٹوں کے باوجود وہ ہوش میں تھا۔ میں نے اسے کورامائین اور گلوکوس کے تین چار انجکشن دیئے۔ اس سے اس کی حالت اور سنبھل گئی۔ لیکن میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس کا ایک گھنٹے سے زیادہ زندہ رہنا محال ہے۔ اور یہ بات غالباً وہ خود بھی جان رہا تھا۔ چنانچہ اسی کے بار بار کہنے پر اسی حالت میں اسے یہاں آپ کے پاس لانا پڑا۔ وہ آخری بار آپ سے ملنا چاہتا تھا۔"

یہ سُن کر نزہت کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان پھوٹ بہا۔ اس کی

نگاہوں کے سامنے صاحبزادہ احمد شاہ کی بیوی کی تصویر گھوم رہی تھی۔ وہ بھولی بھالی سی دیہاتی لڑکی جو دو پیارے پیارے بچوں کی ماں تھی۔ جس نے زیر لب کوئی دیہاتی گیت گنگناتے ہوئے اس کے لیے مکئی کی روٹیاں پکائی تھیں۔ شرما شرما کر اپنے شوہر احمد شاہ کی باتیں کی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ حالانکہ شادی کو چار سال گزر چکے ہیں، لیکن احمد شاہ اس سے بے حد لاڈ کرتا ہے۔ ہر چھوٹے چھوٹے تہوار پر اسے رنگ برنگی چوڑیاں لا کر دیتا ہے۔ اور عید، بقرعید پر تو خاص طور پر اس کی گوری گوری کلائیوں کا "میچا" لے کر بہاولنگر جاتا ہے۔ اور اس کے لیے سونے کے کنگن بنوا کر لاتا ہے۔ ہائے! ان درندوں نے۔ اس بیچاری کا کیا کیا حشر ہوگا۔ کیا اس کے ان پیارے پیارے معصوم بچوں کو لاٹھیوں سے مارتے ہوئے ان کا دل نہ کانپا ہوگا۔ اُف! جب ان بے گناہ جانوں پر لاٹھیاں برسی ہوں گی۔ تو انھوں نے کس حسرت سے اپنے باپ کو پکارا ہوگا۔ اس بھولی بھالی دیہاتی لڑکی نے کس درد سے اپنے سہاگ کو آواز دی ہوگی۔ باپ سہاگ، جوان کے پکارنے اور آواز دینے سے پہلے ہی لہو کے دریا میں ڈوب چکا ہے۔ نزہت روتے روتے بڑی طرح کانپ گئی۔ اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں مسعود جمال سے کہا۔

"جلدی کرو۔ نجانے احمد شاہ کی بیوی اور بچوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ جلدی کچھ کرو۔ خود جاؤ۔ اگر دیر ہوگئی تو اس بے گناہ لڑکی اور بچوں کا خون ہمارے سر ہوگا۔"

مسعود جمال تو بولایا ہوا تھا۔ اس کی عقل جواب دے رہی تھی۔ نہ کچھ

بھی ہوا تھا۔ اس کے فہم سے بالا تھا۔ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ لیکن نزہت کی ٹوٹی ہوئی آواز نے اس کو گویا نئی زندگی دے دی۔ خون جو رگوں میں جم چکا تھا، تپش پا کر پھر محوِ گردش ہوگیا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور باہر برآمدے میں آگیا۔ میڈیکل آفیسر اور نزہت بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ لان میں چارپائی کے اردگرد بیٹھے ہوئے غمزدہ کسان بار بار خون آلودہ چادر ہٹا کر احمد شاہ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اور پاگلوں کی طرح روتے ہوئے بدستور بَین کرنے میں مصروف تھے۔

"اوئے کیتھے چلیا ایں سانوں چھڈ کے۔ اوئے پیرا موتیاں والیا!"

مسعود جمال کو دیکھ کر باہم چہ میگوئیاں کرتے ہوئے پولیس کے سپاہیوں نے اٹینشن ہو کر سلیوٹ کیا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد مسعود جمال میڈیکل آفیسر سے کہہ رہا تھا۔

"آپ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال لے جائیے۔"

پھر اس نے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ لوگ لاش کے ساتھ جائیے۔ اور تھانیدار صاحب سے کہیئے کہ وہ خود ایک جیپ اور تمام مسلح سپاہیوں کو لے کر جلدی سے یہاں پہنچ جائیں۔ چلیئے، جلیئے، جائیے۔ دیر نہیں ہونی چاہیئے۔"

پھر وہ اور نزہت دیر تک برآمدے میں کھڑے سپاہیوں، روتے ہوئے کسانوں، میڈیکل آفیسر اور احمد شاہ کی لاش کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اور وہ خاموش تھے۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی

صحرائی ہوا نے درختوں کی ٹہنیوں اور شاخوں میں اُلجھ کر ایک المیہ راگ چھیڑ دیا تھا۔

"گھرر، گھرر، گھوں، گھوں، گھوں، گھرر۔"

"جیپ آ رہی ہے غالباً۔" نزہت نے بے تاب ہو کر کہا۔

"ہوں۔"

اور چند منٹ بعد جیپ جو پولیس کے مسلح سپاہیوں سے لدی ہوئی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کا بڑا گیٹ عبور کر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ تھانیدار اُچھل کر جیپ سے اُترا اور سیلوٹ کرنے کے بعد مسعود جمال کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"ایمونیشن پورا ہے۔" مسعود جمال نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"سپاہی کتنے ہیں؟"

"جی بیس سپاہی ہیں۔ میں بموجب حکم تھانے کے تمام سپاہیوں کو لے آیا ہوں۔"

"ہم "پکے" کتنے عرصہ تک پہنچ جائیں گے؟"

"زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ لگے گا جناب۔"

اور مسعود جمال جیپ میں سوار ہونے ہی کو تھا کہ بڑے گیٹ سے دو سائیکل سوار ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوتے دکھائی دیئے۔ وہ جلدی جلدی پیڈل گھما رہے تھے۔ جیپ کے قریب پہنچ کر وہ سائیکلوں سے

اتر گئے۔ اور پسینہ خشک کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نہایت خوفناک قسم کا آدمی تھا۔ اس نے قرمزی رنگ کی ایک دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ جس کے لمبے لمبے لڑ زمین پر جھاڑو سی دے رہے تھے۔ اس کی پگڑی کا اونچا طرّہ ہوا میں جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک دار اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھاری چہرے کے نقوش، ترشی ہوئی لیکن گھنی داڑھی میں چھپے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ بڑے بد وضع اور بڑے موٹے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہونٹوں کی جگہ گوشت کے بھاری لوتھڑے لٹکا دیئے گئے ہیں۔ اور دوسرا شخص ...... نزہت کو یہ دیکھ کر آگ ہی تو لگ گئی کہ دوسرا شخص وہی مکھی مار کہ مونچھوں والا شاعر تھا۔ جس کی اول جلول شکل کو معرفت اور شعریت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

"اگر یہ کمبخت اِس وقت نہ آتا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑتی" نزہت جل کر زیرِ لب بڑبڑائی۔

"حضور ایک تازہ قطعہ عرض ہے۔" مکھی مار کہ مونچھوں والے شاعر نے مسعود جمال سے مخاطب ہو کر آداب بجالاتے ہوئے کہا۔

"عزیزی صاحب اس وقت میں مصروف ہوں" مسعود جمال نے بڑی ملائمیت سے جواب دیا۔

"حضور یہ تازہ قطعہ اسی مصروفیت کے بارے میں ہے" اس نے دانت نکوس دیئے۔

مسعود جمال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو پھر سنا ڈالیئے۔"

"جی نہیں حضور وہ قطعہ اکیلے ہیں سنانے کے قابل ہے۔ چونکہ وہ صرف آپ کے لیے ہے۔" مکھی مارکہ مونچھوں والے شاعر نے ایک بار پھر اپنے لمبے لمبے دانت عریاں کرتے ہوئے کہا۔

اس پر مسعود جمال نے رک کر ایک لمحظے کے لیے کچھ سوچا۔ اور پھر نزہت کی حیرانی اور غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ جیسے جادو کے تار سے بندھا، مکھی مارکہ مونچھوں والے شاعر کی طرف کھینچتا چلا گیا۔ وہ اسے ذرا پرے لے گیا۔ وہ قریباً بیس منٹ تک آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ اس عرصے میں وہ خوفناک قسم کا شخص جو مکھی مارکہ مونچھوں والے شاعر کے ہمراہ آیا تھا۔ تھانیدار کو ایک طرف لے جا کر اس سے سرگوشیوں کے انداز میں گفتگو کرتا رہا۔ نزہت نے تلملا کر ایک بار پھر مسعود جمال کی جانب دیکھا۔ وہ مسلسل انکار میں سر ہلا رہا تھا اور مکھی مارکہ مونچھوں والا شاعر بڑے مربیانہ انداز میں اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ آخر مسعود جمال نے جیسے قائل ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا اور مکھی مارکہ مونچھوں والے شاعر نے خوش ہو کر اپنے بے ہنگم دانت عریاں کر دیئے۔

پھر وہ دونوں اپنے اپنے سائیکلوں پر سوار ہو کر جدھر سے آئے تھے، اُدھر ہی چلے گئے۔ مسعود جمال، نزہت کے قریب آگیا۔

"افسوس ہے کہ آج ہم "پیکتے" پر چھاپہ نہیں مار سکتے۔ مسعود جمال نے نزہت کی نظروں سے کتراتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ لوگ پوری طرح مسلح ہیں۔ اور انہوں نے

کہا ہے۔

"اگر پولیس ہمارے گاؤں کے قریب بھی پھٹکی تو ہم بھون کر رکھ دیں گے۔"

"اور تم اس دھمکی سے ڈر گئے۔ تم جو اس ضلع میں حکومت کی نمائندگی کر رہے ہو؟"

"ڈرنے کی تو خیر کوئی بات نہیں، دراصل اس وقت ہماری پولیس فورس تعداد میں بہت کم ہے۔ ہارون آباد کے تھانے میں کُل بیس سپاہی ہیں۔"

"پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت جتنے سپاہی ہیں، ان سے کام چلایا جا سکتا ہے۔"

"پاگل نہ بنو نزہت! بھلا پولیس کے بیس سپاہی ایک پورے مسلح گاؤں سے کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں؟"

"اگر یہ سپاہی ہنگامی حالات سے نمٹنے کے قابل نہیں تو کیا ان کو نمائش کے لیے تھانے میں رکھا ہے؟"

"لیکن میں جذبات میں آ کر اپنی جان اور بیس سپاہیوں کی زندگی کو داؤ پہ لگانے کے لیے تیار نہیں۔"

"لیکن احمد شاہ کے بچے اور بیوی؟"

"انہیں وہ لوگ کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

"یہی بات تم نے کل احمد شاہ کے متعلق کہی تھی۔ خدا کے لیے بھی سُستی سے کام مت لو، یہ معصوم زندگیوں کا سوال ہے جنہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا، اگر تم اِس وقت ان کی امداد کے لیے نہ پہنچے تو احمد شاہ کی روح تمہیں کبھی معاف نہیں

کرے گی۔ احمد شاہ تمہارا سب سے مخلص، سب سے پیارا دوست تھا۔ اس نے کبھی تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہا تھا۔ لیکن مرتے مرتے اس نے تمہیں.... ‘‘
اور نزہت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ شدّتِ جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

’’سنو، نزہت! میں نے تم سے آج تک کبھی سخت لہجے میں بات نہیں کی۔ لیکن اس وقت مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر میں ہوں، تم نہیں۔ یہاں کے حالات کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس وقت میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ وہ لوگ اس وقت خون کے نشے میں بہکے ہوئے ہیں، انھیں آدھے سے زیادہ گاؤں کی حمایت حاصل ہے۔ ان کی مدد کرنے والوں میں صرف ان کے بگڑے ہوئے مرید ہی نہیں بلکہ وہ ڈاکو بھی شامل ہیں، جن کو وہ پناہ دیتے ہیں، وہ تمام کے تمام مسلح ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ احمد شاہ میرا دوست تھا۔ اس وقت ان کے سامنے نہ قانون ہے اور نہ عدالتیں، ان کے سروں میں خون سمایا ہوا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے لہو کے دبیز پردے ہیں۔ وہ اس سے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سوچ سکتے ہیں۔ ان حالات میں اگر میں خود کو اور ہارون آباد کے پورے تھانے کو ان کے مقابلے میں جھونک دوں تو جانی نقصان کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔‘‘

’’تو پھر اب کیا کرو گے۔ خدا کے لیے کچھ نہ کچھ کرو۔ وہ بھولے بھالے بیگناہ بچے اور ان کی بے قصور ماں تمہیں دعائیں دے گی۔ احمد شاہ کی روح تڑپ رہی ہو گی۔ نجانے اس کے بیوی بچے، زندہ ہیں یا..... نہیں۔ بھئی جلدی کرو۔‘‘

’’دیکھو نزہت! تم پھر جذباتی ہو رہی ہو۔ اس وقت میں وقت اور حالات

کے سامنے بے بس ہوں۔ میں اب تھانے جاؤں گا۔ وہاں سے بہاول نگر تار دوں گا کہ مزید پولیس فورس بھیجی جائے۔ اس کے بعد ہم کل رات انشاء اللہ بکّے پر چھاپہ ماریں گے۔"

یہ کہہ کر مسعود جمال پولیس کی جیپ کی طرف بڑھا۔

"ایک منٹ کے لیے، میری ایک بات اور سن جاؤ۔"

مسعود جمال رُک گیا۔

"بھئی میں تو یہی کہتی ہوں، کہ تمہیں اسی وقت بکّے پر چھاپہ مارنا چاہیئے۔ اگر تم پولیس کے ساتھ ہو گے، تو وہ لوگ قطعی مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ وہ ڈپٹی کمشنر کی آمد کا سُن کر ہی ڈر جائیں گے، دبک جائیں گے اور ایسا نہ بھی ہو تو ایک مخلص دوست کے چھوٹے چھوٹے بچّوں اور بیوی کو بچانے کے لیے ایک ذرا سا خطرہ مول لینے میں آخر ہرج ہی کیا ہے؟"

"تمہیں بار بار بیوقوفی کی بات دہرانے میں لُطف کیا آتا ہے؟" مسعود جمال نے غصّے سے کہا۔ اس نے کبھی نزہت سے غصّے میں نہ بات کی تھی۔ وہ جھنجھلا کر پھر جیپ کی طرف جانے لگا۔ لیکن نزہت نے اسے روکنے کے لیے اس کا بازو تھام لیا۔

"کچھ تو خیال کرو بھئی۔" وہ ان تین معصوم جانوں کو جو اس سمے تمہارے ایک مخلص ترین دوست کی امانت ہیں، مار ڈالیں گے۔ وہ مرتے مرتے اپنے بے جان جسم کو اُٹھا کر تمہارے پاس آیا تھا۔ چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں جسے وہ اپنی امانت سونپ سکے۔ خدا کے لیے اس امانت کی

حفاظت کرو۔ لوگ تو اپنے دوستوں کے لیے بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ تم اتنا بھی نہیں کر سکتے ؟"

" احمد شاہ کے بیوی بچوں کے بارے میں اس وقت کچھ معلوم نہیں، کہ زندہ ہیں یا قتل کر دیئے گئے۔ کیا پتہ انہیں احمد شاہ سے پہلے ہی مار دیا گیا ہو۔"

" اُف! ایسا نہ کہو۔" بہر حال اگر انھیں بچایا جا سکتا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ انھیں بچاؤ۔"

" میرا فرض یہ ہے کہ مَیں ہر کام سوچ سمجھ کر کروں ۔ ہر قدم جذبات میں بہک کر نہیں بلکہ ناپ تول کر اٹھاؤں۔ مَیں اپنی اور اپنے سپاہیوں کی زندگی ایک ایسی عورت اور اس کے ان بچوں کے لیے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں جن کو ان کے اپنے قریبی رشتہ دار جن کا ان سے خون اور گوشت کا تعلق ہے، زندہ چھوڑنے کے روادار نہ ہوں۔"

" وہ تمہیں بزدلی کا طعنہ دیں گے ۔"

" کون ؟ "

" ضلع کے تمام لوگ ۔"

وہ بڑے طنز سے مسکرایا۔

" تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مَیں اس ضلع کے لوگوں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہوں۔ اب میرا مزید وقت ضائع نہ کرو۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے بالکل درست کیا ہے ۔"

نزہت نے اسے ایک بھرپور نظر سے دیکھا۔ مسعود جمال اور اس کی شادی کو

چھ برس گزر چکے تھے۔ اور وہ اس کے چہرے کے ہر تاثر سے واقف تھی۔ اس کے ہر خیال سے اسے آشنائی تھی۔ اس نے مسعود جمال کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا اور اس سمے اسے وہ آنکھیں ان کھڑکیوں ایسی دکھلائی پڑیں جو تاریک خلاؤں کی مانند منہ پھاڑے رہتی ہیں۔ نزہت کے شاداب چہرے کا رنگ معاً زرد ہو گیا۔ جیسے کسی ہرے بھرے پتے پہ اچانک بجلی گری ہو، اور وہ پیلا پڑ گیا ہو۔ اس نے مسعود جمال کا بازو چھوڑ دیا اور ایک لفظ کہے بغیر واپس برآمدے میں آگئی۔

مسعود جمال جب تھانے سے واپس آیا تو نزہت نے دیکھا کہ وہ مکھی مارکہ مونچھوں والا شاعر اس کے ہمراہ تھا۔ وہ دونوں گئی رات تک لان میں بیٹھے باہم پُراسرار سرگوشیاں کرتے رہے۔ اور نزہت ریسٹ ہاؤس کے اندرونی صحن میں بیٹھی جلتی رہی۔

جب مسعود جمال، مکھی مارکہ مونچھوں والے شاعر سے فارغ ہو کر اندر آیا تو نزہت نے بڑی بے دلی سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ احمد شاہ کے بیوی اور بچے بھی قتل کر دیئے گئے ہیں۔ مَیں نے بہادل نگر حکم بھیج دیا ہے کہ مزید پولیس فورس بھیج دی جائے۔"

"اب پولیس فورس منگوانے کا فائدہ؟"

"ہاں یہی مَیں سوچ رہا ہوں۔ چونکہ قاتلوں کو گرفتار کرنا اب پولیس کا کام ہے۔ ہمیں کل صبح بہادل نگر چلنا چاہیئے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کل شام کمشنر آ رہا ہے۔"

"بیوی بچوں کو کب قتل کیا گیا؟"

"احمد شاہ کے قتل کے تین گھنٹے کے بعد۔"

"اندھیر ہے۔" نزہت چلا اٹھی۔ "اگر تم اس وقت میرے کہنے کے مطابق چلے جاتے تو شاید وہ لوگ بچ جاتے۔"

"اس وقت اگر میں چلا جاتا تو میری جان بھی خطرے میں تھی۔"

نزہت نے کوئی جواب نہ دیا، اور ساری رات آنسوؤں سے تکیے کو بھگوتی رہی۔

اگلے دن وہ علی الصبح بہاول نگر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کی روانگی سے پہلے منہ اندھیرے ہی گھنی مار کر موچھوں والا شاعر پھر ریسٹ ہاؤس آدھمکا تھا۔ مسعود جمال اسے کار سے دور لے جا کر بڑے پُرزور انداز میں کچھ تلقین کرتا رہا۔ اور وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ چلتے وقت اس نے مسعود جمال کو اپنے لمبے لمبے بے ہنگم دانت نکال کر الوداع کہا۔

جب کار ریسٹ ہاؤس کے صدر دروازے سے نکلی تو نزہت پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اسے رہ رہ کر احمد شاہ کی مظلوم بیوی اور بیگناہ بچوں کا خیال آ رہا تھا۔ جنھیں خاندانی مناقشات اور بے بنیاد دشمنیوں کے سنگدل دیوتا کے پتھریلے چرنوں میں اپنے لہو کی قربانی دینا پڑی۔ نزہت کے ذہن میں ایک اجنبی سے سوال نے سر اٹھایا "کیا اس کے بعد ہارون آباد آنا نصیب ہوگا" کسی ننھی سی آواز نے پکار کر کہا۔

"نہیں۔"

اُف! یہ تو احمد شاہ کے مقتول بچے کی آواز تھی۔

اور جب یہ لوگ بہاول نگر پہنچے، تو معلوم ہوا کہ کمشنر آج شام یہاں پہنچنے والا ہے۔ مسعود جمال تو کچہری چلا گیا اور نزہت ڈرائینگ روم میں دھنسی روتی رہی۔ آنسوؤں کا خزانہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔

شام کے وقت مسعود جمال دفتر سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ کمشنر کی کار پوں پوں کرتی بنگلے میں داخل ہوئی۔

مسعود جمال جلدی سے باہر نکلا اور نزہت منہ دھونے غسلخانے میں بھاگ گئی۔ جب وہ اپنی حالت ٹھیک کر کے واپس ڈرائینگ روم میں آئی تو دیکھا کہ وہاں کمشنر اور مسعود جمال موجود تھے۔ کمشنر نے بڑے اخلاق سے اٹھ کر نزہت کا استقبال کیا۔ "ہیلو مسز مسعود! ہاؤ۔ آر۔ یو؟"

اتنے میں چائے بھی آگئی۔

کھٹاک۔

دروازہ کھلا۔ نزہت نے چونک کر دیکھا، اردلی چائے لا رہا تھا۔

"اوہ" نزہت نے گڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تو وہ منٹگمری میں ڈی۔سی ہاؤس کے ایک تاریک کمرے میں بیٹھی تھی۔

"بیگم صاب! بلب تو جلا لیا ہوتا۔ اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہیں؟" اردلی نے حیرانی سے کہا۔

"بھئی تم ہی جلا دو، میری طبیعت خراب ہے۔"

"پٹخ" اور پورا کمرہ بلب کی روشنی میں نہا گیا۔

اردلی چائے رکھ کر چلا گیا۔ نزہت نے بڑی آہستگی سے پیالی میں چائے انڈیلی۔ اور چینی گھولتے گھولتے پھر بہادل نگر والے بنگلے کے ڈرائینگ روم میں چلی گئی۔ وہ کمشنر کی پیالی میں چینی گھول رہی تھی۔ اور وہ دھیمے انداز میں مسعود جمال سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل جب "پکا" میں تین قتل ہوئے تو آپ ہارون آباد میں ہی موجود تھے؟"

"جی ہاں۔"

"اور مقتولین، آپ کے ملنے والوں میں سے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"پھر تو لازماً آپ نے قاتلوں کو موقعہ پہ ہی گرفتار کر لیا ہوگا؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟" کمشنر نے حیرانی سے پوچھا لیکن نزہت جان رہی تھی کہ کمشنر کی حیرانی مصنوعی ہے۔ اور اسے تمام واقعات کا علم ہو چکا ہے۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" مسعود جمال نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مہربانی کر کے یہ پوری کہانی سنا ہی ڈالیے۔"

اور مسعود جمال نے بڑے محتاط لفظوں میں تمام واقعات کمشنر کے سامنے بیان کر دیئے۔ اس نے دنیا کے بہترین ناول، اور افسانے پڑھے ہوئے تھے۔ اور آج وہ یہ واقعات سناتے ہوئے ان تمام ناولوں اور افسانوں کی تکنیک کے نچوڑ کو کام میں لا رہا تھا۔

"آپ کی قوتِ بیان کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔" کمشنر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کے پاس پولیس کے بیس سپاہی موجود تھے۔ جو ہر طرح سے مسلح تھے۔ پھر آپ چھاپہ مارنے کے لیے بہاول نگر کی پولیس فورس کا انتظار کیوں کرتے رہے؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ قاتل مقتول کے کزن ہیں، اور گدی نشین پیر ہیں۔ اور نہ صرف پکے کے گاؤں پر بلکہ آس پاس کے کئی دیہاتوں پر ان کا بے انتہا اثر ہے۔ ان کے پاس خطرناک قسم کے ڈاکو بھی رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اگر میں بیس سپاہیوں کے ہمراہ پکے پر چھاپہ مارتا تو عین ممکن تھا کہ وہ لوگ بھی مقابلے پر اُتر آتے۔ اس صورت میں نہ صرف بیس سپاہیوں بلکہ مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا جو کہ میں کسی صورت بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اور اگر میں ایسا کر بھی بیٹھتا تو یہ ایک قطعی غیر دانشمندانہ اقدام ہوتا۔"

"اگر آپ کو اپنی جان کا خطرہ تھا تو چھاپہ مارنے کے لیے آپ کا پولیس کے ساتھ ہونا ضروری نہ تھا۔ آپ پولیس کو تو چھاپہ مارنے کا حکم دے سکتے تھے جبکہ میری اطلاع کے مطابق آپ نے پولیس کو بھی یہ قدم اٹھانے سے روکے رکھا۔"

"اس صورت میں بیس سپاہیوں کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔"

"اگر پولیس کے بارے میں بھی اس طرح سے سوچا جائے کہ فلاں معاملے میں پولیس کو جان کا خطرہ ہے۔ اس لیے اسے چپ چاپ تھانے میں بیٹھے رہنا چاہیئے، تو پھر پولیس کے محکمے کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اس کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟"

اس پر مسعود جمال کندھے جھٹکا کر خاموش ہو گیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں اُبھر آئیں۔

"دیکھیے مسعود صاحب!" کمشنر نے پھر کہنا شروع کیا۔ اس دفعہ اس کا لہجہ قدرے درشتگی آمیز تھا۔ "آپ کو یاد ہے، آپ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ "میں نے آپ سے کہیں زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ میں آرٹ کو بھی آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ضلع کے اِن بڈھے اور تنگ خیال عوام مجھے اچھا نہیں سمجھتے تو آپ کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری قابلیت پر شبہ کریں۔" یاد ہے آپ کو یہی کہا تھا نا آپ نے؟ آج آپ کی قوتِ بیان دیکھ کر میں یہ ماننے پر مجبور ہوں کہ واقعی آپ نے مجھ سے زیادہ کتابیں پڑھی ہیں" کمشنر نے ایک لحظے کے لیے رک کر ڈرائینگ روم میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں، اور پھر کہنے لگا۔ "اور اس ڈرائینگ روم میں ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر میں یہ بھی مانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے افسوس ہے مسعود صاحب! کہ میں آپ کی اہلیت پر شک کر رہا ہوں۔"

"شکریہ۔ لیکن مجھے اب بھی اصرار ہے کہ میں نے جو کچھ کیا حالات کے مطابق بالکل ٹھیک کیا۔" مسعود جمال نے کہا۔

"خیر یہ کہہ کر آپ نہ مجھے مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ اپنے ضمیر کو، بہر حال چاہیے تو یہ تھا کہ میں آپ کو استعفیٰ دینے کا مشورہ دیتا لیکن میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ اپنی ٹرانسفر کے لیے درخواست دے دیں۔ تو میں اس پر سفارش کر کے آگے بھجوا دوں۔" یہ کہہ کر کمشنر بہاول نگر کے کینال ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ جہاں

اسے ٹھہرنا تھا۔

اور اب نزہت منٹگمری کے ڈی۔سی۔ہاؤس میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا ہے۔جو کئی دنوں سے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پرورش پا رہا تھا۔اب وہ تمام تلخ باتیں مسعود جمال کے سامنے اُگل دینا چاہتی تھی۔جو بہت دنوں سے اس کے دل و دماغ میں بس گھول رہی تھیں۔اب وہ اس زہر کی تلخی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔اب وہ اس کڑواہٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھی۔اس کڑواہٹ میں اپنے وجود کو گھلاتے رہنے سے بہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا پا لیا جائے۔چھٹکارا جو عارضی نہیں بلکہ دائمی ہو۔

ٹھیک۔ٹھیک۔ٹھیک۔وہ چونکی تو قدموں کی چاپ سنائی دی۔پھر دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔اور مسعود جمال مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

"ایں، تم نہائی بھی نہیں۔کپڑے بھی نہیں بدلے؟"

"نہیں۔"

"کیوں آخر؟"

"میں نہیں نہاؤں گی۔میں کپڑے بھی نہیں بدلوں گی۔میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔میں تمہیں چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟"

"ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔تم خود مجھے طلاق دے دو، ورنہ میں عدالت

میں جا کر طلاق لے لوں گی۔ اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب مجھ میں ہمت نہیں رہی کہ میں تمہارے ساتھ چل سکوں۔" مسعود جمال کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو"

"خدا شاہد ہے کہ میں تم سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ چھ برس تک میں نے وہاں وہاں سجدے کیے ہیں جہاں جہاں تمہارے قدموں کے دھندلے سے بھی نشان دیکھے ہیں —— میں تم پہ اسی طرح ایمان رکھتی تھی، جیسے خدا پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے تمہیں دل کے سنگھاسن پہ دیوتا بنا کر بٹھایا۔ اور دن رات تمہاری عبادت کی، لیکن اب یہ طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے اب جانے دو۔ میں اب چلی جاؤں گی۔"

مسعود جمال نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ یکایک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اور پھر وہ بُری طرح رونے لگا۔ اس کی سسکیاں کمرے کی فضا میں پھیل گئیں۔

"نزہت! اتنی سنگدل نہ بنو۔ مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔ میں تمہارے بغیر کیسے جی سکوں گا۔ مجھے مت چھوڑو نزہت! نزہت ..... نزہت...!"

"نہیں۔ نہیں۔ اپنی سسکیوں سے میرا راستہ نہ روکو۔ میں اب تمہارے ساتھ کسی صورت نہیں چل سکتی۔ مجھے اپنی راہ پہ جانے دو۔ مجھے ضرور جانا

چاہیئے۔ ضرور۔ مَیں اب کس طرح تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ ایک عورت کا سب سے بڑا غرور اس کا خاوند ہوتا ہے۔ اگر یہ غرور ٹوٹ جائے، تو پھر.... تو پھر..... اب مجھے جانے دو۔"

مسعود جمال نے نزہت کے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جلدی سے کمرے سے یہ کہتی ہوئی نکل گئی۔

"مَیں تمہیں شیشہ سمجھی تھی۔ لیکن تم تو ڈپٹی کمشنر نکلے۔"

(ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور)

شردن کمار ورما

ادھوری تصویر

تصویر مکمل ہوگئی تھی۔

انل نے سگریٹ سلگایا اور ایزل سے ذرا فاصلے پر بھوری ملائم پتیوں پر لیٹ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اسے اس طرح لیٹنا اچھا لگتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے اندر اور باہر بڑا سکون اور شانتی محسوس کرتا۔ اس نے اپنے اعضا ڈھیلے چھوڑ دیئے اور آنکھیں موندلیں۔ پھر وہ سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، سامنے نیلی ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔

"ہیلو انل، سو گئے تھے؟"

وہ مسکراتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

تم سوتے میں ہیمنگوے کی کسی کہانی کے کردار کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ بھی کھلے میں اسی طرح بے فکری سے سو جاتے ہیں۔" وہ مسکرائی :—

"I LIKE IT THIS WAY"

انل سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ اسے لاجو یاد آگئی۔ وہ جب بھی نیلی کے ساتھ ہوتا اسے لاجو یاد آجاتی۔ وہ سیدھی سادی دیہاتی لڑکی جس نے کبھی بس تک نہیں دیکھی

تھی۔ لاجو کا خیال اس کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح آتا جیسے ہلکی ہلکی ٹھنڈک سے چھو کر اُڑ رہی ہو۔ ایک نرمی اور خوشگوار ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہوتا۔ اس نے سگریٹ ختم کیا۔ اس دوران نیلی ایزل پہ لگی تصویر دیکھتی رہی۔ اس کی پیٹھ اَنل کی طرف تھی۔ پھنسی پھنسی جینز اور شرٹ میں ایسی لگ رہی تھی جیسے ایک ایک انگ الگ الگ پیچوں سے کسا گیا ہو۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔"

"مجھے لینڈ سکیپ پسند نہیں۔" وہ پلٹ کر بولی۔ "یہ درخت، سلیٹ اور ٹین کی چھتیں، چمنیوں سے نکلتا دھواں، دور چوٹیوں پہ چمکتی برف جھرنے، آبشاریں تو میں بیس سال سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ مجھے یہ سب بے معنی اور ٹھہرا ٹھہرا سا لگتا ہے۔ کوئی ایسی چیز بنا کر دو جسے دیکھ کر لہو رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگے۔"

اَنل نے اسے غور سے دیکھا اور سوچا۔ اس لڑکی کو اس کے تمام تر خیالات، جذبات اور احساسات کے ساتھ کینوس پر ابھارنے کے لیے کون سے رنگ درکار ہوں گے۔ اور لاجو کے لیے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وسیع۔ شفاف۔ نیلا۔

"تمہیں شکار کا شوق ہے"

"مجھے گھوڑوں سے واسطہ نہیں رہا" ——— اَنل اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ وہ تھیلا لے کر اس پتھر تک گیا جہاں سے سڑک دکھائی دیتی تھی اور نیچے اُس کوٹھی کی ٹین کی ہری چھت تھی، جس میں وہ ان دنوں رہ رہا تھا۔ کوٹھی

کے دُود کش سے دُھواں نکل رہا تھا۔

"رام سنگھ نے کام شروع کر دیا ہے۔"

"ہاں" نیلی اس کے قریب آ گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ اس کے جسم کی آنچ محسوس کر سکتا تھا۔ چُست لباس میں ٹھاٹھیں مارتے جسم کو سُن سکتا تھا:

"میں اسے پانی گرم کرنے کے لیے کہہ آئی ہوں۔"

انل نے چمڑے کی جیکٹ پہنی اور ایزل اٹھا لیا۔ تھیلا نیلی نے شانے سے لٹکا لیا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ نیلی نے اس کا بازو تھام رکھا تھا اور اپنا بوجھ تقریباً اس پر ڈال کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ انل اس کی گرم سانس کو اپنی گردن اور گالوں کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنی ایک سہیلی کے بارے میں بتا رہی تھی، جو اس کے بھائی کو چاہتی تھی، لیکن وہ کینیڈا چلا گیا جہاں اس نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی، اور جب وہ اداس رہنے لگی تو نیلی نے اسے سمجھایا کہ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، عورت کو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کتنا کماتا ہے۔ آج کل اس کی وہ سہیلی ایک آئی ایس اے افسر کے چکر میں ہے۔ پھر وہ ایک لڑکے کے بارے میں بتانے لگی جو تھا تو تعلیم یافتہ لیکن جسے بندروں کی طرح درختوں پر چڑھنے، اُچھل کُود کرنے اور جنگلوں اور پہاڑیوں پر بھٹکنے میں مزا آتا تھا۔ وہ سخت وحشی تھا۔

انل سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا، خاموش چل رہا تھا۔ لاجو نے اسے اپنے بھائی کے بارے میں بتایا تھا جو صبح سے شام تک کھیت پر کام کرتا تھا، اس نے

ایک دیوتا کا ذکر کیا تھا جو سامنے والے کالے پہاڑ کی چوٹی پر رہتا تھا۔ اور ان کے گاؤں کو ہر مصیبت سے بچاتا تھا اور ان کی فصلوں اور ڈھور ڈنگروں کی رکھوالی کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لاجو ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتی تھی اور ہنستی رہتی تھی۔

"اے۔" نیلی نے اس کی کلائی میں ناخن چبھویا۔ "اگر میں تم سے شادی کر لوں تو بار بار تمہیں یاد کرانا پڑے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔" وہ ہنسی "مسٹر آرٹسٹ جب کسی لڑکی کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس طرح خود میں نہیں اتر جاتے۔ باہر نکل کر رہا کرو۔"

"سوری"

"آج تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے اگر آج تمہارا کوئی پروگرام یا APPOINTMENT ہو تو کینسل کر دو۔ آج ہم کہیں دور چلیں گے۔ ذرا اڈونیچر رہے گا۔"

"تم تھکی نہیں۔؟"

"تم میرے اندر کہیں جیسے پنکھے چل رہے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "میں ابھی تمہیں جس لڑکے کے بارے میں بتا رہی تھی، سب سے پہلے اسی نے تجھ سے میری ملاقات کرائی تھی۔ عجیب آدمی تھا۔ ایک دفعہ چوٹ لگی تو زخم پر کوئی دوا تک نہیں لگائی۔ سب نے اسے سمجھایا لیکن وہ بضد رہا کہ اسے ایسے ہی اچھا لگتا تھا۔ جب وہ یہاں تھا تو میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اب جب کہ وہ چلا گیا ہے تو اکثر یاد آتا ہے۔ HE WAS ALIVE TO THE BONE" پھر وہ کچھ

سوچ کر بولی یہ انل ۔ تم بھی تو کوئی بات کرو۔"

"تم کرو، میں سُن رہا ہوں۔"

"تم بڑے چالاک ہو۔ اس طرح تم میرے اندر جھانک لو گے اور تمہاری شخصیت مجھ سے چھپی رہے گی۔ یہ ٹھیک نہیں۔ کسی لڑکی کے ساتھ تمہیں اتنا CUNNING نہیں ہونا چاہیئے۔"

"میں CUNNING نہیں ہوں۔"

"تم ہو۔ نہیں تو بولتے کیوں نہیں۔ ہر وقت مجھے ہی بولنا پڑتا ہے۔ مجھے اپنے بارے میں، اپنے سفروں کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے لوگوں سے ان کے تجربات اور ایڈونچرز کی کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے۔"

"میرے تجربات میری تصویروں میں ڈھل جاتے ہیں۔"

"تم نے سارا ہندوستان گھوما ہے۔ مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں سے ملے ہو۔ اُن کے بارے میں کیوں نہیں بتاتے تم۔"

وہ خاموش رہا۔

"ڈیڈی کے ایک ریٹائرڈ کرنل دوست ہیں۔ وہ اکثر رات کو ہمارے ہاں آجاتے ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کرائی۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر وہ جب دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں سناتے ہیں تو مزہ آجاتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپاتے۔ کون سے ملک میں انہیں کس کس قسم کی عورتیں ملیں۔ کس مورچے پر کیا ہوا۔ ان کے پاس اتنے میڈل نہیں جتنی مختلف ولیتوں کی عورتوں کی تصویریں ہیں۔ ڈیڈی شکار کے قصے سناتے ہیں۔ ڈیڈی نے شیر،

چیتے، بھالو، جنگلی سور ہر جانور کا شکار کیا ہے۔ کئی بار زخمی ہوئے ہیں۔ آج کل وہ اور کرنل انکل پھر شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ ڈیڈی بڑے MATTER OF FACT قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں صرف دو چیزوں سے محبت ہے۔ اپنی بندوق اور شکار کیے جانوروں کی کھالوں سے۔ ممی رمی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کسی نہ کسی کو ڈھونڈ لاتی ہیں۔ میں گھر میں ہوں تو مجھے پکڑ بیٹھتی ہیں۔ مجھے یہ ان ڈور لائف پسند نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے افریقہ کے جنگلوں میں گھومتی پھروں۔ وسیع سمندروں میں دور دراز جزیرے تلاش کروں اور ان کے بارے میں لکھوں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ مجھے یہاں پیدا ہی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ YOU KNOW I DID NOT CHOOSE IT اچھا تم اپنے سفروں کے بارے میں لکھ کیوں نہیں ڈالتے۔ میرے دل میں اکثر ابال اٹھتا ہے۔ تب میں چاہتی ہوں کہ لکھتی چلی جاؤں۔ دو چار مرتبہ کوشش بھی کی لیکن خیالات پنجرے میں بند چڑیوں کی طرح اڑنے اور چیخنے لگتے ہیں۔ تب مجھے سخت کوفت اور وحشت ہونے لگتی ہے۔ میں باہر کو دوڑتی ہوں۔ تم لکھو، میں تمہاری سب کتابیں خریدوں گی۔"

"میں تمہیں کتابیں PRESENT کروں گا۔"

"SO NICE OF YOU" وہ خوش ہو کر بولی۔ "تین چار سال ہوئے ایک مقامی شاعر نے مجھے اپنی کتاب دی۔ خلوص اور نیک خواہشات کے ساتھ۔" وہ ہنسی۔ "پڑھنے بیٹھی تو بور ہو گئی۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہی عشق میں مرنے جلنے اور قبر کے بولنے والے عاشق کے بیہودہ اور بے معنی جذبات۔ سب اگلی ہوئی باتیں۔ میں نے کتاب آتش دان میں پھینک دی اور راکھ لفافے میں ڈال کر ان حضرت کو بذریعہ رجسٹری

واپس بھیج دی۔ میرا خیال ہے انہوں نے شاعری ترک کر دی ہوگی۔

"تم خاصی خطرناک ہو۔"

"آرٹسٹ کو ہمیشہ نئی بات کہنی چاہیئے۔"

اب وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ انل نہانے چلا گیا اور وہ دھوپ میں بیٹھ کر ایک میگزین میں تصویریں دیکھنے لگی۔ لمبے اونچے درخت ادھر ادھر نیچے بکھری کوٹھیاں۔ چمنیوں سے اٹھتا دھواں۔ کسی کسی دریچے میں کوئی چہرہ، دھوپ میں سوکھتے کپڑے اور سب سے پرے کالی پہاڑیوں کا سلسلہ۔ وہ بور ہوگئی۔ اس نے سوچا۔ انل اتنی اتنی دیر اکیلا بیٹھا یہ سب کیسے دیکھتا رہتا ہے۔ ان واہیات چیزوں کو دیکھے جانے میں کیا تُک ہے۔ کہتا ہے دور پہاڑیوں کو دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ کیا نامعقولیت ہے۔ کوئی پروگرام نہ ہو تو آدمی فلم ہی دیکھ آئے۔ وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

"اے انل جلدی کرو، میں بور ہو رہی ہوں۔"

"کچھ پڑھو، اندر ریک میں کتابیں رکھی ہیں۔"

"میں دن کے وقت نہیں پڑھ سکتی، اور پھر مجھے تمہارا چیخوف اور پریم چند پسند نہیں۔ تمہارے پاس ہیمنگوے یا نرولا ہے؟"

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔۔۔!" وہ گانے لگا۔

"انل جب تمہاری آواز اچھی نہیں تو کیوں گاتے ہو۔"

"آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟"

"ٹھنڈا پانی۔" وہ تقریباً چیخی۔ "نکلتے ہو باہر کہ تمہاری چیزیں سڑک پہ

پھینکوں؟"

انل جلدی سے باہر آگیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیلی کا ذہن اور ہاتھ ایک ساتھ کام کرنے لگتے ہیں۔ جتنی دیر وہ تیار ہوتا رہا نیلی اس کے ساتھ رہی اور ہمینگوے کے گن گاتی رہی۔

"ہمارے ہاں اس کی ٹکر کا ایک بھی ادیب نہیں۔ دراصل کسی کو زندگی کا اتنا قریبی اور گہرا مشاہدہ اور تجربہ ہی نہیں۔ یہاں تو ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر ترقی پسند کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور اگر کوئی ان پر اعتراض کرے تو اسے گالیاں اور مارنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ بے چارے عوام کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔"

رام سنگھ ناشتہ لے آیا اور وہ ادھر متوجہ ہوگئی۔ وہ بڑے گھریلو انداز میں بیٹھ کر انل کے لیے توس پر مکھن اور جیم لگانے لگی۔ پھر اس نے انل کے لیے انڈے چھیلے اور کوفی بنائی انل محویت کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ کھڑکی سے آتی دھوپ نیلی کے بالوں اور گردن سے لپٹ کر بے حد پیاری اور خوبصورت ہوگئی تھی۔ پتہ نہیں دھوپ میں نیلی کے بدن کی حرارت تھی یا نیلی دھوپ کی ہلکی گرمی سے تپ رہی تھی، انل کو کمرے میں ایک نشہ آور آنچ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ میز پر جھکی پیالی میں چمچہ ہلا رہی تھی اور بڑی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ خواہ مخواہ اس سے ڈرتا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کا لباس دیکھ کر مسکرایا۔ جیسے ہمٹر کی بھری بھری سی پھلی۔ اُسے لاجو یاد آگئی۔ وہ خاوند کے گھر جا کر اسی طرح کام کرتی رہے گی۔ روٹیاں پکا کر کھیت پہ لے جائے گی اور کپڑے دھوئے گی۔ کچے فرش پر گوبر کی لپائی کرے گی۔ ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال کرے گی اور پھر

اپنا آپ اپنے خاوند کے حوالے کر کے یوں نشچنت ہو جائے گی جیسے منزل پہ پہنچ گئی ہو۔ وہ شاید کبھی بس نہیں دیکھے گی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ ڈیزل کا دھواں اور انجنوں کی گڑگڑاہٹ اس کی آتما کی شانتی اور سُکھ کو مجروح نہیں کر سکے گی۔ وہ سورج کے ساتھ جاگے گی اور اسی کے ساتھ سو جائے گی۔ اسے وہ شام یاد آگئی جب وہ لاجو کے باپ کے ساتھ ان کے گاؤں پہنچا تھا۔ سورج پہاڑیوں کے پیچھے جا رہا تھا، سائے پھیل رہے تھے اور سامنے والا جنگل پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ لاجو اپنے گھر کے باہر بیٹھی رات کے کھانے کے لیے چٹنی پیس رہی تھی۔ سورج کی گلابی کرنیں لاجو اور سیب کے شگوفوں پر پڑ رہی تھیں اور جب وہ اٹھی تو اس نے سوچا تھا کہ وہ اس لڑکی کی تصویر بنائے گا۔

"کوفی پیئو" نیلی بولی۔

وہ خوابوں کے جزیرے سے نکل آیا اور کوفی سِپ کرنے لگا۔ نیلی اس وقت خاموش تھی۔ انل کو یہ خاموشی بڑی عجیب اور پُر اسرار معلوم ہو رہی تھی۔ اسے سامنے بیٹھی نیلی کا جسم کسی خوبصورت، مضبوط عمارت کے اس مینار کی طرح لگ رہا تھا جو درختوں کے اوپر سے جھانک رہا ہو۔ انل کے دل میں بار بار آ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر نیلی کو اپنی باہوں میں بھر لے اس نے سوچا یہ جسم مرد کی قربت سے نا آشنا بھی نہیں ہو سکتا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔؟"

اُسے لگا جیسے وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہو۔ اس نے آنکھیں نیلی کے چہرے سے ہٹا لیں اور کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا بولا۔

"کچھ نہیں۔ چلو کہیں چلیں۔" دراصل وہ جینز اور شرٹ میں بھری بارود سے ڈر گیا تھا۔

وہ باہر آ گئے اور لان میں ٹہلنے لگے۔ جب وہ تین چکر لگا چکے تو نیلی نے رُک کر کہا۔

"انل کوئی بات کرو۔ ورنہ میں اداس ہو جاؤں گی۔"

انل نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں ایک لڑکی کی تصویر بنانا چاہتا ہوں جو شملہ کی پہاڑیوں میں جھیل سے کچھ دور ایک گاؤں میں رہتی ہے۔"

"NUDE!"

"نہیں بھئی۔" وہ قدرے جھنجھلا گیا۔

"نیلی!" سڑک پر سے گزرتی ایک لڑکی نے نیلی کو آواز دے لی۔ وہ انل سے معافی مانگتی ہوئی اُدھر چلی گئی۔ انل انہیں گیٹ پر کھڑے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد وہ خوش خوش آ گئی۔

"انل جانتے ہو یہ کون تھی۔ شملہ کی اسے وَن SKATER ہے آج رنک میں رونق ہو گی۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔"

رنک پہنچ کر نیلی SKATES باندھ کر فلور پر چلی گئی۔ انل ایک کونے میں بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ نیلی ایک نوجوان کا بازو تھامے رقص کر رہی تھی۔ وہ نہایت پھرتی اور خوبصورتی سے پہیوں پر گھوم گھوم جاتی۔ بار بار وہ نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر خطرناک حد تک اس پر جھک جاتا۔ وہ ایک ٹانگ ہوا میں اچھال

کر ایک پاؤں پر دُور تک اس نوجوان کے ساتھ پھیلتی چلی جاتی۔ انل نے سگریٹ سُلگا لیا اور سوچا۔ اس سمے لاجو شاید باؤلی پر کپڑے دھو رہی ہو گی اور تنہائی کے احساس سے بچنے کے لیے کوئی گیت گنگنا رہی ہو گی۔ اسے وہ سہانی صبح یاد آگئی جب وہ سو کر اٹھا تھا۔ گھر کے تینوں افراد جاگ کر جا چکے تھے۔ اسے اپنے دیر سے جاگنے پر شرم کا احساس ہوا۔ وہ پچھلے برآمدے میں چلا گیا اور دن کے نرم اجالے کو گاؤں پر پھیلتے دیکھنے لگا۔ جس کمرہ میں وہ سوئے تھے اس کے نیچے گائیوں اور بکریوں کا باڑہ تھا اور وہاں سے لاجو کی آواز آرہی تھی۔ وہ شاید جانوروں کو چارہ ڈالتے ہوئے انہیں ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں اور اندازِ گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب معصوم سی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چھپ کر لاجو کو ڈھور ڈنگروں سے باتیں کرتے دیکھے کہ ایسے میں وہ کیسی لگتی ہے۔ وہ ایک بچھڑے کو رسّی سے کھینچتی ہوئی باہر آگئی اور انل کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ بچھڑا اندر بھاگ گیا۔

انل بے ساختہ ہنس دیا۔

وہ بھی ہنس دی اور جا کر بچھڑے کو کھینچ لائی۔

"بابو جی چائے بنا دوں۔؟"

"نہیں لاجو، یہ پھر بھاگ جائے گا۔" اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اس کا کیا اثر لیتی ہے۔ لیکن وہ بچھڑے سے کھینچا تانی کر رہی تھی۔ اس نے رسّی ایک درخت سے باندھ دی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"میری بڑی بہن اس طرح کھینچ کھانچ کر مجھے سکول بھیجا کرتی تھی۔"

"بابوجی تم نے چودہ جماعتیں پاس کی ہیں۔؟"

"سولہ۔"

"ہمارے گاؤں میں کوئی سکول نہیں۔" پھر وہ جیسے کچھ سوچ کر بولی "نہانے کے لیے پانی گرم کر دوں۔"

"نہیں میں نیچے کھڈ پر نہاؤں گا۔"

"باپو اور دیر بھی وہیں نہاتے ہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن دُور ہے۔ وہاں۔" اس نے نیچے اشارہ کیا اور 'وہاں' کو قدرے لمبا کر دیا۔ "درختوں کے پیچھے۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں، کپڑے دھونے۔"

"بڑا کام کرتی ہو تم۔"

"تم نہیں کرتے۔؟"

"میں بھی چلتا ہوں، سامان لے آؤں۔"

وہ نہانے کا سامان تھیلے میں ڈال کر باہر آ گیا۔ لاجو نے گائیں اور بکریاں باہر نکال دی تھیں اور اب وہ نیچے جانے کے لیے تیار تھیں۔ اسے دیکھ کر لاجو اندر گئی اور میلے کپڑوں کی گٹھڑی سر پر اٹھائے آ گئی۔

"چلو۔" اس نے جانور نیچے جانے والی پگڈنڈی پر ہانک دیئے۔ اُن کے پیچھے خود اترنے لگی۔

"تالا نہیں لگاؤ گی۔؟"

"یہاں چوری نہیں ہوتی۔ دیوتا سب کی آتما میں رہتا ہے۔"

اس کو نہ جانے کیوں جرم کا سا احساس ہوا۔ رات وہ بستر پر لیٹا دیر تک

اس کونے کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں لاجو فرش پر سو رہی تھی۔ لالٹین کی ہلکی سی روشنی میں لاجو کا چہرہ نیند میں اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ انل کو اپنے اندر کسی بھوکے بھیڑیے کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے سونے کی کوشش میں دیر تک جاگتا رہا تھا۔ لالٹین بجھانے کے بعد دیر تک اس بھیڑیے نے اندھیرے میں تڑپتا رہا تھا۔

"ارے انل کہاں ہو؟"

وہ چونکا۔ نیلی پلنگ پر جھکی مسکرا رہی تھی۔

"تم بھی کمال آدمی ہو۔ جھٹ کھو جاتے ہو۔ میں شملہ کے ٹاپ SHAKER کے ساتھ فلور پر تھی۔ تم نے دیکھا۔؟ وہ بے حد ENCOURAGING ہے۔

"ہاں۔"

"ANIL! DONT YOU FEEL JEALOUS"

"بالکل نہیں۔"

"BUT YOU SHOULD" وہ کھل کر ہنسی، پھر بولی۔ ایک راؤنڈ کے بعد ہم چلیں گے۔ YOU WONT MIND ہیں!"

انل نے سگریٹ سلگایا اور سوچا۔ نیلی مرد سے سب کچھ چاہتی ہے۔ اس کی تمام تر توجہ اور بدلے میں وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ وہ ایک لمحہ بھی نہیں، جس میں وہ یہ محسوس کر سکے کہ اُسے نیلی یہ لڑکی مکمل طور پر مل گئی ہے۔ نیلی حد درجہ کی خود غرض ہے۔ اور لاجو ان لڑکیوں میں سے ہے جو قربانی کو عین عبادت سمجھتی ہیں جو اپنا سب کچھ ارپن کر دیتے ہیں فخر محسوس کرتی ہیں۔ اس میں اپنی جیت سمجھتی ہیں

اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتیں، کچھ نہیں مانگتیں۔ اور دونوں ہی لڑکیاں ہیں اسی دھرتی کی عورتیں۔

نیلی اس نوجوان کی بانہوں میں جھول رہی تھی اور وہ لاجو کو سامنے لیے بیٹھا تھا۔ لاجو جو بڑی سادگی اور معصومیت سے ہنس رہی تھی اور اپنی کالی بکری کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ان دنوں کی بات کر رہی تھی جب بادل کئی دن مسلسل برستے رہے تھے۔ دیوتا اُن سے ناراض ہو گیا تھا۔ ان سے نہیں گاؤں کی ایک کنواری سے جو ایک ڈرائیور کے ساتھ گاؤں سے چلی گئی تھی اور اس کا منگیتر سامنے والے پہاڑ پہ دیوتا کے پاس شکایت لے کر گیا تھا وہ تو واپس نہیں آیا لیکن گاؤں میں جل تھل ہو گیا تھا۔

لاجو گایوں، بکریوں کو راستے پر رہنے کی تلقین کرتی چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ انل سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ انل کو بتا رہی تھی کہ براس کے پھولوں کی چٹنی بہت لذیذ ہوتی ہے اور کہ رات کے کھانے پہ وہ اس کے لیے یہ چٹنی تیار کرے گی۔ پھر اس نے اسے بتایا کہ کس طرح پچھلے سال بکری کا بچہ مرنے پہ وہ کئی دن تک اداس رہی تھی۔

اس طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے وہ کھڈ پہ پہنچ گئے۔ تازہ شفاف پانی پتھروں میں بہہ رہا تھا اور صبح کی ہلکی ہلکی دھوپ میں پتھر ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ لاجو نے کپڑوں کی گٹھڑی ایک طرف رکھ دی اور ایک چوڑے سے پتھر پہ چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ انل نے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں پتھروں پہ چلتا ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں وہ اطمینان سے نہا سکے۔

"بابوجی آگے نہ جانا، دھار اتیز ہے۔"

"انل نے پلٹ کر لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ اس بڑے اونچے پتھر پہ کھڑی کوئی آسمانی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ بکریاں اور گائیں ادھر ادھر ڈھلوانوں پہ چڑھ گئی تھیں۔ دونوں طرف پہاڑیاں تھیں اور اوپر نیلا وسیع آسمان اور خاموشی۔

"لاجو۔ تم روز یہاں اکیلی آتی ہو۔؟"

"یہ سب جو میرے ساتھ ہوتی ہیں۔" اس نے گائیوں بکریوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ڈر نہیں لگتا۔"

وہ ہنس دی۔

"تم ڈرتے ہو۔؟"

وہ بھی مسکرا دیا اور ذرا فاصلے پہ ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چلا گیا۔ اب وہ نہانے کے لیے تیار تھا۔ اپنے کپڑے ایک طرف رکھ کر وہ پانی میں اتر گیا۔ لاجو اب کپڑے دھونے لگی تھی۔ وہ پانی میں چلتا ہوا لاجو کے قریب پہنچ گیا۔ اور پانی میں بیٹھ کر اسے شہروں کے بارے میں بتانے لگا۔ لاجو کو معلوم نہیں تھا کہ شہر کیسے ہوتے ہیں، وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہاں کے آدمی کیسے ہوتے ہیں۔ نہ اسے ویت نام کے بارے میں کچھ پتہ تھا اور نہ وہ یہ جانتی تھی کہ کلکتہ اور چنڈی گڑھ میں کیا ہوا ہے۔ وہ بہت سکھی تھی۔

پھر ریلی آگئی اور لکڑی کے فرش پر لوہے کے پہیوں کی آواز اور ہال کا شور اور فلمی ریکارڈ۔ وہ دونوں باہر آگئے۔ سڑک پر اخبار بیچنے والے پکار

پکار کر مدراس سرکار کے نئے حکم کا اعلان کر رہے تھے۔ وہاں ہندی بالکل ختم کر دی گئی تھی۔ گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی تھی اور بمبئی میں شِو سینا جوابی کارروائی پر اتر آئی تھی اور نیلی اسے SKATING کے مقابلوں کے بارے میں بتا رہی تھی اور ان انعامات کا ذکر کر رہی تھی جو اس نے حاصل کیے تھے اور ان فلمی ایکٹرز کے بارے میں بتا رہی تھی جن کے ساتھ اس نے شملہ میں فوٹو کھنچوائے تھے۔ پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

"اَتل تم لاجو کے بارے میں بتا رہے تھے"

"وہ بے حد معصوم تھی"

"پھر"اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

اَتل خاموش رہا۔ وہ ایک ویران راستے پر نیچے اتر رہے تھے اور اُن کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا جو رات کی طرح گہرا اور خاموش تھا۔ وہ اسے بتانے لگا کہ کیسے جنرل الیکشن کے دوران وہ اپنی پارٹی کی طرف سے کام کرنے کنڈا گھاٹ گیا تھا اور وہاں اس کی ملاقات لاجو کے باپ سے ہوئی تھی۔ وہ اَتل کو اپنے گاؤں لے گیا۔ پھر اس نے نیلی کو لاجو کے باپ بھائیوں، ماں اور گائیوں، بکریوں کے بارے میں بتایا اور اس دیوتا کے بارے میں بھی جو گاؤں کی کنواریوں اور کھیتوں کی رکھشا کرتا تھا۔

"مجھے لاجو، ایک جھرنا، سیب کا ایک پیڑ لگی تھی۔" اَتل نے درختوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اس سے باتیں کر کے اس کے پاس بیٹھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی مندر میں آ بیٹھا ہوں"

"تم آرٹسٹوں سے خدا بچائے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "وہ عورت تمہیں عورت ہی نہیں، اور سب کچھ معلوم ہوتی ہے۔"

"وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔" اس نے خلوص سے کہا۔

"میں ایسی ویسی کی بات نہیں کر رہی لڑکی تھی کہ نہیں۔" وہ مسکرائی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ "خیر تم اس کے ساتھ سیر کرنے گئے۔"

انل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

"لاجو تمہاری ہر بات پر کھلکھلا کر ہنستی تھی، ہیں نا"؟ نیلی نے کہا۔ "تم نے اس کی تصویریں لیں اسے پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے میں مدد دیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے جوڑے میں پھول لگائے۔ اسے سینما، نمائش اور ہوٹلوں کے بارے میں بتایا۔" وہ ہنسی۔ "دیکھو میں نے تمہیں دیکھا نہیں پھر بھی میں سب جانتی ہوں۔ میں کئیوں سے یہ کہانیاں سُن چکی ہوں۔"

"میں نے کہا نا وہ بہت بھولی بھالی اور سیدھی سی لڑکی تھی۔"

"وہ دیکھو گرگٹ۔" وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "گرگٹ کئی رنگ بدلتا ہے۔"

اب وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں پانی کئی شاخوں میں بٹ کر بہہ رہا تھا اور آس پاس اونچے، گھنے درخت تھے جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ نیلی جیسے اس مقام کے چپّے چپّے سے واقف تھی۔ وہ انل کا ہاتھ پکڑ کر ایک درختوں کے جھنڈ میں لے گئی، وہاں خالی اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں پڑی تھیں۔ اخبار کے کاغذ اور لفافے بکھرے تھے اور قریب پانی گنگناتا بہہ رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئے۔ انل نے جیکٹ اتار دی اور سگریٹ سلگا کر لیٹ گیا۔ لیکن وہاں سے آسمان نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قید کر دیا گیا ہو۔

"یہاں تو گھٹن کا سا احساس ہوتا ہے۔"

نیلی نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ انل نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے لگا نیلی کا لباس چڑچڑا کر پھٹ جائے گا۔ وہ اٹھنے لگا تو نیلی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"لاجو خوبصورت تھی۔؟"

وہ چپ رہا۔

"تم نہاتے رہے اور وہ کپڑے دھوتی رہی۔"

"ہوں۔"

"پھر تم اس کے قریب جا بیٹھے۔"

"ہاں۔؟ وہ آنکھیں موندے تھا اور نیلی اس کی چھاتی کو ہولے ہولے سہلا رہی تھی اور اس نے اپنا سر انل کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

"اور تم باتیں کرتے رہے۔"

"ہاں۔"

"بس۔"!

وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور نیلی کی طرف دیکھا۔ نیلی کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں یقین نہیں آرہا۔"

"تم آخری بات چھپا رہے ہو۔" وہ لیٹے لیٹے بولی ۔" میں نے بہت سی ناولیں پڑھی ہیں، فلمیں دیکھی ہیں۔ تم جو چھپا رہے ہو۔ میں پہلے سے جانتی ہوں۔" وہ ہنس دی ۔" لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو اس بات سے منہ پھلا لیتی ہیں، میں جانتی ہوں مرد ـــــ"

وہ کھڑا ہو گیا۔

پھر وہ جلدی سے جھنڈ میں سے باہر نکل آیا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ آسمان اب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اوپر جانے والے راستے پر ہو لیا۔

("اوراق" لاہور)

سلیم اختر

سیفو ۱۹۶۸

میرا شہناز سے تعارف ہوا تو میں اسے دیکھتے ہی دل نہ دے بیٹھا اس کی سیدھی سی وجہ یہ تھی کہ اس میں دل لے لینے والی کوئی انوکھی ادا نہ تھی۔ نمکین رنگ کا تو میں بھی قدر دان ہوں مگر کالے رنگ کا نہیں۔ بحیثیت ایک دوشیزہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت بڑی بڑی اور موٹی موٹی آنکھیں یا پرکشش لب نہ تھے بلکہ ذہانت تھی یقیناً وہ بلا کی ذہین تھی۔ ذہین کیا میں تو اسے غیر مشروط طور پہ انٹلکچول بھی ماننے کو تیار ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ لڑکی کی۔۔۔ ذہانت کے بارے میں میری کوئی ایسی اچھی رائے نہیں ہے۔ میں تو انہیں جذبات کی پوٹ سمجھتا ہوں اور اسی لیے ان سے صرف جذباتی تسکین ہی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ شہناز ذہانت میں بڑے سے بڑے مرد کا مقابلہ کر سکتی تھی لیکن تھی عورت ذات اس لیے نری عورت ہی ثابت ہوئی اور جذبات کے معاملہ میں اندھی ہو گئی انٹیلیکچول ہونے کے باوجود وہ میرے آرپار نہ دیکھ سکی اور نفسیات کی طالبہ ہونے کے باوجود وہ میرے "کرداری محرکات" کا تجزیہ نہ کر سکی۔

پہلی ملاقات میں اس نے مجھے گفتگو کے تین انداز، نفسیاتی طرزِ استدلال، ثقیل اصطلاحات اور غیر مانوس ناموں سے خوب ہی مرعوب کیا۔ خیر وہ مجھے کیا مرعوب کرتی میں تو خود ہی مرعوب ہونے پر تلا بیٹھا تھا۔ وہ اس لیے کہ میں اس کی سہیلی گلشن سے

تعارف کے لیے اسے وسیلہ بنانا چاہتا تھا۔ آج وہ اتفاق سے اس کے ساتھ نہ تھی ورنہ وہ دونوں تو ہمیشہ ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں بلکہ اس حد تک ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں کہ ان کی جوڑی خصوصی شہرت حاصل کر چکی تھی۔

دوسری ملاقات لائبریری میں ہوئی۔ وہ کتابیں واپس کرنے آئی تھی لیکن چند دنوں کی تاخیر کی وجہ سے جرمانہ ادا نہ کرنے کے لیے وہ کاؤنٹر کلرک سے مدلل بحث کر رہی تھی۔ کلرک میرا واقف تھا چنانچہ میں نے جرمانہ معاف کرا دیا اس نے چار اور موٹی موٹی کتابیں لیں اور میرے ساتھ ہی باہر آ گئی۔ ہم خاموشی سے چلتے رہے وہ پتہ نہیں کیا سوچ رہی ہوگی اور عینک کی موجودگی میں آنکھوں کی عبارت کا پڑھنا بہت مشکل ہوتا ہے باقی میری دلچسپیاں اور گفتگو کے محور غیر نصابی سرگرمیاں تھے مثلاً میں ہالی وڈ کے تازہ ترین اسکینڈلز یا مشہور ایکٹریسوں کے جیاتی اعداد پر خوب روانی سے بول سکتا ہوں۔ لیکن بغل میں چار موٹی موٹی کتابیں دبانے والی لڑکی سے ان موٹی موٹی کتابوں ایسی موٹی موٹی باتیں کرنا آسان کام نہیں۔

مین گیٹ پر ہم رک گئے۔ "اب کدھر؟"

"میں تو OFF ہوں" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تو چلئے پی جائیے؟"

"NO HARM-!"

میں نے اخلاقاً کہا "لائیے! کتابیں میں اٹھا لوں"

"نہیں نہیں! —— IT IS ALL RIGHT"

میں اسے ایک اچھے ریستوران میں لے آیا۔ اس نے بڑی لاپروائی سے بیٹھتے ہوئے

لوگوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور بغل میں چاروں کتابیں دبائے اور دوسرے بازو میں پرس لٹکائے چلتی گئی۔

"چائے یا کافی؟" ویٹر کے آنے پر میں نے پوچھا۔

" COFFEE "

اب تک میں موضوع تلاش کر چکا تھا چنانچہ میں نے نفسیات کے بارے میں ایک سوال کر دیا۔ اور وہ شروع ہو گئی۔

اس نے کافی کے تین کپ پئے اور وہ بھی دودھ یا کریم کے بغیر!

ہم باہر نکلے تو مجھے احساس ہوا کہ میری بجائے وہ مجھ سے مرعوب ہو چکی ہے۔ کمال ہے! میں نے نہ تو اس کے حسن کی تعریف کی (حسن تھا ہی نہیں) نہ فلرٹیشن کی کوشش (ہمت ہی نہ پڑی) اور نہ اسے پیپ ہی کیا (ذہین لڑکی کی خوشامد ٹیڑھی کھیر ہے) شاید وہ اس لیے "میری" ذہانت سے مرعوب ہو گئی ہو کہ میں نے اسے جی بھر کر بولنے کا موقع دیا اور خود کسی نالائق شاگرد کی طرح، حیرت سے منہ کھولے، استانی جی کے ہلتے لبوں کو، جن پہ بالوں کی لکیر ضرورت سے زیادہ ہی گہری تھی مسلسل تکتا رہا تھا یقیناً اسے میری یہی ادا بھا گئی۔

"پھر کب ملیں گی؟" میں نے بس اسٹاپ پر پوچھا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی ذہانت کا حسن تھا جس نے ان پرکھتی نظروں کے سامنے اپنا قد سکڑتے محسوس کیا۔ میں نے فوراً کہا۔

"آج کی گفتگو بہت دلچسپ۔ اور۔ اور INSTRUCTIVE رہی۔" اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر میں نے اسے بولنے نہ دیا۔ "میں۔ میں بھی اس مسئلہ پر اور

مطالعہ کرنا چاہتا ہوں - اسی لیے - اسی -"

اس نے ہنس کر بات کاٹی - "آپ کو پتہ ہے اگر گلشن آج ساتھ ہوتی تو اتنی بات بھی نہ ہو سکتی" (آہ! ذکر اُس پری وش کا!)

"کیوں؟" میں خوش ہوا کہ خود ہی گلشن کا ذکر آگیا۔

"وہ بہت بور ہے - اَن سوشل!"

" WHY " اس لفظ کے ساتھ میرا تمام چہرہ سوالیہ فقرے کا نشان بن گیا۔

"اب دیکھیئے نا -" اس نے بولنے کو منہ کھولا مگر اس کی نگاہیں مجھ سے ہٹ کر سڑک پر جا پہنچی تھیں - "اوہ! MY BUS "

"بس؟" میں نے مڑ کر دیکھا - "کہاں؟"

"وہ دیکھیں تو ۳ نمبر آرہی ہے -"

"کہاں؟" بس نظر تو آرہی تھی مگر میں ہی اندھا بن رہا تھا۔

"یہ دیکھیں تو -"

"یہ - یہ تو ۲۳ نمبر ہے -" میں نے جھوٹ بولا۔

"تیرہ؟"

" ہاں! ہاں!! - BOY GOD "

"اس نے پہلی مرتبہ مجھے اور طرح کی نگاہوں سے دیکھا - میں نے الجھ کر نظریں جھکا لیں - اس نے بس اسٹاپ کی طرف سے پیٹھ موڑ لی -" اچھا تو پھر ۱۳ نمبر ہی ہو گی -"

میں مطمئن تھا! مسرور تھا!! شاداب تھا!!!

جب میں نے اسے بازوؤں میں لیا تو وہ گھبرا کر بولی "WHAT ARE
YOU DOING" -

"کچھ نہیں!" میں نے چہرے پر بچپن کی تمام معصومیت لا کر کہا۔

"ہائے!" وہ جھرجھری لے کر بولی ۔ "کوئی آجائے گا ۔ "YOU
SILLY BOY" -

"تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ سب گھر والے باہر ہیں"

اس کی پھولی سانسوں میں سے الفاظ جیسے لڑھکے ۔

"BUT THAT DOESN'T MEAN THAT YOU SHOULD START
THAT"

لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ وہ اخلاقاً کہہ رہی ہے ۔

وہ کمرے میں لڑ رہی تھیں ۔ باہر وہ کھڑا تھا ۔

"وہ تمہیں خراب کر رہا ہے" گلشن کہہ رہی تھی ۔

"SO WHAT"

کمرے میں خاموشی ہو گئی (وہ دونوں بلیوں کی طرح ایک دوسری کو آنکھیں نکالے گھور رہی ہوں گی ۔ شہناز کی آنکھیں غصّے کی وجہ سے عینک کے اندر اور بھی سکڑی سکڑی ہوں گی اور غالباً گلشن کی ننھی سی ناک سرخ ہو رہی ہو گی)

کمرے میں سسکی!

کون رویا؟

"اب رونے کا کیا فائدہ؟" شہناز کہہ رہی تھی۔

گلشن نے جواب نہ دیا۔ شہناز بھی خاموش ہے (روتی گلشن کو دیکھ کر شہناز کی بے زاری محسوس کی جا سکتی تھی)

"شہناز!" بالآخر گلشن بولی۔ "تمہیں یاد ہے ہماری دوستی کتنی پرانی ہے؟"

"ہاں" (شہناز نے یقیناً گال پھیلا کر کہا ہوگا)

"کتنی؟"

"کئی سال" وہ اکتا کر بولی "بھئی اب میں کلینڈر لے کر تو بیٹھی نہیں"

"میں تمہیں بتاتی ہوں" گلشن کے لہجے میں ماضی کے تذکرے سے کھنک پیدا ہو رہی تھی۔

"ہم فرسٹ ایر سے اکٹھی رہی ہیں"

"ہاں۔ ہم فرسٹ ایر سے اکٹھی رہی ہیں" (وہ گویا سبق دہرا رہی تھی)

"اور لڑکیاں ہماری دوستی سے جلتی تھیں"

"ہاں! لڑکیاں ہماری دوستی سے جلتی تھیں" (الفاظ گویا ٹیپ ریکارڈز پر دہرائے جا رہے تھے)

"پروفیسر ہماری دوستی کی مثال دیتی تھیں"

"ہاں! پروفیسر ہماری دوستی کی مثال دیتی تھیں" (بازگشت! بازگشت!!)

"اور۔ اور ہم۔ ہم کتنا پیار کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے" (انبساط! انبساط!!)

"......"

"بولو شہناز! جان بولو" (کیا وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ رہی ہے؟) "بولو۔"

"......" (کیا شہناز سر جھکائے بیٹھی ہے؟)

"کتنی لڑکیوں نے ہماری دوستی خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔" (فخر! فخر!!)

"......" (کیا شہناز اسے دیکھ رہی ہے؟ مگر کن نظروں سے؟)

"......" (وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی ہیں کیا؟)

"......" (کمرے میں کیا ہو رہا ہے)

کیا ہو رہا ہے۔ کمرے میں؟؟

ہو رہا ہے کیا۔ کمرے میں؟؟؟

— اور باہر وہ اندر لگے پردہ کی طرح ساکت تھا!

"مجھے چھوڑ دو!" شہناز کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔

"اوہ!" (دھکے سے گرنے کی کراہ؛ یا دل سے نکلی آہ؟)

(سائنیس! سائنیس!!)

سائنیس — ؟؟؟

گلشن غصے سے بولی "اس نے تمہارے دل میں نفرت بھر دی۔"

"نہیں! نہیں!!"

"نفرت — ؟ نفرت — ؟ یہ سب کیا ہے؟"

"دیکھو گلشن!" وہ ایسے بولی گویا کسی بچے کو چمکار رہی ہو، "تم نے کبھی سوچا کہ تم کس راستے پہ جا رہی ہو۔"

" نہیں! اور نہ میں سوچنا چاہتی ہوں — میں تو تمہیں چاہتی ہوں "

" OH! DON'T BE ABSURD "

(خاموشی! خاموشی!!)

" تم عورت ہو "

" پھر؟ "

" اب ۔ اب میں کیسے تمہیں سمجھاؤں ۔ اف گلشن " WHY DON'T YOU

TRY TO UNDERSTAND

" میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتی " وہ چیخ کر بولی ۔ " میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی تھیں ۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں ۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے "

" ہاں! " شہناز کے لہجے میں گویا سیسہ ملا تھا ۔ " ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے "

" اور ۔ اور اب ہماری چھ سال کی محبت کو ایک مرد نے ۔ ایک ذلیل کتے نے ختم کر دیا " (اس نے خود کو قصائی کی دوکان پہ لٹکی رانوں کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھتے محسوس کیا)

" DONT ABUSE " وہ بپھر کر بولی ۔

وہ بھی جواب میں بپھری " DON'T ABUSE — میں تو اسے جان سے مار دوں گا " (اس نے مردہ خانے میں زہر سے اپنی نیلی لاش اور اخبار میں دو کالمی خبر دیکھی)

"دیکھو گلشن!" شہناز نے پھر کسی ٹھنڈے مزاج والی استانی کے لہجے میں کہا۔ "میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں ـــ میرے جذبات تبدیل نہیں ہوئے۔"

"تو پھر۔؟ تو پھر۔؟؟"

"بات نہ کاٹو۔" وہ چڑ کر بولی۔ "تم بہت جذباتی ہو۔ مگر میں نے اس معاملے پر بہت غور کیا ہے۔ تمہاری اور میری محبت کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ آخر یہ راستہ ہمیں کہاں لے جائے گا۔"

"....." (گلشن سوچ رہی ہے یا رو رہی ہے؟)

"تم نے یہ سب کچھ سوچا بھی ـــ؟"

"تم جانتی ہو مجھے مردوں سے نفرت ہے، میں جب اس لحاظ سے اپنا اور مرد کا تصور کرتی ہوں تو مجھے گھن آتی ہے۔ متلی ہوتی ہے۔"

شہنازبولی۔ "ہمارا یہ یونیورسٹی میں آخری سال ہے۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی۔ کسی نہ کسی کے پلے تو بندھو گی۔"

"میں شادی نہ کروں گی۔" وہ چیخ کر بولی۔ "ہرگز نہیں" (وہ مٹھیاں بھینچے جوش میں کھڑی ہو گئی)

"پگلی! شادی نہ کرو گی تو کیا کرو گی۔"

"تم سے محبت!"

"DON'T BE SILLY"

"میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے تمہارا دل میری طرف سے پھیر دیا ہے۔"

"WRONG، وہ تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔"

"ہاں!" وہ حقارت سے بولی "میری تعریف — تم تو گدھی ہو۔ وہ تو مجھ میں دلچسپی لیتا ہے" (اس کا سانس رکا ہے، کان کھڑے ہیں)۔

"WHAT" (سانس اب تک رکا ہے)

"میں آج اسے لفٹ دوں تو وہ تمہیں چھوڑ دے۔"

"تم حسبِ معمول چل رہی ہو" (جی رکھ! شیر دی بچی!!)

"نہیں میں چل نہیں رہی — لیکن میں نگاہیں تو پہچان سکتی ہوں۔"

"تم نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا؟"

"بھوک —" (اوہ! کتا!!)

"WRONG"

"میں اسے سمجھتی ہوں۔"

"بکتی ہو۔"

"اندھی ہو۔"

"میں نے تو سوچا تھا کہ ہم تمام عمر اسی طرح رہیں گے تم مجھے پیار کرتی رہو گی تم مجھے ..."

"BUT HOW? ہم سوسائٹی میں رہتے ہیں، ہمارے گھر والے زندہ ہیں۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔"

"ہنھ!" (وہ شہناز کے لبوں کے کونوں کو حقارت سے اوپر اٹھتے دیکھ سکتا تھا)

"میں خود کسی میں دلچسپی نہ لوں لیکن دوسرے مجھ میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔"

"کیا بے تکی ہانک رہی ہو۔"

"تمہیں یاد ہے نا وہ پروفیسر!"

"THAT SILLY BRUTE"

"ہاں۔ کیسے کتابیں لیے میرے پیچھے پیچھے پھرتا تھا۔"

"مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"میں تم سے زیادہ خوبصورت ہوں۔"

"SO ?"

"تم سے زیادہ سیکسی بھی ہوں۔"

"SO WHAT"

"میں تمہیں بچاؤں گی۔ ہر قیمت پر!"

دو دن بعد گلشن مجھے ملی تو بولی "آپ کہاں رہے اتنے دن۔؟" میں خاموش اسے دیکھتا رہا۔

"چلیے چائے پینے چلیں!" وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

("سیپ" کراچی)

رفعت مرزا

رحمِ مادر سے نکلنا تھا عبث

اب یہ اس کی برداشت سے باہر تھا کہ وہ مزید نصف لمحہ بھی اور وہاں ٹھہرتا اور سونے کی کیلیں جڑے نوکیلے دانتوں والی اس عورت کی لتاڑتی بھٹیارنوں کے سے الفاظ، سر جھکائے جیسے دُم کو ٹانگوں میں دبائے ـــ ایک کونے میں کھڑا، ہنستا ہی چلا جاتا ـــ وہ اس کا دفاع کر سکتا نہیں تھا ـــ تب پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے سر اٹھایا اور اپنی فائلیں گویا میز پر سے نوچ کر اٹھائیں، فلاسک کو بغل میں دابا اور بے حد غُصیلے بچوں کے سے انداز میں اپنے پاؤں زور زور سے زمین پر دے دے مارتا ایک زناٹے میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ لوہے کے بڑے پھاٹک سے تیزی کے ساتھ نکلتے ہوئے اسے ٹھوکر لگی اور فلاسک بغل میں سے نکل کر پکی اینٹوں کی سڑک پر جا گری۔ ایک دھماکے کے ساتھ اس کے ڈھکن دُور گرے اور کرچیوں ملی سکنجبین کا سڑک پر چھڑکاؤ سا ہو گیا۔ ایک لمحے کو وہ جھجک کر کھڑا ہوا۔ پھر اپنے فوجیوں کے سے مضبوط بوٹوں کی نوک سے فلاسک کو ٹھوکر مار کر نالی میں پھینک کر، سر کو دونوں کندھوں پر بے حد اونچا اٹھائے، ناک کی سیدھ میں دیکھتا تیز تیز چلتا وہ گلی میں سے نکل گیا۔ تب ہی وہ سیّد زادی بھی جو پاؤں ننگے اس کے پیچھے بھاگتی لوہے کے گیٹ سے باہر نکل آئی تھی، تنہا سڑک کو دیکھ کر رُک گئی۔ گلی کے آخری سرے پر کانٹوں بھری دھوپ میں لرزتا اس کا سایہ پل بھر کو اسے نظر آ کر غائب ہو گیا۔ لال بھبھوکا رنگ لیے،

لرزتے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے، اس نے گیلی سڑک پر بھیگی کرچیوں اور نالی میں پڑی فلاسک کو نظر بھر کر دیکھا، پھر آہستہ سے مڑ کر واپس اندر چلی گئی۔ پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے جاتے کے لیے اس کا دوپٹہ پھاٹک سے ابھرے ہوئے کیل میں پھنس گیا۔ جھٹکے کو محسوس کر کے وہ یکدم دو قدم پیچھے ہٹ آئی۔ مگر دوپٹہ یہاں سے وہاں تک دو ہاتھ پھٹ چکا تھا۔ ایک جھٹکا دے کر اس نے دوپٹہ کھینچا اور آگے چلی۔ پھٹا ہوا دوپٹہ زمین پر گھسٹتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"اچھی سازش تھی۔" اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے سیدہ رفیعہ آفتاب بڑی پہچان سے مسکرائی۔ دھیما اور پُرسکون لہجہ، کہ جیسے اس نے یہ بات کمرے میں بیٹھی سلمہ، رابعہ اور تنویر سے نہ کہی ہو۔ خود کو کوئی بہت ہی پُرلطف واقعہ یاد دلایا ہو۔ "آج بہرحال آخری دن ہی تو تھا۔ مگر تم سبھوں نے مل کر اسے واقعی آخری ہی بنا ڈالا۔" برقعے کے بٹن لگاتے لگاتے وہ ان تینوں کی طرف دیکھ کر پھر مسکرائی "دو چھوٹے چھوٹے پیار، اور چھوٹی چھوٹی معصوم خوشیاں، مگر ہر تیسرا شخص ہم انسانوں کی ننھی منی خوشیوں پہ کیدو بنا بیٹھا ہے۔" اس نے جھک کر برقعے کا سب سے نچلا بٹن بند کیا۔ پلنگ پر وہ تینوں کی تینوں گھٹنوں کے گرد ہاتھ لپیٹے، ایک ہی انداز میں گھٹنوں پہ ٹھوڑیاں جمائے تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ لاتعلق سی، صرف تنویر تھی جو اپنے ہنسی سے پھڑکتے ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے، بڑے تمسخرانہ انداز سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "اگر میری گردن پر پیار کرتے ہوئے اسے آج تمہاری ماں نے دیکھ لیا ہے تو اس میں اس قدر کا چڑیلوں والا رویہ دکھانے کا کیا جواز تھا۔ مگر مجھے کیا پرواہ ہے؟؟ یہ تو اپنے اپنے اعتماد کی بات ہے۔ کہ کون کس کو کتنا چاہتا ہے۔ اور کس رنگ میں چاہتا ہے۔" وہ دم بھر کو رکی اور سر اٹھا کر ان تینوں کی طرف دیکھا۔ "مگر میں حیران ہوئی ہوں کہ بند دروازوں کی جھریوں سے اس دن تمہاری ماں کیوں جاسوسی نہیں کر رہی تھی۔ جس دن تم نے اس کی فائلوں میں خط رکھا تھا یا جس دن تم نے میز کے نیچے

اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دیا تھا یا جس دن تم نے اس کو اس کے ٹہلنے پر کاٹ کھایا تھا۔“
”پناہ بخدا۔“ سلمہ نے بے حد خوف زدہ ہو کر زیر لب کہا اور گھٹنوں کو اور بھی زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ پھر اس نے نقاب برابر کیے۔ ”اچھا دوستو خدا حافظ۔“ اس نے بڑی خوش دلی سے سب کو مخاطب کیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی تنویر نے اس قہقہے کو جس کو وہ بڑی دیر سے اپنے گلے میں پال رہی تھی، اُگل دیا۔ بلند اور تیز۔ اور طویل! لوہے کے بڑے پھاٹک تک اس قہقہے نے اس کا تعاقب کیا، مگر وہ ویسے ہی خواب آلود دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی۔ مدھم مدھم مسکراہٹ لبوں پہ لیے، لمحہ بھر کو بھی رُکے بغیر، رُک کر پیچھے دیکھے بغیر، چُپ چاپ، گلی میں نکل آئی۔

تب ہی وہ بھی جو ضدی اور غصیلے بچوں کی طرح زمین پر پیر مارتا، اس کمرے میں سے نکلا تھا، اور پکی اینٹوں کی پوری گلی پار کرتے وقت اور فاصلے کا خیال کیے بغیر سر اونچا اٹھائے، ناک کی سیدھ میں دیکھتا، آخر کو گھر جا پہنچا۔ آخر اگست کی دم گھونٹنے والی دوپہر اور سارا گھر بند دروازوں کے پیچھے سویا ہوا۔ جی ایک دم دھک سے رہ گیا۔ ایسا سناٹا!! ایسی خاموشی!!! اور میں تنہا؟؟؟ اور تنہا میں؟؟؟ خوف اور تنہائی اور اکیلے پن، اور اس اکیلے پن میں اپنی ذات، اپنے وجود کی طرف سے ایک خوف زدہ کرنے والی دوسراہٹ کا احساس!!۔ اپنے آپ کے ساتھ تنہا ہونے کا خوف۔ اس کا جی چاہا، وہ دھوپ بھرے صحن میں نکل کر خود ہی اونچے اونچے بولنا شروع کر دے، چارپائیاں گھسیٹے، بند دروازوں کے کواڑ کھٹکھٹائے، صحن میں لگے نل سے بالٹیاں بھر بھر کر صحن میں چھڑکاؤ کرے، کہ اتری شام کے دھوکے میں، بند کواڑوں کے پیچھے سوئی پڑی زندگی اُٹھ کر چہل پہل اور ادھر اُدھر، صحن میں نکل آئے۔ مگر وہ صرف، اپنے کمرے کے وسط میں، بغل میں فائلیں دبائے چُپ چاپ کھڑا رہا۔ اپنی دھڑکن کی آواز کے احساس سے خوف زدہ!! اس نے فائلوں کو زور سے میز پر پھینکا۔

مگر ہلکے سے شور کے بعد کا سناٹا۔ اس کو اور بھی خوفزدہ کر گیا۔ ڈرتے ڈرتے وہ بستر کی طرف گیا پلنگ
کی پٹی پر بیٹھا، بیٹھ کر پھر پھسل کر لیٹ گیا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ تنہائی اور خوف اور سناٹے میں اپنے
دھڑکتے وجود کا احساس اس کے غصے کو چاروں طرف سے لپیٹ چکا تھا، مگر اس لمحہ جب اس نے
ڈرتے ڈرتے آنکھیں بند کیں، اس لمحہ وہ تنتناتا ہوا غصہ، تنہائی اور خوف کے خول کو چیرتا نکل آیا۔
اور اسے شام کا لانا دشوار ہو گیا۔ اچھل کر وہ بستر سے اٹھا اور لپک کر کونے کی میز پر پڑی قینچی کو
اٹھا لیا۔ پھر اس کی دھار آزمانے کی خاطر اس نے اپنے ہاتھوں پاؤں کے بیس ناخن کاٹے، پھر
شیشے کے پیپر ویٹ، جس پہ وہ سات دنوں کی شیو کے بعد آٹھویں دن اپنا بلیڈ تیز کیا کرتا تھا،
پر اس نے قینچی کی دھاروں کو تیز کیا۔ اپنے حرکت کرتے بازوؤں کی پھسلتی مچھلیوں کو آئینے میں
دیکھتا ہوا وہ اداسی سے مسکرایا، پھر پسینے سے جسم کو چپکتی ہوئی بنیاں کو اتارتے ہوئے اس نے
سوچا کہ اس نے پتلون کا بوجھ بھی کیوں اٹھایا ہوا ہے۔ اور کھڑکی اور دروازے کے پردے برابر
کرنے کے بعد اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ بنیان کا گولا بنا کر پلنگ کے نیچے پھینکا، پتلون کو کھونٹی
کے ساتھ ٹانگا اور خود پلنگ کے نیچے کے اندھیرے اور کچی اینٹوں کے نمناک فرش سے لپٹ کر
سو گیا۔ مگر پیٹ کے نچلے حصہ میں وہ جو اک علین سی بوجھ بنی بیٹھی تھی، اس نے چین سے سونے بھی نہ دیا۔
شام ہوئی تو اس نے اٹھ کر کواڑ کھولے اور غسل خانے کی سمت چلا گیا۔ دیر تک نل کھولے وہ چپ
چاپ، ایک کونے میں، خوفزدہ کھڑا رہا۔ گرتے پانی کی دھار پہ نظریں جمائے، وہ دیر تک کھڑا
رہا۔ پھر کپڑے پہنے۔ منہ پہ پانی کے دو تین چھینٹے مارے اور باہر نکل گیا۔ بلند و بالا گھنٹہ گھر
کے سائے میں کھڑے ہو کر اس نے کچھ دیر گزرتی زندگی کی ہماہمی اور ریل پیل کا نظارہ کیا۔ دائیں
ہاتھ کھڑے طالب علموں کی ٹولیوں کو شہر کی لڑکیوں کے بارے میں گرما گرم قسم کی گفتگو کرتے سنا
اور پھر دائرہ کاٹتا ہوا وہ انارکلی کو چلا۔ ہلکے جامنی اور گلابی اور نیلے اور سرخ اور زرد رنگوں

میں اس نے کتنے ہی ریشمی ریشمی ربن خریدے ۔ اور دھیمی دھیمی، نرم اور شرمیلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے، نیچی نگاہوں سے اس نے دوپٹے پر کا سودا بھی کیا اور خریداری کا لفافہ بغل میں دبا کر وہ خاموشی سے وہاں کا ٹھٹرا اتر گیا۔ وہی نرم، دھیمی، شرمیلی مسکراہٹ اور گیلی گیلی آنکھیں، اپنی خریداری کا لفافہ بغل میں دبائے وہ رات گئے تک شہر میں گھومتا رہا۔ "رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم پھر دیکھیئے کیا ہو" کی تکرار کرتا وہ جب گھر میں داخل ہوا تو سوائے بی بی کے سب لوگ چھت پر سونے جا چکے تھے۔ سب لوگ، جو صرف اس کا باپ تھا۔

"آ گیا نامراد، خدائی خوار، نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ وہ اسے دیکھتے ہی دبی دبی آواز میں چیخی، کہ ڈرتی تھی اوپر چھت پہ بڑھاپے کی نیند سے دست و گریباں، خاوند سن نہ پائے۔ "غضب خدا کا تم نوکر کیا ہوئے لڑکے تم تو بالکل ہی آپ ہدرے ہو گئے، مجال کیا جو ماں باپ کا شرم لحاظ آنکھ میں رہا ہو۔ ہمارے جیتے جی تو یہ شہدا پن نہ ہو سکے گا۔ سیدھے سیدھے سرِ شام گھر آ جایا کرو ورنہ کہتی ہوں تمہارے باپ سے۔ سُنا تم نے!!"

"جی ۔" وہ نیچی نظروں سے مسکراتا رہا۔ "لو اب کھا بھی، میں کیا ساری رات تیرے لیے بیٹھی رہوں گی ؟؟" اس کی آواز میں اب مامتا کی نرمی اور گرمی تھی۔ وہ چپ چاپ کھانے پر جھک گیا اور دھیمے دھیمے، دبے دبے لہجے میں اس نے بی بی کے سارے سوالوں کا جواب دیا۔ کہ دن بھر اس نے کیا کیا۔ کہاں کہاں گیا، کن لوگوں سے ملا، کیا کھایا، کس نے کھلایا، کس کو کھلایا اور کیوں پیسے ضائع کیے۔ اور یہ سب جھوٹ تھا۔ اور ایک بار نوالہ بناتے بناتے اس نے نظر اٹھا کر سفید دوپٹے میں لپٹے ہوئے اس سانولے چہرے کو دیکھا، جس کے چہرہ پہ گنتے جھریوں کے جال میں اس کی عمر بھر کی داستان رقم تھی۔ اور تب ہی اس کے گلے میں کچھ موٹا موٹا سا آ پھنسا۔ اس نے نگلنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ "اور۔ بی بی جانے کیوں جی اتنا بھاری بھاری سا

دہنے لگا ہے سینے میں کسی نے پتھر کی سل رکھ دی ہو جیسے۔" اس نے پھر اپنے گلے میں پھنسی اس انجانی شے کو نگلنے کی کوشش کی۔" امد بی بی تم نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا تھا۔ میں نے کب کسی بات کے لیے ضد کی تھی۔ مجھے تو یاد نہیں۔ یہ کیسی جلا وطنی میں تم نے مجھے ڈالا ہے۔ کہیں کوئی سُکھ نہیں۔ کہیں کوئی اپنا نہیں۔ فاختہ نے جھاڑیوں میں دو انڈے دیئے تھے۔ کتنے دنوں سے سے رہی تھی، آج انہیں کتا پی گیا۔ دیکھا تم نے بی بی۔ کہیں بھی تو کوئی سُکھ نہیں۔ سارے بیگانے ہیں۔ آؤ بی بی تم تو میری ہو۔ آؤ تم تو میری ہو۔ چلو آؤ اب تم اور میں یہاں سے کہیں اور چلیں۔ جہاں سُکھ ہی سُکھ ہوں۔ اور فاختہ کو کوئی کتا تنگ نہ کرے، اور وہ جھاڑیوں پیچھے، آرام سے بیٹھی اپنے دونوں انڈے سیتی رہے۔ چلو بی بی تم اور میں لبنان چلیں۔ آہ میری آرزو، میرا خواب، میری سرزمین، میں وہاں بستی بستی، قریہ قریہ گھوم گھوم کر حُسن کے گیت گاؤں گا۔ وہاں کی خوبصورتی کی مدح کہوں گا۔ سیاہ آنکھوں کو چوم کر سیاہ بالوں کی گھٹا کے سائے میں آنکھیں بند کر لوں گا۔ اور جب شام ڈھلے میں، میلوں کی مسافتوں اور حسن اور خوبصورتی اور امن کے نشے میں چُور گھر آیا کروں گا تو تم دروازے پر مسکراتیں، امن اور شانتی کا نشان، مجھے بلا کرو گی۔ میں کہوں گا بی بی اس دنیا میں تم ہو یا پھر میں۔ اور سب جھوٹ ہے۔ سراب ہے۔ ایک حقیقت تم ہو ایک حقیقت میں۔ اور تھکن میری نس نس میں ہے۔ اور مجھے تھپک کر سُلا دو۔ تو تم بی بی، مجھے گود میں لے کر میری آنکھوں میں نیند کا جادو پھونک دیا کرنا اور میں چپ چاپ اور سکون اور طمانیت سے تمہاری گود میں سوتا رہوں اور تم ویسے ہی احتیاط سے اور اپنائیت سے مجھے لیے بیٹھی رہنا، جیسے تم نے نو ماہ مجھے پیٹ میں رکھا۔ اور دنیا میں کہیں سُکھ نہیں سوائے ان نو مہینوں کے۔ آؤ بی بی۔ آؤ ناں ہم اور میں لبنان چلیں۔ یا افریقہ کے گرم ساحلوں کو چلیں یا۔ یا۔" اور بی بی گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے، اس کی طرف دیکھتی رہی، مگر آج کا خواب

اُدھورا رہا کہ اچانک ہی آج کے گزرے دن میں اپنا چلتا پھرتا وجود اس نے پھر سے دیکھ لیا تھا۔ نوالہ بنا کر منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے اپنی جُھکی آنکھوں کو اٹھا کر بی بی کی طرف دیکھا تو چہرے پر جلتی لکڑ تیل کی لپکتی لَو میں اس نے بی بی کی چمکتی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھی۔ اپنا آپ۔ فائیلیں بغل میں دبائے، لوہے کے بڑے پھاٹک سے نکلتے، ٹوٹی فلاسک کو پاؤں کی ٹھوکر سے نالی میں گراتے اور پھر کچی اینٹوں کی گلی پر نعرہ نعرہ سے پاؤں مارتے، ناک کی سیدھ میں دیکھتے، وقت اور فاصلے کا احساس کیے بغیر چلتے ہوئے، اور سونے کی کیلیں جڑے نوکیلے دانتوں والی اس عورت کی تیز آواز اور کٹیلے لہجے میں اونچی اونچی باتیں، اور چاروں طرف گم سُم چپ چاپ کھڑی چار لڑکیاں، اور گردن جھکائے، دم کو ٹانگوں میں دبائے مسکین اور وفادار کتوں کی صورت اس کا پانچ فٹ اور گیارہ انچ کے قد میں کھڑا وجود کہ آج اس نے سیدہ رفیعہ آفتاب کی گردن پہ چمکتے ہوئے تِل کو، سلمہ کے شعبِ خوابی کے کمرے میں تنہائی کے بھرے میں آکر چوم لیا تھا۔ تب، جب وہ تینوں کی تینوں لڑکیاں اچانک ہی کسی کام سے باہر نکل گئی تھیں۔ اور اب وہی ایک لمحہ کہ جب اس تیز، نوکیلے سونے کی کیلیں جڑے دانتوں والی اس چڑیل نے اسے ان چاروں لڑکیوں کے سامنے برہنہ کر دیا تھا۔ برہنہ ہو کر اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کا نوالہ سامنے پڑی سالن کی پلیٹ میں گرایا اور خاموشی سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بی بی نے جب چپ چاپ، اپنی پلکوں پہ آئے آنسو سمیٹے اور پھر بڑبڑاتی "میرا بچہ ۔" اس نے گہرا سانس بھرا، کہ جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو۔ سمجھتی ہو۔ اور وہ کہ باورچی خانے میں بی بی سے اپنی خواہشوں کے ذکر کے دوران، اس کی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھ کر اٹھ آیا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر دم بھر کو رک گیا۔ پیٹ کے نچلے حصے میں جلن کا دِجھ پھر جاگ اٹھا تھا اور دھڑکن بن کر

اس کے ہر نس کو ایک نالی پر بجا رہا تھا۔ تنتناتے ہوئے تاروں ایسے اعصاب سے بنے ہوئے جسم کا بوجھ اپنی لرزتی ٹانگوں پر اٹھائے وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں چلتا، آہستگی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر کے اس سے پشت لگا کر چند لمحات کھڑا اپنی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ پھر ایک بھی آہٹ پیدا کیے بغیر، پنجوں پر چلتے ہوئے، آگے نکل کر اس نے پردے برابر کیے۔ کھڑکی کھول کر، سمٹے ہوئے پردوں کے بند کھول کر انہیں پھیلایا، پھر دبے پاؤں چلتا بستر کے قریب آیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر شور کرتا ہوا خاکی رنگ کے کاغذ کا لفافہ نکالا، کھولا اور پھر ہاتھ کو اونچے لے جا کر لفافہ پلنگ پر خالی کر دیا۔ رنگ برنگ ربنوں کے بل کھلتے، چکر کھاتے، لہریں لیتے، آپس میں گڈمڈ ہوتے، پلنگ کے عین بیچوں بیچ ڈھیر ہو گئے۔ اور بند ریزر بھی۔ اس نے لپک کر مگر بڑی احتیاط کے ساتھ انہیں اٹھایا اور کھول کر ربنوں کی ریشمی قوس قزح کے پاس رکھ دیا۔ آنکھوں میں اک پراسرار چمک لیے، لبوں پر گیلی گیلی سی مسکراہٹ کو سجائے اس نے اپنی پوری اونچائی سے اپنی پوشیدہ خوشیوں کے اس خزانے کو دیکھا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اطمینان کے ساتھ کپڑے بدلتے بدلتے اس نے بڑی میز پر بڑے آئینے کے پاس پڑی قینچی کو اٹھایا اور پلنگ پر اچھال دیا۔ اور ایسا کرتے کرتے پلٹ کر پلنگ کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر دیکھتا رہا۔ اور جب وہ دوبارہ کپڑے بدلنے کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اس کی نرم اور میٹھی اور معصوم مسکراہٹ اور بھی گہری تھی۔ آنکھوں کا رنگ گہرا گلابی اور گیلا گیلا۔ پھر اس نے بتی بجھائی اور پنجوں پر چلتا ہوا بستر کی طرف چلا گیا۔

پھر بستر پر لیٹتے ہی لیٹتے۔ مگر ایک کنارے پر آ کر جھک کر پلنگ کے نیچے سے رات

کی خریداری کا خاکی اور خالی، شور کرتا ہوا لفافہ اٹھاتے ہوئے اس نے جانا کہ ایک اور دن طلوع ہو چکا ہے۔ گرم، چلچلاتا ہوا، پسینے کی چپچپاہٹ، صبح ہی صبح اسے اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھی۔ پھر ریشمی کترنوں کے غبار اور ریزہ ریزہ کے بے ربط ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے اس نے طلوع ہونے والے دن کی طرف دیکھا۔ "کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں!!" ہر دن رات کی آرزو میں جلنا اور ہر شب صبح کی آہٹوں کی طرف کان لگانا!!" پھر اس نے وہ لفافہ بند کیا۔ بستر سے اترا، پلنگ کے نیچے سے اپنا بکس کھینچا، اسے کھولا، اس لفافے کو بکس کی سب سے نچلی تہ میں رکھا۔ بکس بند کیا، تالا لگایا۔ پھر بکس کو پلنگ کے نیچے دھکیلا۔ قینچی کو میز پر رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

("ادبِ لطیف" لاہور)

اشرف جاوید

ٹھنڈی لڑکی

کار سے اتر کر وہ جھجکی۔

اسپتال میں داخل ہونے کے لیے ابھی اُسے پانچ سات سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔ اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ لیکن پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

"آخر میں یہاں ایک نیک مقصد کے لیے آئی ہوں۔"

وہ ایک ایک سیڑھی پر رک رک کر چڑھی۔ دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ایک بڑے ڈیسک کے پیچھے ایک نرس بیٹھی ہوئی تھی۔

"فرمائیے۔" نرس نے نظروں ہی نظروں میں اس کے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ کچھ کہنے کے لیے سانس درست نہ کر پائی تھی کہ نرس پھر بولی۔

"میٹرنٹی وارڈ میں داخلہ لینا ہے آپ کو؟"

"نہیں، نہیں۔" وہ گھبرا سی گئی۔ "مجھے ایک مریض سے ملنا ہے مسٹر فرید نام ہے ان کا۔"

"کمرہ نمبر ——؟"

"۱۰۵۔"

نرس نے سامنے رکھے ہوئے چارٹ کو دیکھا "وہ تو تیسری منزل پر ہے اور آج ہماری لفٹ خراب ہے، آپ اس حالت میں اتنی سیڑھیاں نہ چڑھ سکیں گی۔" نرس کے لہجے میں ایسی

ہمدردی کی جھلک تھی جو ایک عورت ہی دوسری عورت کے لیے محسوس کر سکتی ہے۔

"پھر ایسا کیجیئے کہ ڈاکٹر خان کو بلا دیجئے۔ مجھے انہی نے بلایا تھا۔"

"میں انھیں فون پہ بلائے دیتی ہوں۔ آپ بیٹھئے۔"

کرسی پر بیٹھ کر اس نے ارد گرد نظر دوڑائی اور آخر میں اس کی نظر سبز صوفوں پر جم گئی۔ "نہ جانے اس وقت فرید کی حالت کیسی ہو گی۔" اس نے سوچا۔

"مگر۔۔ ڈاکٹر صاحب۔ وہ اس وقت اس حالت میں نہیں ہیں کہ اوپر آسکیں۔"

نرس فون پر ڈاکٹر کو سمجھا رہی تھی۔۔

ثریا نے نرس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ "ڈاکٹر صاحب میں مسز جمال بول رہی ہوں۔"

"اوہو۔ آپ ہیں مسز جمال۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ کا آنا بیکار رہا۔ فرید صاحب تھوڑی دیر پہلے چل بسے۔ صبح جب میں نے آپ کو فون کیا تھا وہ اس کے تھوڑی دیر بعد بے ہوش ہو گئے تھے۔ اور پھر ہوش میں نہ آئے۔ اگر آپ انھیں دیکھنا چاہیں تو میں انتظام کر سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں دیکھنا چاہتی، شکریہ!" اس نے جلدی سے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

کرسی سے اٹھ کر کار کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے دل پر ہلکا سا بوجھ محسوس کیا۔ "بیچارا فرید، اس کی آخری خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ مگر اس میں میری کیا خطا ہے۔ مجھے اس نے بلایا ہی کیوں؟ میں اس کی کون ہوں؟ میں جو اس سے اتنی نفرت کرتی تھی۔"

راستے بھر وہ ان ہی خیالوں میں ڈوبی رہی۔ گھر واپس پہنچ کر وہ لان میں دیر تک کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اتنے میں ملازمہ نے آکر کہا "بیگم صاحبہ کھانا کھا لیجئے، دو بج گئے ہیں۔"

"کھانا اٹھا کر رکھ دو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ بولی۔

ملازم نے آرام کرسی لاکر دھوپ میں ڈال دی۔ اور وہ اس پر جا کر بیٹھ گئی۔ سانس کا فرمن پھر کھٹکنے لگا۔ "میں اس کا منہ ہی دیکھ لیتی۔ نہ جانے اب وہ کیسا لگتا ہوگا۔ بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہوگا۔ پچھلے چار سال میں کتنی تبدیلیاں ہوگئیں۔"

فرید ایم۔ اے میں اس کا ہم جماعت تھا۔ لمبا تڑنگا، لحیم شحیم۔ یونیورسٹی کے طلبا میں عام طور سے اسے بدتہذیب، بدتمیز سمجھا جاتا تھا۔ سنجیدہ اور مہذب لڑکے اس سے بات کرنے سے گریز کرتے۔ صرف چند لڑکوں کا گروہ تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ جب وہ ان کے درمیان کھڑے ہو کر قہقہے لگاتا یا آوازے کستا تو آس پاس بیٹھی ہوئی لڑکیاں اپنی کتابیں سمیٹ کر دور جا بیٹھتیں۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کئی سال بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد وہ جانے کیسے پاس ہوگیا تھا اس بات پر اسے خود بھی حیرت تھی۔ ایم۔ اے میں داخلہ اس نے بقول خود تفریح اور وقت گزاری کے لیے لیا تھا۔ وہ اپنے نئے نئے سوٹوں، بھڑکیلی ٹائیوں اور دوستوں میں مگن رہتا۔ اس کا باپ جاگیردار تھا جس نے فرید کو ایک لمبی شیورلٹ دے رکھی تھی اور جو اسے ہر مہینے اتنا روپیہ بھیج دیتا تھا کہ اس کی اور اس کے دوستوں کی ہر قسم کی تفریح کے لیے کافی ہوتا۔

ثریا سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ جب وہ جماعت کے بعد اوپر لائبریری میں پڑھنے جاتی تو فرید اور اس کے دوست سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاتے اور ثریا ان لوگوں سے بچتی بچاتی بڑی مشکل سے اوپر جاتی۔ اس نے بہت کوشش کی، ثریا اس کی طرف متوجہ ہو مگر اس نے فرید کو کوئی لفٹ نہ دی۔ آخر تنگ آکر اس نے ثریا کا نام "ٹھنڈی لڑکی" رکھ دیا اور چند ہی دنوں میں یہ خطاب ہر لڑکے کی زبان پر تھا۔

ثریا کو اپنا خطاب یاد آیا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ کیسے عجیب دن تھے وہ بھی۔ وہ خطاب شاید ٹھیک ہی تھا۔ سچ مچ وہ ایک "ٹھنڈی لڑکی" تھی ہمیشہ سے خاموش اور پُرسکون زندگی کی عادی۔ رومان اور عاشقی کے لیے اس کی زندگی میں گنجائش ہی نہ تھی۔ امیر گھرانے کی تھی اور ساتھ ہی خوبصورت بھی۔ اس لیے بہت سی نظروں نے اس کی نظروں میں جگہ ڈھونڈھنے کی کوشش کی مگر وہ ان باتوں سے بے نیاز تھی۔ اپنی کلاس کے لڑکوں سے بہت کم بات کرتی۔ لڑکیوں میں سے بھی صرف چند سے ہی اس کی دوستی تھی، ورنہ اس کا زیادہ وقت اپنی کتابوں میں ہی صرف ہوتا۔ ٹھنڈی، اور بے جان کتابیں ہی اس کی دوست تھیں۔ اور اس نے کبھی اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی تھی کہ ان کتابوں سے باہر ایک رنگ بھری ہنستی کھیلتی دنیا آباد ہے۔

پھر وہ ایک دن خالی پیریڈ میں لان میں بیٹھی تھی کہ فرید آ پہنچا۔

"مس ثریا! میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟"

وہ خاموش رہی اور اپنی نظریں کتاب پر جما دیں۔

"آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ میں آپ کے جتنے قریب آنا چاہتا ہوں آپ مجھ سے اتنا ہی دور بھاگتی ہیں۔" وہ تھیٹریکل انداز میں لیے چلا جا رہا تھا۔

ثریا کھڑی ہو گئی۔ غصے کے مارے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور لڑکیوں کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس دن کے بعد سے اسے فرید سے اور نفرت ہو گئی۔

امتحان سے کوئی مہینہ بھر پہلے ثریا نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا۔ پھر اس نے فرید کو کبھی نہیں دیکھا۔ ثریا نے ایم۔ اے کیا تو اس کے اباجی کے دوست کے خاموش اور شرمیلے

لڑکے جمال نے سی۔ ایس۔ پی میں کامیابی حاصل کی اور پھر ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے معاملے میں بھی وہ اتنی غیر جذباتی تھی جتنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں۔ مگر ان کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب تھی۔ اس کا شوہر اس سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح خاموش زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ دن بھر ثریا گھر کو سنوارنے اور سجانے میں لگی رہتی۔ یا انگریزی ناول پڑھتی۔ کبھی آس پاس کی کوٹھی سے کوئی اس کی جاننے والی آجاتی۔ یہاں تک کہ چار بج جاتے اور اس کا شوہر دفتر سے واپس آجاتا۔ ان کی شامیں زیادہ تر گھر پر ہی گزرتیں۔ پارٹیوں اور تقریبوں میں جانا انھیں پسند نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی سے ہر طرح مطمئن تھی۔ اور اب شادی کے دو سال بعد ان کا پہلا بچہ ہونے والا تھا۔

اس کے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا، تو وہ چونک پڑی۔ اس کا شوہر کرسی کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ارے چار بج گئے؟"

اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہ اندر جانے لگی تو اسے محسوس ہوا کہ اتنی دیر سوچتے رہنے سے اس کی طبیعت بوجھل ہو رہی ہے۔ وہ کپڑے بدلنے اندر گیا تو ثریا ڈرائینگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر سوئٹر بننے لگی۔ صبح کا واقعہ اسے یاد آگیا۔

ڈاکٹر نے اسے فون پر کہا تھا "مسز جمال میرے ایک مریض مسٹر فرید آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کی حالت بہت خراب ہے اور آج دوپہر تک بھی ان کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ ان کی آخری خواہش یہی ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" اور پھر وہ دیر تک سوچتی رہی کہ وہاں جائے یا نہ جائے۔ کیا اس کا جانا مناسب ہوگا؟

"آج دن بھر کیا کرتی رہیں ڈارلنگ؟" جمال نے پوچھا۔

"میں اسپتال گئی تھی۔" اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپی تھی۔

"کیوں؟" وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "سنو! میں نے تمہیں ایک مرتبہ فریدکے متعلق بتایا تھا نا۔ وہ میرے ساتھ پڑھتا تھا اور مجھے بڑا پریشان کرتا تھا۔ وہ آج اسپتال میں مرگیا۔ وہ کئی مہینے سے بیمار تھا۔ زیادہ شراب پینے سے اس کے پھیپھڑے گل گئے تھے۔ آج صبح ڈاکٹر نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں دوپہر وہاں گئی تھی مگر وہ میرے جانے سے پہلے ہی مرچکا تھا۔"

"ڈارلنگ تمہیں اس حالت میں وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا۔"

"وہ مرجو رہا تھا۔" ثریا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"جانِ من! تمہیں اس بچے کا خیال کرنا چاہیئے تھا جو چند ہی روز میں آنے والا ہے۔" جمال پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"آخر مرنے والوں کا بھی خیال ہونا چاہیئے۔"

"اور تم تو اس سے نفرت کرتی تھیں۔"

"ہاں! شاید اب بھی کرتی ہوں۔ مگر یہ تو دیکھو کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔" ثریا نے کہا اور جمال کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

("سرورج" دہلی)

مطبوعات میری لائبریری

تنقید ، ادب ، ناول ، افسانہ

کتاب	قیمت
بہترین انشائی ادب	۱۰٫۰۰
ادب کا تنقیدی مطالعہ	۲٫۵۰
ادب اور تعصب	۱٫۷۵
ولیم فاکنر	۱٫۷۵
ارنسٹ ہیمنگوے	۱٫۷۵
مارک ٹوین	۱٫۷۵
والٹ وھٹمین	۱٫۷۵
تنقیدی مضامین	۳٫۰۰
غبار خاطر	۴٫۵۰
دیوان غالب (فارسی)	۱۰٫۰۰
انتخاب غالب	۰٫۵۰
پنجابی ادب کی تاریخ	۴٫۰۰
دیوان ولی	۲٫۲۵
دیوان مصحفی	۳٫۰۰
دیوان آتش	۱٫۷۵
دیوان جرأت	۳٫۰۰
ولی ، تنقیدی مطالعہ	۱٫۷۵
متاع ادب	۳٫۰۰
ناول نگاری	۴٫۵۰
میرزا ادیب، بہترین افسانے	۳٫۰۰
احمد ندیم، بہترین افسانے	۴٫۵۰
زاد راہ معہ تنقیدی مقدمہ	۲٫۲۵
فاصلے	۲٫۰۰
میرے بھی صنم خانے	۵٫۵۰
پتھر کا دیس	۴٫۵۰
سہرے کے پھول	۱٫۵۰
آہٹیں	۳٫۷۵
منزل منزل دل بھٹکے گا	۳٫۰۰
ادھ کھایا امرود	۳٫۰۰
حریف آدم	۳٫۰۰
دغاباز (ڈرامہ)	۱٫۰۰
لفنگے کی ڈائری	۱٫۷۵
63 کے منتخب افسانے	۲٫۰۰
64 کے منتخب افسانے	۳٫۰۰
65 کے منتخب افسانے	۳٫۰۰
میدان عمل معہ تنقیدی مقدمہ	۵٫۰۰
ننگی دھرتی	۵٫۰۰
لمحوں کے بھنور	۴٫۵۰
کرن کرن اندھیرا	۵٫۰۰
افق سے افق تک	۴٫۰۰
ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ	۳٫۰۰
سیلاب	۲٫۵۰
انسان	۵٫۰۰

* نفسیات

کتاب	قیمت
جینے کی اہمیت	۱۰٫۰۰
میٹھے بول میں جادو ہے	۵٫۵۰
پریشان ہونا چھوڑیئے	۵٫۵۰
گفتگو اور تقریر کا فن	۳٫۰۰
مانیں نہ مانیں	۳٫۰۰
جنس کا نفسیاتی پہلو	۴٫۰۰
جنس کا جسمانی پہلو	۳٫۰۰
زندگی کے موڑ پر	۲٫۵۰
شادی اور کامیابی	۲٫۵۰
روزمرہ نفسیات	۲٫۵۰
نفسیات اور عمل	۲٫۰۰
زندگی اور عمل	۲٫۰۰
نفسیات کی روشنی	۲٫۰۰
ترقی کی راہیں	۲٫۰۰
ہماری عادتیں، ہمارے جذبات	۱٫۲۵
دولت نامہ	۲٫۵۰
بچے اور انکی تعلیم و تربیت	۱٫۷۵

* تاریخ و سوانح

کتاب	قیمت
ابوبکر صدیق اکبر رض	۷٫۵۰
عمر ، فاروق اعظم رض	۱۲٫۰۰
دس بڑے مسلمان	۵٫۵۰
خالد ، سیف اللہ رض	۲٫۷۵
الہارون	۲٫۲۵
ابوذر غفاری رض	۲٫۵۰
سلطان محمد فاتح رح	۱٫۵۰
الحسین رض	۲٫۰۰
رابعہ بصری رح	۱٫۵۰
امیر معاویہ رض	۱٫۵۰
عمر بن عبدالعزیز رح	۱٫۵۰
امام زین العابدین رض	۱٫۵۰
شیخ عبدالقادر جیلانی رح	۱٫۵۰
ایک مفسر قرآن	۱٫۷۵
الزہرا رض	۱٫۲۵
تذکرہ	۴٫۵۰
قلوپطرہ	۴٫۵۰
روپ متی	۳٫۰۰
سلطانی محلوں کی راہ	۳٫۵۰

☆ ناصر زیدی (مرتب)

۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو مظفر نگر (یو - پی) کے ایک سید خانوادے میں پیدا ہوئے۔ لاھور میں پلے، بڑھے، پڑھے اور جوان ہوئے۔ اسی شہر "زندہ دلاں" میں شاعری اور ادب و صحافت کا چسکا پڑا، متعدد رسالوں کے مدیر رہ چکے ھیں۔

گذشتہ تین برس سے ماھنامہ "ادب لطیف" لاھور کے
اردو کے افسانوی ادب کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ
پہلے "۱۹۶۷ء کے منتخب افسانے" مرتب کر چکے
غزل کے شاعر ھیں اور بقول ذکاءالرحمان :—
"طبیعت میں بھی غزل کا گداز اور نزاکت ہے"
غزلوں کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔